

# دانائے راز

مرتب:

سید نذریں نیازی

اقبال اکادمی پاکستان

# جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سعیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

(حکومت پاکستان، وزارت ثقافت)

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510

[+92-42] 9203-573

Fax: [+92-42] 631-4496

Email: [director@iap.gov.pk](mailto:director@iap.gov.pk)

Website: [www.allamaiqbal.com](http://www.allamaiqbal.com)

ISBN

؟؟؟	:	طبع اول
؟؟؟	:	تعداد
-روپے	:	قیمت
لاہور	:	طبع

محل فروخت: ۱۱۲ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۰۴۲ ۷۳۵۷۲۱۷

## پیش لفظ

سید نذر نیازی عصر حاضر کے ان جید علماء اور مختصین اقبال کے زمرے میں شامل ہیں جنھیں ایک طویل عرصے کے لیے حضرت علامہؒ کا شرف حضور و قرب حاصل رہا ہے اور ان سے بہتر فاضل شخصیت شاید اب اس دنیا میں موجود نہیں جو علامہ کے سوانح حیات اور شخصیت کا تجزیہ کر سکے۔

چونکہ اقبال گز شستہ نصف صدی سے نیازی صاحب کا دل پند موضوع مطالعہ رہا ہے اور اس سلسلے میں آپ نے متعدد تالیفات شائع بھی کی ہیں اس لیے نیشنل کمپنی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال کی آرزو تھی کہ وہ ایک مفصل کتاب ترتیب دیں جو احوال و آثار اقبال کا مکمل احاطہ کرے۔ لیکن بوجوہ نیازی صاحب کئی سال میں اس طویل اور خوب منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

اس وقت تک نیازی صاحب قبلہ نے اس منصوبے کے ایک حصے کو دانائے راز کے عنوان سے تین فصلوں میں ترتیب دیا۔ جس میں فصل اول علامہ کی ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء سے لے کر ۱۸۹۵ء کے احوال پر مشتمل ہے۔ دوسرا فصل ۱۹۰۵ء تک واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تیسرا فصل کا صرف ایک جزو لکھا کہ اقبال اکادمی پاکستان نے یہ طے کیا کہ نیازی صاحب کی تحقیق و تدقیق سے جتنا مودا داب تک دستیاب ہوا ہے اور طبع ہو چکا ہے اسے فی الوقت تمہارا شائع کر دیا جائے۔

چنانچہ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ زیرِ نظر کتاب میں نیازی صاحب نے بڑی عرق ریزی سے وہ تمام مواد لکھا کر دیا ہے جو مختلف مطبوعات میں پھیلا ہوا تھا اور جب تک وہ اپنی تلاش میں کاملاً مایوس نہیں ہوئے وہ برابر حقائق کی تعقیب کرتے چلے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے

یہ تبرک اپنے طور پر ایک جامع اور کامیاب کوشش ہے۔ جس کے لیے اکادمی نیازی صاحب کی بے حد منون ہے۔ اکادمی اور اس کے اراکین کی دلی دعا ہے کہ نیازی صاحب جلد از جلد باقی منصوبہ بھی مکمل کرنے میں کامیاب ہوں۔ آمین۔

محمد باقر

۲۸ جون ۱۹۷۹ء

## خطانمودام و حشم آفریں دارم

۷۷ءے سال اقبال تھا۔ مجملہ بہت سی تجویز کے جو اس تقریب کی رعایت سے پیش کی گئیں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ حضرت علامہ کی ایک مستند سوانح حیات تیار کی جائے۔ طے پایا کہ اس سوانح حیات کو مستند Analytical Definitive ہونا چاہیے۔ سال بھر کی مدت اس کی تیکمیل کے لیے کافی ہو گی۔ اس خدمت کے لیے شاید کئی نام تجویز کیے گئے۔ ایک نام پر اتفاق بھی ہو گیا۔ کئی ایک حضرات از خود بھی اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ بالآخر قریءہ فال رقم الحروف کے نام پر اور وہ بھی خلاف توقع۔ رقم الحروف پریشان ہو گیا۔ حضرت علامہ کی سوانح حیات، مستند، قطعی، میخی اور وہ بھر سال بھی کی قلیل مدت میں:

پھر جب سال اقبال سے یہ بھی مقصود تھا کہ

۱۔ شاعر اور فکر اسلام

۲۔ مسلمانانِ جنوب مشرقی ایشیا کے لیے ایک آزاد وطن

۳۔ مسلمانانِ عالم کے اتحاد اور

۴۔ استعماری اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف تیری دنیا کے اتحاد و استحکام کے علمبردار کی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت اجاگر کی جائے۔ علی ہذا یہ کہ:

خطبات میں اسلام کے اصول اجتہاد پر انہوں نے جس طرح قلم اٹھایا ہے اس کی تشریح و تعبیر کے ساتھ ساتھ اب ان کے فکر و فن کی آفاقتی حیثیت زیر نظر رہے۔ سوانح نویسی کے سلسلے میں یہ سب با تین اگرچہ صریحاً مذکور نہیں تھیں لیکن رقم الحروف کیا، کوئی سوانح نگار ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جب رقم الحروف کے نزدیک حضرت علامہ کے فکر و نظر کے اور بھی کئی پہلو توجہ

طلب تھے۔ علاوہ اس کے کچھ وہ ذمہ داریاں بھی جو بسبب اس تعلق کے جو ذاتی طور پر اسے حضرت علامہ سے تھا، اس پر عائد ہوتی تھیں۔ الہذا راقم الحروف پر بیشان بھی تھا اور ممتاز بھی۔ لیکن معاملہ قریبہ فال کا تھا۔ اسے کوئی راہ فرار نہیں۔

یوں بھی کوئی سوانح حیات ہو کسی نقطہ نظر سے لکھی جائے اس کے کچھ نہ کچھ لوازم ہوں گے۔ لوازم کا تقاضا ہے کچھ انتظامات جن میں سوانح نویس کی ذاتی حیثیت سے قطع نظر کیا جاسکتا ہے، زمان مشکلات سے جو ہر سوانح نویس کو طرح طرح سے پیش آتی ہیں۔ مثلاً یہی ماخذ اور معلومات یا یوں کہیے اس سارے مواد کی فراہمی کا معاملہ ہے۔ اس کی چھان میں ترتیب و تفصیل کا جس کے بغیر ناممکن ہے کوئی سوانح حیات معرض تحریر میں آ سکے۔ معلومات کے لیے افراد اور مقامات کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ماخذ کے لیے کتابیات کا اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ راقم الحروف کو اس سلسلے میں کچھ سہولتوں کی ضرورت تھی، کچھ تعاون کی۔ خیال تھا کہ سال بھر یا اس سے کچھ زیادہ مدت میں حضرت علامہ کی ایک ایسی سوانح حیات تیار ہو جائے گی جو بہمہ وجہ مکمل، بمبسوط اور مفصل تو نہیں ہوگی لیکن باوجود اختصار اس حد تک جامع کر آ گے چل کر ایک تھیم اور صحیح معنوں میں مکمل اور جامع سوانح کے لیے تمہید کا کام دے سکے۔

لیکن ایسا نہ ہوا راقم الحروف کو تن تھا یہ خدمت سرانجام دینا پڑی۔ دشواریاں بہت تھیں الہذا کام کی رفتارست رہی پھر ایک ذاتی صدمے کے باعث یہ سلسلہ دفعاتہ رُک گیا تا آنکہ قلم انٹھانے کی نوبت آئی تو کئی مہینوں کے بعد سال اقبال آ گیا۔ راقم الحروف پر بیشان تھا مگر پھر جب معلوم ہوا کہ اس تقریب کی رعایت سے حضرت علامہ کی ایک سوانح حیات تیار ہو رہی بلکہ ہو چکی ہے تو راقم الحروف نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے تسلی تھی کہ اب یہ ممکن ہو گا کہ اس خدمت کو اپنے طور پر سرانجام دے۔ یعنی بجائے اجمال کے تفصیل احتی الوع وضاحت اور جامعیت کے ساتھ۔ راقم الحروف کو یہ گوارا نہیں تھا کہ حضرت علامہ اقبال کی سوانح حیات کو ایک مقالے کی شکل دی جائے جیسا کہ بصورت اختصار ہتھا۔ مقالہ کیسا بھی جامع اور بلند پایہ کیوں نہ ہوا سے مقالہ ہی کہا جائے گا، سوانح حیات نہیں کہیں گے۔ اسے یہ بھی منظور نہیں تھا کہ حضرت علامہ کے حالات زندگی کی سینی ترتیب کے ساتھ ساتھ باعتبار ان سیاسی اور ملی شکون کے جن سے ان کا گزر ہوا ان کے موقف یا افکار اور تصورات کی طرف اشارہ کرتا رہے۔ سوانح حیات کو اکف حیات کا تفصیلی، یا مختصر بیان نہیں ہے، نہ اجمالی تذکرہ۔ رواداد حیات ہے اسے

”دید، کہیے۔ بقول مولانا روم:

آدمی دید است باقی پوست است

رقم الحروف کی رائے میں اس دیہ کی ابتدا پروفیسر نکلسن نے کی۔ انھوں نے اسرار خودی کا ترجمہ کیا تو اس کے دیباچے میں حضرت علامہ کے دل و دماغ اور قلمرو نظر کی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک نہیں کئی پہلوؤں سے اپنی جگہ پر قابل تعریف مگر نامکمل اس لیے کہ رقم الحروف کے نزدیک اس کی نظر جز پر ہے کل پہلیں ہے۔

لیکن سوانح حیات کا ایک حصہ لکھا جا چکا تھا۔ طے پایا کہ اس کی اشاعت بہر حال ضروری ہے اور یہی حصہ اب جزو اول مجلد اول کی شکل میں قارئین کے سامنے ہے گورقم الحروف بوجہ اس سے مطمئن نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ بسبب ان مشکلات کے جو رقم الحروف کو پیش آئیں اور جن کا اس کے پاس کوئی مداوائیں تھا اسے انھیں معلومات پر قناعت کرنا پڑی جو اسے میسر آ سکیں۔ حالانکہ اس باب میں اس کا ذہن کبھی بھارت کی طرف منتقل ہوتا، بھی انگلستان اور جرمنی، کبھی ہر اس سر زمین کی جانب جس سے حضرت علامہ کا گزر ہوا۔ ثانیاً معاملہ عجلت کا تھا لہذا اس جزو کی تحریر و تسویہ حسب منشاء ہو سکی۔ کچھ حصہ ایک نجح پر لکھا گیا۔ کچھ اس خیال سے کہ اب پابندی وقت کی قید نہیں دوسری نجح پر گواسساً اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یوں متن میں کچھ ناہمواری سی پیدا ہو گئی ہے بعض عبارتیں شاید غیر مربوط یا غیر متوازن سی معلوم ہوں گی۔ کہیں اطناہ ہے۔ کہیں بمقابلہ اس کے طوالت۔ یہ تو رقم الحروف کا ذاتی احساس ہے۔ نہیں معلوم قارئین اس پر کس کس پہلو سے گرفت کریں۔ ان کے نزدیک شاید کئی معلومات تشفیہ ہوں گی۔ کئی مفروضے خود ساختہ۔ کئی بیانات محل نظر۔ رقم الحروف کو اپنے کرم فرماؤں، نادین اور قارئین کے لفظ و تبصرہ، مشوروں اور تجویزوں کا انتظار رہے گا تا کہ اس جزو کی ترتیب ثانی میں جہاں کہیں ضرورت ہے اصلاح و ترمیم کی جاسکے۔ سردست اس جزو کی حیثیت تسویہ اول کی ہے۔ طبع کمر پر البتہ یہ ممکن ہو گا کہ اس میں جو ستم باقی رہ گئے ہیں ان کے ازالے کے ساتھ ساتھ جیسا کہ چاہیے خاطر خواہ شکل دی جاسکے۔

اس سوانح حیات کا عنوان ہے دانائی راز، جو گویا آپ ہی آپ تجویز ہو گیا۔ اس لیے کہ سال اقبال کی تقریبات کے لیے جو کمیٹی قائم کی گئی اس نے اپنے پہلے اجلاس کی رواداد شائع کی

اور راقم الحروف کو اس کی ایک نقل بھیجی تو راقم الحروف نے دیکھا کہ اس کی پیشانی میں دنانے راز کا عنوان قائم ہے لہذا راقم الحروف نے بھی یہی عنوان اختیار کیا۔

لیکن دو اور باتیں ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ ایک یہ کہ اس سوانح حیات میں راقم الحروف نے حضرت علامہ محمد اقبال لکھا ہے اور یہی شاید سوانح نویسی کا تقاضا بھی ہے۔ حضرت علامہ حکیم الامت، علامہ اقبال، ڈاکٹر صاحب یا اقبال کہیں نہیں لکھا۔ ڈاکٹر صاحب کا استعمال ایک خاص حلقة اور خاص زمانے تک محدود تھا۔ اقبال کا اشارہ شاعر اقبال، یا فلسفی اقبال کی طرف ہے۔ حضرت علامہ اور حکیم الامت ایسے تو صفائی اور تعظیمی القاب کا استعمال بچپن اور زمانہ طالب علمی یا لا ہور اور یورپ کی تعلیمی زندگی کے بیان میں کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ القاب یوں بھی بہت بعد میں وضع ہوئے۔ حضرت علامہ کو خود بھی القابات سے بڑی نفرت تھی۔ لہذا راقم الحروف نے انھیں ہر کہیں محمد اقبال ہی لکھا ہے۔ نہ معلوم قارئین کی رائے اس باب میں کیا ہو۔

لیکن ایک اور وجہ انھیں محمد اقبال لکھنے کی یہ ہے کہ جن دنوں ان کا قیام میکلوڑ روڑ والی خستہ حال کوٹھی میں تھا ان کی خواب گاہ میں سرہانے کے رخ ایک معمولی سے چوکھے میں ان کا سچ

### دارد امید شفاعت ز محمد اقبال

دیوار پر آویزاں رہتا تھا۔ یہ سچ جاوید منزل میں تو نظر نہیں آیا نہ بسبب حضرت علامہ کی شدید عالات اور شب و روز بزرگیری کے پوچھنے کی نوبت آئی کہ میرا خیال ہے یہ سچ ان کا اپنا ہی کہا ہوا ہے۔ انھیں حضور سرور کائناتؑ کی ذات گرامی سے جو والہانہ محبت تھی، جو عقیدت اور عشق تھا اس کا اظہار شاید یوں بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے جب بھی اور جہاں کہیں بھی اپنا نام لکھا جبرا ایک آدھ اتنا تھا میں محمد اقبال ہی لکھا لہذا راقم الحروف نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ جن دلفظوں کو انھوں نے کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا انھیں یک جا ہی رکھا جائے۔ محمد اقبال کو محمد اقبال ہی لکھوں۔

دوسری بات جس کی طرف اشارہ کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا یہ کہ اگر کوئی خاص امر مانع نہ ہوا تو اس مجلد کا جزو ثانی اسی سال ۱۹۷۹ء میں طبع ہو جائے گا۔ یہ مجلد ۱۹۰۸ء پر ختم ہوتی ہے۔ یورپ میں حضرت علامہ کے تعلیمی سفر سے مراجعت پر۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک اس سوانح حیات کی حیثیت چونکہ بنیادی ہے، ”اقبالیات“ کی ساری دنیا پر حاوی تاکہ جو ارباب علم اس

کے کسی پہلو مثلاً افکار اور تصورات، شاعری، سیاسی یا علمی زندگی پر قلم اٹھائیں وہ کل جس کا ان کی شاعری، علمی اور ملی خدمات یا افکار و تصورات ایک جزو میں ان کے سامنے ہو۔ یہ ایک عظیم منصوبہ ہے جس کی تکمیل اسی خدمت کے متعدد اجزاء، یعنی سات آٹھ مجلدات میں ہو گی۔ کوئی دس ہزار صفحات، مگر کیسے؟ رقم الحروف کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے۔ بقول مرزا غالب:

شعرور ایست در سرم که بسامان برابر است

ولله التوفیق۔

## میں ممنون ہوں

مرکز یہ مجلس اقبال اور سینیٹری (Centenary) کمیٹی کا کہ اگر ان کا اصرار نہ ہوتا تو اس سوانح حیات کی تسوید و تحریر جو اقبالیات، کے منصوبے میں شروع ہی سے میرے سامنے تھی، نہ معلوم کب تک ملتی رہتی۔ میں ممنون ہوں جناب امیر الدین، ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر جاوید اقبال کا جن کی توجہ اور مشورے اس عظیم ذمہ داری میں شامل حال رہے۔

مجھے بالخصوص شکریہ ادا کرنا ہے مجی شیخ اعجاز احمد کا کہ بخوائے صاحب الیت ادysi بما فیها، اس سوانح حیات کے بعض پہلوؤں اور روایات کی چھان میں میں بجز ان کے کون میری رہنمائی کر سکتا تھا۔ حضرت علامہ کی تاریخ ولادت اور ابتدائی تعلیمی زندگی کے علاوہ ڈاکٹر نظیر صوفی اور کوچ میر حسام الدین کے کرم فرماؤں سے بھی بعض بڑی قابل قدر معلومات حاصل ہوئیں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں۔ علی ہذا بلد یہ سیالکوٹ، ارباب مرے کا لج اور اسکا چ مشن ہائی سکول کا۔

افسوس ہے استاذ اقبال مولانا میر حسن کے پوتے سید محمد عبداللہ آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے اور پھر دوران ملازمت بھی انہیں حضرت علامہ سے بڑا قرب حاصل تھا۔ ان سے جب ملتا حضرت علامہ کی ذات گرامی زیر بحث آتی۔ میں ان دونوں بھی ان کے لیے باعثِ زحمت ہوا جب ان کی علالت نہایت اندیشہ ناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے صاحزادے بریگیڈر سید محمد جعفر کی یادداشتیں بھی کچھ کم بروئے کارنیں آئیں۔ میں ان کا شکریہ بھی ادا کر رہا ہوں۔ رسمًا ہی سہی۔

ڈاکٹر سعید اختر درانی، پروفیسر برمنگھم یونیورسٹی، نے بڑا کرم فرمایا کہ انگلستان میں بیٹھ راقم الحروف کو بڑی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں۔ مجھے نامہ ہائے درانی کا انتظار رہتا۔ میں ان کا

ممنون ہوں۔

کراچی میں راقم الحروف کے رفیق جامعہ مولوی نور الرحمن کے بھائی مولوی مظہر الرحمن نے تو اس سوانح حیات کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتے ہوئے کراچی کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ارباب علم سے ملے کتب خانوں میں گئے۔ افسوس ہے پچھلے برس وہ ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔ میں ان کی عنایات کے لیے اپنی شکرگزاری کا اعتراف ان کے بھائی مولوی منظور الرحمن سے کر رہا ہوں۔ کنور عظم علی خسر وی بھی میرا شکریہ قبول فرمائیں۔ انہوں نے بھی بعض معلومات کے حصول میں بڑی کاوش فرمائی۔ مجی محمد مظفر صاحب کسی زمانے میں چیزیں اور محمد مظفر بھٹہ ڈائریکٹر برک بانٹلی کمپنی نے بھی اس باب میں کچھ کم زحمت نہیں اٹھائی۔ میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

جناب سید الطاف علی بریلوی، جناب صہبائکھنوی، خواجہ حمید الدین شاہد، جناب کریم بخش خالد اور ارباب وفاتی اردو گورنمنٹ کالج کا بھی تہہ دل سے احسان مند ہوں۔ یہ ان کی عنایت ہے کہ العلم، افکار، سب رس، پیغام اور برگ گل کے پرچے باقاعدہ ملتے رہے۔ لاہور میں جناب مظفر حسین صاحب ڈائریکٹر پاکستان اسلامک اینجیکیشنل کانفرنس کا مجھے بالخصوص شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بحق سوانح نویسی اب تک میرے پاس محفوظ ہے اور نہ معلوم کب تک رہے گا۔ پھر بسبب اس عقیدت اور قلمی تعلق کے جوانہیں حضرت علامہ سے ہے میں ان کے مشوروں سے جن میں مجی بریگیڈر منظور احمد نے بڑھ کر حصہ لیا خوب خوب مستفید ہوا۔ جناب کلیم اختر بھی میرا شکریہ قبول فرمائیں۔ حضرت علامہ کے خاندان اور امور کشمیر میں میں نے ان کی یادا شتوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ بعض روایات کی تصدیق و توثیق کے لیے بزرگ محترم جناب خواجه عبدالصمد گرو کے صاحبزادے خواجه حبیب اللہ سے رجوع کرنا پڑا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

جناب احمد بشیر ڈائریکٹر بجزل اے پی پی نے حضرت علامہ کے بعض ارشادات کی انگریزی نقلیں عنایت فرمائیں بشیر صاحب میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ راولپنڈی میں بیگم ڈی حسین کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے والد ماجد خاں صاحب ششی سراج دین خاں کے ذاتی کاغذات اور یادا شتوں کا سارا دفتر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنے والد ماجد کی بعض تحریریں مجھے ارسال کر چکی تھیں۔ ناسپاسی ہوگی

اگر میں ان کی عنایات کا اعتراف نہ کروں۔

روالپنڈی ہی میں پروفیسر حبیب بخش شاہین کے ساتھ خان عبدالرحمن خاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور شفقت بزرگانہ سے پیش آئے۔ انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں حضرت علامہ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنے اس عنایت نامے کے علاوہ جو کچھ عرصہ پہلے ارسال کر چکے تھے ان سے بڑی قابل قدر معلومات حاصل ہوئیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ لاہور سے بہت دور ضلع گجرات کے ایک دورافتادہ چک میں سید نور محمد صاحب قادری کو نہ معلوم کیسے پہنچ چل گیا کہ میں حضرت علامہ کی سوانح حیات لکھ رہا ہوں۔ انھوں نے کچھ اپنے اور کچھ میرے بزرگوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۰۴ء میں صدی کے سیالکوٹ کی علمی اور دینی فضائے بارے میں جو بھی علمی و سماویزیں اور بزرگوں کی یادداشتیں ان کے پاس محفوظ ہیں، علاوہ اس کے ان کا ذاتی کتب خانہ کچھ ایسے قلمی نسخوں، رسائل اور جرائد پر مشتمل ہے جو اب بکشکل دستیاب ہوئے ہیں میرے استفادے کے لیے حاضر ہیں۔ پھر ایک روز سید صاحب خود ہی تشریف لے آئے میں ان کا بد ممنون ہوں۔ وہ توجہ نہ فرماتے تو کئی ایک باتوں میں میری معلومات تشنہ رہ جاتیں۔

جامعہ پنجاب میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ رئیس شعبہ اردو و اردوہ معارف اسلامیہ اور ان کے رفقاء جناب سید احمد الطاف، مرزا مقبول بیگ بدختانی اور پروفیسر عبدالقیوم کا مجھے بالخصوص شکریہ ادا کرنا ہے۔ ماخذ کی تلاش اور کتابیات کے حصول میں بار بار ان کے لیے باعثِ زحمت ہوتا رہا۔ شعبہ مذکور کے عملی شیخ عطاء محمد، شیخ محمد سعید اور اسلم شاد بھی دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ بیکل مسودہ اس سوانح حیات کی تیبیض اور بار بار ثانیپ کا مرحلہ انھیں کی بدولت طے ہوا۔ کتب خانہ جامعہ پنجاب کے رکن ملک احمد نواز بھی میرا شکریہ قبول فرمائیں۔ یہ ان کی عنایت ہے کہ میں نے کتب خانہ جامعہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

جناب احمد ندیم قاسمی ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب اور سینکریٹری بزم اقبال ان کے رفقاء جناب کلب علی خاں فائق، جناب محمد عبداللہ فریشی جنھوں نے حیات اقبال کی گم شدہ کڑیوں کی فراہمی سے اقبالیں کے لیے معلومات کا گراں بہاذ خیرہ جمع کر دیا ہے اور جناب یونس جاوید کا بھی دل سے سپاگزار ہوں۔ جس میں پھر اس ادارے کے کارکنوں کا شکریہ بھی لازم ٹھہرتا ہے۔ انھوں نے میرے لیے ہر ممکن سہولت پیدا کی۔

جناب سعید شیخ ڈاکٹر کیسٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ اور جناب ڈاکٹر معزالدین ڈاکٹر کیسٹر اقبال اکادمی بھی میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ کتابیات کے لیے بالخصوص میں بار بار ان کے لیے باعثِ رحمت ہوتا رہا۔

میں جناب ڈاکٹر باقر نائب صدر اقبال اکادمی کا بالخصوص شکرگزار ہوں۔ یہ انھیں کی توجہ اور عنایت کا نتیجہ ہے کہ حضرت علامہ کی سوانح حیات کے یہ چند اوراق آج قارئین کے سامنے ہیں۔ میں جناب اشراق احمد ڈاکٹر مرکزی اردو بورڈ کا بھی سپاس گزار ہوں۔ انھوں نے گویا بالواسطہ مجھے ان اوراق کی تجکیل کا موقع دیا۔ جناب قدرت اللہ شہاب بھی میرا دلی شکریہ قبول فرمائیں انہیں معلوم ہے کیوں۔

مجبی عزیزی عبداللطیف عظیمی سیکریٹری شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے رسالہ جامعہ اور اپنی بعض تصنیفات کی باقاعدہ ترسیل کے علاوہ دانائے راز کے عنوان سے حضرت علامہ کی جو مختصر مگر خیال انگیز سوانح عمری لکھی ہے مرحمت فرمائی اور میں نے اس سے خوب خوب استفادہ کیا۔ میں ان کا بدل ممنون ہوں۔

جناب سید اٹھبار الحسن رضوی کا بھی بالخصوص شکرگزار ہوں۔ جزو زیرِ نظر کی طباعت میں انھوں نے میری مشکلات کا جس طرح خیال رکھا۔ مجھے جو سہولتیں بہم پہنچائیں میں کوئی دوسرا مطبع ان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے سید صاحب کی احتیاط اور توجہ کے باوجود متن میں کئی غلطیاں اور بے ربطیاں باقی رہ گئیں۔ جن کی ذمہ داری سرتاسر راقم الحروف پر عائد ہوتی ہے مثلاً صفحہ اول ہی میں فصل اول کے نیچے سیالکوٹ کی بجائے شہر اقبال چھپ گیا۔ میں سید گذاشت نہیں ہوئی۔

سید نذرینیازی

## فصل اول

### داناۓ راز

شہر اقبال تا ۱۸۹۵ء

#### ۱- محمد اقبال

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی تاریخ ولادت، جیسا کہ ڈاکٹر یث کے لیے مقالہ پیش کرتے ہوئے بطور تعارف انہوں نے اپنے تذکارہ حیات میں خود لکھا۔ جمعہ، ذی قعده ۱۲۹۳ھ ہے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ڈن سیالکوٹ ارض پاک و ہند میں مغربی پنجاب کا مشہور شہر۔ حکیم الامت کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ کسب معاش کے لیے باپ کے ساتھ برازی کی دکان پر بیٹھے۔ پارچہ دوزی کا پیشہ اختیار کیا۔ برعکوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ دھسوں کا کاروبار بھی کیا۔ یہ کاروبار خاصہ ففع مندر رہا۔ رفتہ رفتہ مالی حالت سدھرنے لگی ورنہ گزر اوقات معمولی تھی۔ شیخ نور محمد کی ناک چحدی ہوئی تھی۔ عرف نہ تو پیوں والا۔ والدہ امام بی بی بڑی نیک سیرت، بڑی سمجھدار، صوم و صلوا کی پابند، گھر کا کام کا ج خود ہی کرتیں۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میاں یہوی، اٹھارہ انیس برس کا ایک لڑکا۔ دو بہنیں عمر میں بہت چھوٹی اور یہ نومولود جو ایک بھائی کی وفات کے بعد، جو شیر خوارگی ہی میں داغ مفارقت دے گیا، پیدا ہوا۔ پھر دو بہنیں کریم بی بی اور نزیب بی بی۔ بڑا بھائی عطا محمد بڑی بہنیں فاطمہ بی بی، طالع بی بی۔

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

ماں خوش کہ بارگاہ الہی نے اس کی دعا میں سن لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بیٹا اور دے دیا۔ باپ مطمئن کہ خواب میں جو اشارہ غیبی ہوا تھا اس کی تعبیر صحیح نکلی۔ وہ کسی مسرت اور شکر گزاری سے اعزہ و اقارب کی دعا میں اور مبارک بادلے رہے تھے۔ کس محنت اور دل سوزی سے انھوں نے بیٹے کی پروش کی۔ نام بھی ماں ہی نے رکھا، محمد اقبال۔ اس وقت کے معلوم تھا محمد اقبال کیسا صاحب اقبال ہو گا۔

شیخ نور محمد کے آباء اجداد نے ترک وطن کیا۔ کشمیر سے پنجاب آئے۔ معلوم نہیں کہ قیاساً محمد اقبال کی پیدائش سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے۔ یہ شاید ان کے دادا شیخ جمال الدین تھے جنھوں نے اول اوقل سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔ نادر اور ابدالی کی ترک تازیوں کے بعد جب سکھ گردی کا دور آیا کشمیر کا رشتہ دولت مغلیہ سے کٹ گیا۔ کشمیر افغانوں کے قبضے میں آگیا۔ افغانوں نے سکھوں سے ہزیمت اٹھائی تو لوٹ کھسوٹ اور بد نظری کے اس دور میں کشمیری مسلمانوں کے لیے امن و عافیت کے ساتھ ساتھ کسب معاش کی را ہیں بھی مسدود ہو گئیں۔ اس پر آشوب زمانے میں اکثر اور بیشتر خاندانوں نے پنجاب کا رخ کیا۔ سیالکوٹ کا رشتہ کشمیر سے بہت پرانا ہے۔ سیالکوٹ کشمیری راجاؤں کے زیر تسلط رہ چکا ہے۔ سیالکوٹ کا جغرافی محل و قوع کشمیر کے لیے نہایت اہم ہے، کیا باعتبار آمد و رفت، کیا باعتبار کار و بار، سیاسی، تہذیبی اور تدنی روابط کے۔ لہذا کچھ خاندان سیالکوٹ آئے، یہیں بس گئے تا آنکہ کشمیری محلے کے نام سے ایک محلہ بھی آباد ہو گیا۔ شیخ نور محمد اسی محلے سے ملحق ایک چھوٹی سی گلی چوڑی گراں میں رہتے تھے۔ مکان چھوٹا تھا۔ ان کے والد کا خرید کرده کچھ کچھ پکا۔ ایک ڈیوڑھی، ایک آنگن، ایک دالان اور دو کوٹھریاں۔ حکیم الامت اسی مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ جو اس ملحق اقبال منزل کے نام سے سر بازار ایک سہ منزلہ عمارت کھڑی ہے، ان کی جائے پیدائش نہیں، جیسا کہ غلطی سے بازار سے اترتے ہوئے زینے کے اوپر ایک مرمری لوح میں ثبت ہے کہ یہی وہ منزل سعید ہے جہاں حکیم الامت پیدا ہوئے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق کیک داناۓ راز آید بروں

اصل مکان جسے ۱۹۳۸ء میں انھوں نے بڑے بھائی کے نام ہبہ کر دیا علی حالہ قائم ہے فرمایا: ”جاوید کا اپنا مکان موجود ہے اسے اس مکان کی کیا ضرورت۔ بھائی صاحب کے مجھ پر بڑے احسان میں۔ علی بخش ہبہ نامہ لے اور ان کے دستخط لے لو۔“

## ۲۔ خاندان

شیخ نور محمد کے یہاں ایک روایت چلی آرہی تھی کہ ان کے مورث اعلیٰ کوئی صوفی بزرگ تھے، بابا لولی حج۔ ان کا اصل نام تو معلوم نہیں، نہ یہ کہ انھیں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا یا ان کے کسی بزرگ نے، معلوم ہے تو یہ کہ ”مدت کی جنگوں کے بعد ہمیں اپنے بزرگوں کا سراغِ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لولی حج کشمیر کے مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ عظیم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا۔ ان کا اصل گاؤں لوچ نہیں تھا، بلکہ موضع چکو، پر گندہ اڈوں میں تھا۔<sup>۵</sup> ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے، بارہ سال کشمیر سے باہر رہے۔ واپس آنے پر اشارہ نیبی پا کر بابا نصیر الدین کے مرید ہوئے۔ بقیہ عمران کی صحبت میں گزری۔ اپنے مرشد کے جوار ہی میں مدفون ہیں۔“<sup>۶</sup>

بابا نصیر الدین ایک متمول ہندو خاندان کے فرزند تھے۔ بچپن ہی سے سوئے ہضم کی شکایت تھی۔ علاج معالج کا میاب نہ رہا۔ خواب میں اشارہ ہوا کہ شیخ العالم شیخ نور الدین ریشی سے رجوع کریں۔ جنہوں نے دعا فرمائی، اپنے ہو گئے۔ اسلام قبول کر لیا پھر شیخ ہی کی صحبت میں عمر گزاری اور اس حد تک فیض یاب ہوئے کہ ان کا شمار شیخ کی زندگی ہی میں ان کے خلفاء میں ہونے لگا۔ شیخ العالم سلسلہ ریشیان کے مشائخ میں سے تھے۔<sup>۷</sup> سلطان شہاب الدین کے عہد میں پیدا ہوئے۔<sup>۸</sup> سلطان زین العابدین ”بدشاہ“ کے عہد میں وفات پائی۔ سلطان خود جنازے میں شریک تھا۔<sup>۹</sup>

لیکن ان روایات سے جن کی صحبت میں کلام نہیں، یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ بابا لولی حج تھے جنہوں نے حکیم الامت کے آباء اجداد میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا یا ان کے کسی بزرگ نے۔ اس لیے کہ بابا لولی حج نے بابا نصیر الدین کی بیعت کی تو کشمیر سے باہر اپنی طویل سیاحتوں اور بار بار فریضہ حج کی ادائیگی سے واپس آ کر۔ قبولیت اسلام سے پہلے انھیں بابا نصیر الدین سے بیعت کا اشارہ کیسے مل سکتا تھا۔ بعینہ اگر پسر و خاندان کی گوت ہے اور پروشاپور کی بگڑی ہوئی شکل نہیں، جیسا کہ دیوان ٹیک چند کمشنز ان بالہ نے مجھ سے کہا، دراصل ایرانی تھے۔ کشمیر آئے اور ”اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت بر اہمہ کشمیر میں شامل ہو گئے۔“<sup>۱۰</sup> نہ ایک گبر شاپور کی اولاد جس نے امیرا کبر حضرت شاہ ہمدان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا بلکہ ”بر اہمہ کشمیر کے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی پسرو کھلایا۔“<sup>۱۱</sup> تقدم کے لیے کئی

زبانوں میں آتا ہے۔ پُر کاروٹ لاؤ ہی جو ہمارے مصدر، بڑھنے کا، یعنی کہنا مشکل ہے کہ اس گوت کی ابتداء کب ہوئی، بابا لوی حج، یا ان کے کسی بزرگ کی اولاد سے۔<sup>۱۸</sup> اتنا بہر حال طے ہے کہ حکیم الامت کے آباء اجداد نے آج سے دو ڈھانی سو برس پہلے نہیں، جیسا کہ غلطی سے فوق نے لکھا ہے، بلکہ چار پانچ سو برس پہلے اسلام قبول کیا۔<sup>۱۹</sup>

اس غلطی کا ازالہ اس طرح ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر صوفی غلام حجی الدین رجسٹر ارڈبلی یونیورسٹی ڈاکٹریٹ کے لیے کشمیری تہذیب و تمدن پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ ممتحین میں محمد اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ صوفی صاحب کی بدایت پرویدہ مری کا نجی ان کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے دو چار ورق ہی الٹ کر دیکھے تھے کہ بابا لوی حج کا تذکرہ مل گیا۔ تذکرہ ملا تو وطن اور زمانے کے یقین میں بھی کوئی مشکل نہ رہی۔ فوق نے، باوجود یہ کہ محمد اقبال سے گھرے مراسم تھے، قیاساً لکھ دیا کر ان کے جدا علی نے کوئی سواد و سو برس پہلے اسلام قبول کیا۔ بعینہ ذکر اقبال یا بعض دوسری سوانح حیات میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ ان کے جدا علی نے جس صوفی بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ان سے اکتساب فیض میں اس حد تک آگئے نکل گئے کہ انھوں نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی حاجی صالح ان کا نام ہوا جس کی وجہ تھی ان کی صالح زندگی۔ یہ روایت بے سند ہے لہذا ناقابل قبول۔ بالخصوص اس مکتب کی موجودگی میں جس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ بات واضح ہے بابا نصیر الدین ۱۳۵۱ء میں فوت ہوئے ان کے مرید لوی حج یا ان کے اسلاف پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے۔

بابا لوی حج کی اولاد میں ایک بزرگ تھے شیخ اکبر، انھیں پیری اس طرح ملی کہ خاندان سادات کے ایک سربراہ کا جو سکھترہ میں مقیم تھے، انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا۔ لوگ اس خاندان کو سید نہیں مانتے تھے۔ ان پر طعن و تشنیع کی جاتی۔ ایک روز اس کے سربراہ ایک سبز کپڑا اور ٹھکر آگ میں بیٹھ گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ کپڑا حضرت امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے، ان پر آگ اڑنہیں کرے گی اور ہوا بھی یہ کا آگ نے ان پر مطلق اثر نہ کیا۔ حصوں کا کاروبار انھیں کے ایک مرید کے ایما پر کیا گیا تھا۔ لیکن جس طرح یہ معلوم نہیں کہ شیخ اکبر بابا لوی کی کس پشت سے تھے بعینہ یہ بھی کہ شیخ مذکور شیخ جمال الدین کے دادا تھے یا پڑادا۔ معلوم ہے تو یہ کہ شیخ جمال الدین کے چار بیٹے تھے۔ بڑے شیخ محمد رمضان، تصوف میں چند ایک فارسی رسائل کے مصنف۔ دوسرے شیخ محمد فیض شیخ نور محمد کے والد، تیسرے اور چوتھے

شیخ عبدالرحمن اور شیخ عبداللہ بن میں اول الذکر نے دکن کا رُخ کیا اور وہیں کے ہور ہے۔ مؤخر الذکر سیالکوٹ کے نواح میں جا بے۔ شیخ محمد رفیق کے سب سے بڑے بیٹے شیخ نور محمد باب پ کے ساتھ بزاںی کا کاروبار کرتے۔ دوسرے شیخ غلام محمد مکھم نہر میں ملازم تھے۔ تبدیل ہو کر روپڑ گئے۔ شیخ محمد رفیق کا انتقال بھی روپڑ ہی میں ہوا۔ بیٹے سے ملنے گئے تھے کہ ہیسے میں بتلا ہو گئے۔ شیخ محمد رفیق ۱۸۳۹ء میں زندہ تھے۔<sup>۲۲</sup>

### ۳۔ تعلیم و تربیت

محمد اقبال نے ہوش سنجالا تو شیخ نور محمد نے انھیں عمر شاہ کے مکتب میں بٹھا دیا۔ وہ مولینا میر حسن کے برادر عزم زاد تھے۔ مسجد میر حسام الدین میں بچوں کو پڑھاتے۔ یہ مسجد ۲۷۱۸ء میں تعمیر ہوئی جس کا ایک بغلی کمرہ جو گوکیا بیٹھک کے طور پر تعمیر ہوا میر حسن کی درس گاہ کا کام دیتا تھا۔ محمد اقبال نے اس مکتب میں نوشت و خوانندگی کی۔ قرآن مجید پڑھا۔ یہ مرحلہ طے پایا اس کے دوران ہی میں شیخ نور محمد نے انھیں مولینا غلام حسن کے مدرسے میں بھیج دیا۔<sup>۲۳</sup> مقصود یہ تھا کہ محمد اقبال دینی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن چند دن گزرے تھے کہ اس مدرسے میں مولانا میر حسن کا گزر ہوا۔ انھوں نے محمد اقبال کو دیکھا تو پوچھا یہ کس کا پچھہ ہے۔ معلوم ہوا شیخ نور محمد کا۔ میر حسن شیخ نور محمد سے ملے اور یہ کہنے لگے محمد اقبال کو میرے پاس بھیج دیں اسے میں پڑھاؤں گا۔ شیخ نور محمد رضا مند ہو گئے۔ بس یہ دن تھا اور مولانا میر حسن کا دام آخر محمد اقبال کا رغثہ تلمذان سے برابر قائم رہا۔ باب کی آرزو کہ بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے پوری ہوئی۔ ”میرے والد کی بڑی خواہش تھی مجھے تعلیم دلوائیں۔ انھوں نے پہلے تو مجھے مسجد میں بٹھایا۔ پھر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔<sup>۲۴</sup> مسجد کا اشارہ عمر شاہ کے مکتب کی طرف ہے، شاہ صاحب کا، مولانا میر حسن کی جانب۔ سیالکوٹ میں میر حسن کو شاہ صاحب ہی کیا جاتا تھا۔ ”میری تعلیم عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ چند سالوں کے بعد ایک مقامی اسکول میں بھیج دیا گیا۔<sup>۲۵</sup> ”عربی فارسی سے اس لیے کہ عربی اور فارسی اسلامی علوم و معارف کی زبان ہے۔ اسکول سے مراد ہے اسکاچ مشن ہائی اسکول جس کی عمارت اب بھی جوں کی توں موجود ہے، بجز چند کمروں کے جو اصل عمارت سے ہٹ کر تعمیر ہوئے۔ وہی ہال، وہی کمرے، وہی صحن جہاں محمد اقبال نے تعلیم پائی۔<sup>۲۶</sup> اور جہاں داخل ہو کر میں نے یونیورسٹی کییر لئے شروع کیا۔<sup>۲۷</sup> اور جہاں ۱۸۸۸ء میں پرانگری، ۱۸۹۱ء میں مڈل، ۱۸۹۳ء میں ایئرنس کے امتحانات میں وظیفہ لے کر کامیاب ہوئے۔<sup>۲۸</sup> ورنگر

امتحان میں اول آئے۔ ۱۸۸۹ء میں اسکول میں ایف۔ اے کی دو جماعتوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ محمد اقبال اسکاچ مشن، آگے چل کر مرے کا لج مٹے میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں ایف۔ اے کیا اور عربی میں نمایاں کامیابی کی بنا پر وظیفہ پایا۔ سیالکوٹ میں اب مزید تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، علی گڑھ دور تھا اور گھر کے وسائل محدود، کہ اگر نہیں بھی ہوتے تو علی گڑھ رہ کر میر حسن سے کسب فیض ناممکن تھا۔ لاہور قریب تھا۔ بڑے بھائی کی محبت، خلوص اور ایثار کام آیا۔ محمد اقبال لاہور آگئے۔ مگر پھر لاہور ہی پر کیا موقف ہے، انگلستان اور جمنی میں واپسی پر بھی بھائی کے خلوص، محبت اور ایثار میں فرق نہیں آیا۔ دراصل محمد اقبال کے مستقبل کی تعمیر میں بڑے بھائی کا حصہ فیصلہ کرنے ہے جس کا انھیں ہمیشہ اعتراف رہا۔ بہر حال ۱۸۹۵ء میں محمد اقبال لاہور آگئے اور یونیورسٹی کیریئر کی باقاعدہ ابتداء ہو گئی۔ جادہ ہائے علم و دانش طے ہونے لگے۔ اس وقت کے معلوم تھا میں ایک دن اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے میرا گزر ہو گا۔ اس وقت تو یہ بھی معلوم نہیں تھا یونیورسٹی کیا ہوتی ہے، فیکٹری اسے کہتے ہیں۔ یہ الفاظ سننے میں بھی نہیں آئے تھے۔<sup>۳۳</sup>

محمد اقبال عمر شاہ کے مکتب میں بیٹھے تو ان کی ذہانت اور شوخ طبعی کا انہصار تھوڑے ہی دنوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی ایک ہم سبق محترمہ کرم بی بی مرحومہ سے جو عمر میں ان سے صرف دو برس چھوٹی تھیں، اس مکتب کا ذکر آیا تو جیسے بیتے ہوئے دن واپس آگئے بڑے مرے سے لیکن بسبب پیرانیہ سالی رک رک کر کہنے لگیں：“ہم ایک ساتھ پڑھتے۔ پڑھائی کے ساتھ کھلیل کود میں وقت گزرتا۔ اقبال بڑا شریر تھا۔ طرح طرح کی شرارتیں کرتا، خود ہستا ہمیں ہنساتا۔ پڑھنے لکھنے میں بلا کا تیز۔ معلوم ہوتا تھا اسے پہلے ہی سے سب کچھ یاد ہے”，<sup>۳۴</sup> مولا نا غلام حسن کے مدرسے میں بیٹھے یانہیں بیٹھے میر حسن کی نگاہ جو ہر شناس نے دیکھتے ہی ان کے دل و ماغ کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا۔ آپ ہی آپ خواہش کی کہ محمد اقبال ان کے شاگرد بنیں جیسے آگے چل کر بقول مرزاغالب شاعری نے کہ محمد اقبال کافن بنے۔<sup>۳۵</sup> محمد اقبال نے میر حسن کے آگے زانوئے تلمذیہ کیا تو استاد کوشاگر دے جو توقعات تھیں اس خوبی سے پوری ہونے لگیں جیسے میر حسن نے محمد اقبال کے اندر ون وجد میں جھانک کر دیکھ لیا تھا محمد اقبال کیا بننے والے ہیں۔ محمد اقبال کے شوق علم اور فہم اور اکا کا یہ عالم تھا کہ میر حسن کوشاگر دی آمد کا انتظار رہتا، شاگرد آئے تو سبق شروع کریں۔ دیر ہو جاتی تو پوچھتے محمد اقبال کہاں ہے۔<sup>۳۶</sup>

محمد اقبال کی حیثیت میر حسن کے شاگردوں میں منفرد تھی، لہذا میر حسن کی توجہ بھی محمد اقبال پر سب سے زیادہ۔ پھر جب محمد اقبال نے اردو، عربی اور فارسی کے ابتدائی متومن ختم کر لیے اور میر حسن نے دیکھا کہ وقت آ گیا ہے شاگرد جدید تعلیم حاصل کرے تو انہوں نے محمد اقبال کو اسکاچ مشن ہائی سکول میں داخل کرایا، جہاں وہ خود بھی مدرس تھے اور جس کے لیے وہ انھیں تیار کر رہے تھے، اگرچہ خلاف معمول دیرے سے ۔۔۔" میری تعلیم کی ابتداء عربی اور فارسی سے ہوئی، کچھ سالوں کے بعد میں ایک مقامی اسکول میں داخل ہو گیا، یہ بات یہ ہے کہ میر حسن انگریزی تعلیم کی ضرورت اور افادیت کے قابل ہی نہیں تھے بلکہ اس کے پُر زور موئید۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ محمد اقبال کا سلسلہ تعلیم قدیم سے منقطع ہوا، نہ جدید سے۔ وہ گھر میں بھی ان کے استاد تھے، مدرسے اور کانج میں بھی استاد۔ یوں میر حسن کی بصیرت اور ثروت فناگی سے نی اور پرانی تعلیم یا یوں کہیے مشرق اور مغرب کا پیوند جس خوبی سے لگا محمد اقبال کی ذات میں اس کا اظہار ایک غیر معمولی بونغ اور عبرتیت سے ہوا۔ بقول رشید صدیقی ایک نابغہ ممتنع کے پیکر میں، دنیا میں میر حسن ایسے استاد اور محمد اقبال ایسے شاگرد کی مثالیں کم ملیں گی۔

## ۲۔ طالب علمی

سیالکوٹ میں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت کا زمانہ کم و بیش ۱۵-۱۷ برس پر ممتد ہے جس کے گواگوں مراحل انہوں نے بڑی خوبی سے طے کیے۔ جیسے جیسے ایک مرحلے سے دوسرا مرحلے میں قدم رکھا محمد اقبال کے ملکات ذہنی بروئے کار آتے گئے، ان کی خدا داد قابلیت اور فطری صلاحیتوں کا جوہر کھلتے لگا۔ میر حسن مثالی استاد تھے محمد اقبال مثالی شاگرد۔ ذہین فطین، مؤدب، محنتی، ہمہ تن شوق، ہمہ تن کاوش، ہمہ تن استجواب اور تحسس۔ محمد اقبال کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا۔ میر حسن کے درس میں آئے تو کہنے کو ان کی تعلیم عربی فارسی سے شروع ہوئی، درحقیقت اسلام اور اسلامی علوم و معارف کی تحصیل سے جس میں میر حسن کی رہنمائی جیسے جیسے انھیں ماضی کی طرف لے گئی اسی دعوت کے خدوخال اُبھرنے لگ جس نے نوع انسانی کارخ ان اس کی تقدیر اور مستقبل کی طرف پھیر دیا وہ شخصیتیں سامنے آنے لگیں جن کے ایمان و یقین اور علم و عمل نے انسانیت کا روپ سنوارا۔ اس تہذیب و تمدن کی جھلک دکھائی دینے لگی جس کا ایک عہد عروج و کامرانی تھا، ایک دور زوال و انحطاط۔ یوں محمد اقبال کے ذہن میں اسلام کی شان و

شوکت، اسلام کی سطوت اور جہاں گیری کے ساتھ ساتھ بتر رکھ یہ احساس بیدار ہوتا گیا کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں، اس کا مزاج اور روح کیا۔ اسکوں اور کالج میں وہ ایک نئی زبان، نئے ادب، نئے علوم و فنون اور نئی تہذیب و تمدن سے آشنا ہو رہے تھے۔ وہ ان کی تخلیل میں اسی شوق اور لگن سے آگے بڑھے جیسے اسلامی علم و حکمت کے الکتاب میں۔ یوں محمد اقبال کا رشتہ ماضی اور حال دونوں میں استوار ہوتا چلا گیا۔ اس دنیا سے بھی جس کے اب صرف آثار ہی باقی تھے۔ یا پہنچنے والے گاریں اور اس دنیا سے بھی جو مغرب نے پیدا کی اور جو ذہنا، اخلاقاً، سیاسی اور مادی ہر اعتبار سے عالم انسانی پر چھارہ تھی۔ محمد اقبال کی طالب علمانہ زندگی بڑی سبق آموز ہے۔ انھیں ہر لمحہ کتابوں کی تلاش رہتی۔ والد ماجد فرماتے ہیں میں جب کبھی علی گڑھ یا لاہور جاتا تھا سے کتابوں کی فرمائش کرتے۔<sup>۸</sup> محمد اقبال کا ذہن بڑا حساس تھا۔ طبعاً غور و فکر کی طرف مائل، طبعاً حسن و جمال کا قدر دان۔ شعرو شاعری اور موسیقی کا دلدادہ۔ ان کے اسکوں اور کالج کے زمانے کی کچھ کتابیں محفوظ ہیں؛ حسب معمول ہر کتاب پر اسکوں اور کالج کا نام درج ہے۔ تحریر میں وہی خوبی ہے جس سے آگے چل کر ان کے خط میں حسن اور دل کشی کے ساتھ ساتھ چیختگی پیدا ہوتی گئی اور جس سے اس زمانے میں بھی ان کی خوش ذوقی اور نفاست مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کتاب میں نام اور ملکیت کے ساتھ یہ شعر لکھا ہے:

Steel not the book for fear of shame look  
down and see my powerful name Mohammad Iqbal.

ایک میں نام کے ساتھ تخلص بھی مذکور ہے: محمد اقبال، اقبال۔ ایک کے آخر میں پورا سرگم درج ہے جسے پھر ایک دوسرے انداز میں یوں لکھا ہے۔ جیسے کسی گیت کے سر ترتیب دیے جا رہے ہوں۔ شیکسپیر کے ڈرامے کنگ رچڈ کے متن پر طویل حواشی مرقوم ہیں۔<sup>۹</sup> اور یہ اس امر کا ثبوت کہ انگریزی ادب کا مطالعہ بھی وہ دلی شوق اور محنت سے کر رہے تھے۔ کالج کے زمانے ہی میں انگریزی میں ان کی قابلیت کا اعتراف ہونے لگا تھا۔ ان کے ہم سبق بھی پڑھائی میں ان کے انہاں، ان کی توجہ، خوش اخلاقی اور خوش طبعی کی تعریف کرتے۔ معلوم ہوتا ہے۔ محمد اقبال نے کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ کم سنی ہی میں انھیں موسیقی سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ رہا اردو ادب اور ادب کے لوازم، عروض اور بیان سوان مضامین میں انھوں نے بڑی تیزی سے مہارت پیدا کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے احوال و واردات کی فلسفیانہ ترجمانی میں محمد

اقبال نے بھی غالب کی طرح تھوڑے ہی دنوں میں گیسوئے اردو کی شاندشی شروع کر دی۔ لیکن اردو کے ساتھ ساتھ فارسی آپ ہی آپ ان کی زبان بن رہی تھی۔ فارسی کا حسن بیان، فارسی کی لطافت، طرزِ گفتار دری کی شیرینی ایک سحرخبا جس نے محمد اقبال کا دل مودہ لیا۔ عربی زبان پر بھی انھیں کچھ کم عبور حاصل نہیں تھا۔ عربی زبان میں ان کی قابلیت کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں عربی میں اول آئے۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی میں آرنلڈ کی جگہ عربی پڑھائی۔ پھر ان کے دو اوپن اشعار ہیں آیات قرآنی، عربی ضرب الامثال، عربی ترکیبات، عربی المفاظ، مجاہروں اور تلمیحات سے پڑے۔ لیکن ان کے مزاج میں انکسار تھا۔ کہتے ہیں نے تھوڑی بہت عربی سیکھ لی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جیسی قدرت انھیں انگریزی اور فارسی زبان پر تھی ویسی عربی پر نہیں تھی۔ عربی ان کی شاعری میں رچ کئی۔ عربی ادب سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ لیکن عربی خواص کی زبان تھی علم و حکمت، کلام اور الہیات، تفسیر و حدیث، فقہ اور تصوف کی۔ عربی میں تحریر و تقریر کے موقع شاذ ہی آتے۔ فارسی کا دامن بھی اگرچہ علوم و معارف سے خالی نہیں تھا، لیکن فارسی زیادہ تر ادب کی زبان تھی۔ فارسی کا چرچا گھر گھر میں تھا۔ فارسی کے اثرات مقامی بولیوں میں سراحت کر چکے تھے۔ تقصہ پنجابی میں لکھا جاتا عنوان فارسی میں قائم ہوتے۔ یوں بھی ہندی اسلامی تہذیب و تمدن فارسی اللسان قوموں کا مرہون منت ہے۔ لہذا عربی کی نسبت ہندی ذہن فارسی سے کہیں زیادہ قریب تھا۔ اردو ادب نے بھی فارسی ہی کی آغوش میں تربیت پائی۔ اردو ایک طرح سے فارسی کی شخصی پیداوار ہے۔ فارسی شاعری میں علمی اور فلسفیانہ حقائق کا ابلاغ جس مخصوص، دلکش اور سلیمانی میں ہوا محمد اقبال اس کے پردے میں اپنے خیالات اور تصورات کا افہار بڑی سہولت اور آسانی سے کر سکتے تھے۔ فارسی سے محمد اقبال کو طبعی مناسب تھی۔ انھوں نے فارسی زبان اور فارسی ادب کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا جیسے آگے چل کر مغربی بالخصوص انگریزی زبان اور انگریزی ادب کا۔ البتہ انھیں افسوس رہا تو یہ کہ عربی ویسے ہی ان کی زبان نہ بن سکی جیسے فارسی۔ ”کیا اچھا ہوتا اگر میں مسلمانوں سے عربی میں خطاب کر سکتا۔ اس صورت میں میرا پیغام شاید زیادہ موثر ثابت ہوتا۔“ عربی زبان کی عظمت اور افادیت کا انھیں نہایت گہرا احساس تھا۔ عالم اسلام کی نشاة الثانیہ میں بھی ان کی امیدیں زیادہ تر دنیاۓ عرب ہی سے وابستہ تھیں، مگر اسے کیا کیا جائے کہ محمد اقبال کو فطرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔ شاعر اقبال کی طبع موزوں اردو ہی کا رخ کرتی۔ اردو کا

رُخ کیا تو اردو اور فارسی میں دو ہی قدم کا فاصلہ ہے، یہ فاصلہ دیکھتے ہی دیکھتے طے ہو گیا۔ اردو کی جگہ فارسی نے لے لی۔ یوں بھی اردو کا ظرف تنگ، بقدر شوق نہیں تھا۔ بہر حال یہاں جو بات قابل غور ہے یہ کہ میر حسن کے ہاتھوں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت ابتدائی میں اس نئی پر ہوئی کہ ایک ایسے ذہن کی تشكیل ہوتی رہے جس میں وسعت ہو، جامعیت ہو، جو خلوص اور صداقت سے مالا مال ان حقائق اور مسائل کا شعور پیدا کر سکے جن کا تعلق فردا و رمعاشرے سے ہے، یعنی اس جدوجہد سے جسے ہم تہذیب و تمدن سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو سمجھ لے وہ کیا رشتہ ہے جو ایک انسان کا دوسرے انسانوں، اپنے خالق و پروردگار اور اس کی پیدا کردہ کائنات سے ہے۔ پھر اگر طالب علم کی استعداد ہوئی، استاد کی بالغ نظر اور گھر کا ماحول جس میں اس کا مزدوبوم بھی شامل ہے، تعلیم کے ارکان ثلاش ہیں تو محمد اقبال کی تربیت میں ان کا تقاضا جس خوبی سے پورا ہوا بجائے خود کچھ کم نہیں۔

## ۵۔ پروردہ مرشد اقبال

باب: شیخ نور محمد بڑے نیک زیر اکیڈمی اور معاملہ فہم بزرگ تھے۔ کہیں تعلیم نہیں پائی لیکن بقول میر حسن ”ان پڑھ فلسفی“، علم و حکمت، شریعت، طریقت، فلسفہ اور کلام کے مسائل سے دلی لگاؤ۔ علم و حکمت کی باتیں بڑے غور سے سنتے۔ فصوص الحکم اور مشنوی معنوی کا درس ہوتا تو ہمہن گوشیں ہو جاتے۔ ”ہمارے ہاں ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کا باقاعدہ مطالعہ ہوتا تھا۔“<sup>۱۵</sup> میرے والد اور شاہ صاحب ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔<sup>۱۶</sup> اب اسے حسن اتفاق کہیے یا الطفیل غلبی کہ میر حسن نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ محمد اقبال کے بالائے سرستارہ بلندی چمک رہا ہے، انھیں اپنے درس میں لے آئے۔ حالانکہ شیخ نور محمد نے ایک نہیں کئی بار کوشش کی کہ انھیں کاروبار میں شریک کر لیں۔ پھر جب ان کی خواہش تھی کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کرے تو مولانا غلام حسن کے درس کی طرح وہ انھیں مولانا مرتضیٰ یا مولانا مزل کے درس میں بھاگ سکتے تھے یعنی جس میں اگر میر حسن سدر را نہ ہو جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ محمد اقبال مردیہ دینی نصاہب اور روایتی تصوف میں کمال پیدا کر لیتے، ملائے مسجد یا پیر خانقاہ بن جاتے، اسکول اور کالج کی تعلیم کے بعد کوئی اعلیٰ ملازمت حاصل کر لیتے، اقبال ہر گز نہ بننے۔ لیکن جس طرح میر حسن ایک طرح سے محمد اقبال کے ہمہ وقت استاد تھے، شیخ نور محمد کو بھی

ہر وقت خیال رہتا کہ بیٹھ کی سیرت اور کردار اسلام کے ساتھے میں ڈھل جائے۔ اس میں دین کا صحیح فہم پیدا ہو۔ بیٹھ کو پڑھتے لکھتے دیکھتے، یا کوئی واقعہ پیش آتا تو نصیحت کرتے۔ موقعہ ہوتا تو کوئی نکتہ سمجھا دیتے۔ ایک دن ایک سائل دروازے میں کھڑا ملنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ محمد اقبال نے اسے چھڑی رسید کی۔ شیخ صاحب آبدیدہ ہو گئے، بیٹھ کو سمجھانا چاہتے تھے یہ تم نے کیا کیا: ارشاد باری تعالیٰ واما السائل فلا تتمہر<sup>۸۸</sup> اور حضور رحمۃ للعالیین<sup>۸۹</sup> کے اسوہ حسنہ کی خلاف ورزی کل جب بارگاہ الہی میں میری باز پرس ہو گئی، مجھے سرزنش کی جائے گی کہ میں تمہاری تربیت سے قاصر ہا تو حضور رحمۃ للعالیین<sup>۹۰</sup> کے سامنے کیا جواب دوں گا۔<sup>۹۱</sup> ایسے کئی واقعات ہیں؛ وہ بھی جن کا تعلق سیرت و کردار کی تربیت سے ہے اور وہ بھی جن سے کسی دینی حقیقت کی تفہیم مقصود تھی۔ ”میرا معمول تھا نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا، ایک روز والد ماجد مسجد میں آئے، مجھے قرآن مجید پڑھتے دیکھا تو بیٹھ گئے، پوچھنے لگے بیٹا کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے کہا قرآن مجید۔ کہنے لگے کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟ میں نے کہا تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنा۔ کچھ دن گزر گئے۔ میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا تلاوت ختم کی تو مجھے بلایا، اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے، بیٹا قرآن مجید اسی کو سمجھ میں آتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت مآب<sup>۹۲</sup> کے بعد قرآن مجید کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے، کہنے لگے کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رُگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ میں ہم تون گوش بیٹھا تھا۔ پھر کہا سنوآدم علیہ السلام سے حضور رحمۃ للعالیین تک کہ خاتم الانبیا ہیں، جتنے بھی پیغمبر آئے ان کا گز ردار ج محمد یہ سے ہو رہا تھا۔ وہ ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ حضور رحمۃ للعالیین پر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم حضرت محمد اکی ذات مستوہ صفات میں ہمارے سامنے آ گیا۔ اب آپ<sup>۹۳</sup> کا اسوہ حسنہ ہمارے لیے جلت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ جتنا کوئی اس رُگ میں رنگتا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس کی سمجھ میں آتا جائے گا۔ یہ مطلب تھا میرے کہنے کا کہ قرآن مجید اسی کو سمجھ میں آتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔“<sup>۹۴</sup>

بات یہ ہے کہ انتراع سلطنت اور سلب اقتدار کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی زبوب

حالی کے باوجود مسلمانوں میں ابھی دم تھا، اسلامی اخلاق اور آداب و شعائر کا احترام باتی تھا۔ حسن انسانیت اور شرافت ذات کا چہرہ زر و سیم کی آلو دگی سے داغ دار نہیں ہوا تھا۔ نہ غرور حسب و نسب اور علم و دانش سے اس میں تکلف اور تصنیع کا رنگ پیدا ہوا۔ ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو کہنے کو جاہل اور ناخواندہ، عسرت اور سادگی کی زندگی بسر کر رہے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان و یقین اور فکر و فہم کی دولت سے مالا مال تقاضہ اور خودداری پر فخر کرتے۔ محمد اقبال کی پروپریٹی بھی ایک ایسے ہی گھر میں ہوئی۔ شیخ نور محمد اہل اللہ کے ارادت مند تھے۔ علماء و مسلمانوں کے حلقة نشیں، اور دو اذکار میں مصروف رہتے۔ صاحب کشف تھے۔ محمد اقبال ۱۱ برس کے تھے جب ایک رات ان کی آنکھ کھلی۔ دیکھا والدہ زینہ اتر رہی ہیں، والد دروازے کے قریب صحن میں بیٹھے ہیں، ایک حلقة نوران کے ارد گرد قائم ہے۔ جیران ہو کر بستر سے اٹھے۔ صحن کا رخ کر رہے تھے کہ والدہ نے روک دیا صبح ہوئی تو معلوم ہوا۔ ایک قافلہ افغانستان سے آ رہا ہے، اس میں ایک شخص بیمار پڑا ہے، حالت اچھی نہیں، والد اس کے لیے کوئی دوایتار کر رہے تھے۔ انہوں نے اسی روز محمد اقبال کو ساتھ لیا اور قافلے کا جوامی شہر سے میں پچیس میل دور تھا، رخ کیا۔ قافلے میں پہنچ کر مریض کو دیکھا، کوئی راکھتی دوا اس کے جسم پر چھڑ کی اور دو اپس آ گئے۔ کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ کچھ دنوں کے بعد قافلہ بھی سیالکوٹ پہنچ گیا۔ دوا کا رگر ثابت ہوئی۔ مریض صحت یاب ہو چکا تھا۔

قافلے نے اپنا راستہ لیا۔<sup>۱۵</sup>

محمد اقبال ابھی لا ہو رہیں آئے تھے کہ شیخ نور محمد انھیں اون شریف<sup>۱۶</sup> لے گئے۔ قاضی سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔<sup>۱۷</sup> قیاس یہ ہے کہ اسی سفر میں محمد اقبال قاضی صاحب سے بیعت ہوئے<sup>۱۸</sup> اور سلسلہ قادریہ میں شامل ہو گئے۔ سید سیمان ندوی کو لکھتے ہیں ”میں خود سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوں“، مگر پھر اس کے ساتھ یہ بھی ”کوچہ نقشبند اور مجدد سہندری کی میرے دل میں بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے“<sup>۱۹</sup> بات یہ ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں تصوف کے رسی حدود و قیود سے آزاد تھے۔ ان کا تعلق دراصل تصوف کی اس روایت سے تھا جو امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئی اور جسے امام غزالی سے خاص تعلق ہے۔<sup>۲۰</sup> اس روایت کی نظر انسان کی شخصیت پر ہے۔ لہذا اس کا رشتہ احکام شریعت سے منقطع ہوانہ زندگی کی جدوجہد سیاست اور جہاں بانی سے۔ جی چاہے تو محمد اقبال ہی کی اصطلاح میں کہہ لیجیے کہ اس پر ”عجمیت

”کی بجائے ”مجد دیت“ کا رنگ غالب تھا۔ محمد اقبال باپ کو میاں جی کہتے، انھیں اپنا مرشد سمجھتے۔ حضرت لسان العصر کو لکھتے ہیں: ”آپ نے پنج فرمایا ہے، سارا کتب خانہ ایک طرف، باپ کی نگاہ حقیقت ایک طرف۔ جب کچھی موقعہ ملتا ہے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں ۷۔ ایسے ہی شیخ اعجاز احمد کو لکھتے ہیں: ”دن میں ایک آدھ دفعہ وقت نکال کے ان کے پاس بیٹھا کرو۔ جن باتوں میں ان کو دلچسپی ہے ان کے متعلق ان سے گفتگو کرو، خواہ وہ گفتگو بے تکف ہی کیوں نہ ہو۔ تم کو اس سے بہت فائدہ ہو گا۔ کیا عجب ہے جو بات ان سے..... حاصل نہیں ہو سکی تم کو مل جائے۔ یہ بات ہو گی تو زندگی بھر ان کے احسان کو فرماؤش نہ کر سکو گے، اگرچہ اس وقت تم کو اس کا احساس نہ ہو۔ تم ان کے مذاق میں رنگین ہو جایا کرو۔ اس فائدے کے علاوہ دوسرے فائدے کا بھی امکان غالب ہے۔ کسی وقت خوش ہو کر ایک کبیر انس آدمی کے منہ سے دعا نکل جائے تو اسے دنیا کے تجربے نے نہایت پرتاشیر بتایا ہے۔“ ۸۔ یہ میاں جی کی احتیاط پسندی اور میر حسن کے ہاتھوں محمد اقبال کی فکر و وجدان میں توازن تھا جس سے ان کے دل و دماغ پر عجمیت کا رنگ جمنے نہ پایا، وحدۃ الوجود کا۔ شیخ نور محمد کی خواہش تھی محمد اقبال شاہ بولی قلندر کے طور پر ایک مشنوی لکھیں۔ ۹۔ چنانچہ اس کے کچھ اشعار بھی ہوئے جن کو بعد میں اسرار خودی میں شامل کر لیا گیا۔ یوں باپ کی آرزو کہ محمد اقبال ایک مشنوی لکھیں اس مشنوی کی شکل میں پوری ہوئی۔ میں نے انھیں دیکھا ہے: بلند قامت سرخ و سفید چہرہ، سفید براہ داڑھی، درویشانہ وضع، خوش پوش، سفید لباس پہنے چھڑی ٹیکتے گھر سے نکلتے۔ بیٹھے کی بلند اقبالی پر دل ہی دل میں اللہ کے شکر گزر، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے طویل عمر پائی۔ ۱۹۳۰ء میں فوت ہوئے، ۷ اگست۔ امام صاحب میں اپنی رفیقة حیات کے پہلو میں دُن ہیں۔ محمد اقبال نے تاریخ کی:

پدر و مرشدِ اقبال ازین عالم رفت  
باہمہ راہروال منزل ما ملکِ ابد  
ہائف از حضرت حق خواست دو تاریخِ رحیل  
آمد آواز ”اُثرِ رحمت“ و ”آغوشِ لحد“

ماں: بے جی، محبت مادری کی تصویر۔ بات بات میں بیٹھے کا خیال رکھتیں۔ بیٹھے کو بھی ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ سیالکوٹ سے لا ہو ر آئے تو جہاں ذرا سی فرصت ملی، ماں کی کشش انھیں سیالکوٹ لے گئی۔ جب تک ممکن ہوتا ٹھہر تے۔ پھر جب ماں ان کو پیار سے بلا تی، انھیں نام

لے کر پکارتی، اقبال یا کچھ اور کہہ کر تو محمد اقبال زندگی کی اوچ گاہوں سے اتر آتے۔ ان کی صحبت میں طفیل سادہ رہ جاتے۔ اللہ ماس نے ان کی تربیت جس خوبی سے کی اس کا اندازہ ان اشعار سے کہیے:

محفلِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات  
تھی سرپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات  
تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا  
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا  
اور پھر کس حسرت بھرے دل سے کہتے ہیں:

عمر بھر تیری محبت میرے خدمت گر رہی  
میں تیری خدمت کے جب قابل ہوا تو چل بسی  
والدہ مرحومہ کی یاد میں، جو نظم لکھی گئی ایسی ہی ماں کی یاد میں لکھی جا سکتی تھی۔ محمد اقبال نے اس نظم کو کسی خوشنویس سے لکھوا�ا اور خود ہی اس پر تشریحًا حواسی لکھ کر اپنے والد ماجد کی خدمت میں بھیج دیا۔ شیخ اعجاز احمد کے پاس اس کی نقل محفوظ ہے جس کا عکس نمونہ روز گار فقیر حصہ دوم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ تہائی میں جب بھی پچاچان کا کلام بآواز بلند پڑھتے ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ وادی اماں گھر میں ”بے جی“ کہلاتیں۔ محمد اقبال کو بے جی کی وفات کا شدید صدمہ ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں: ”سرکار کی تاریخ اقبال کو بے جی کی وفات کا شدید صدمہ ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں: ”سرکار کی تاریخ گئی، مگر امسال میرے لیے عیدِ محرم کا حکم رکھتی تھی۔ والدہ مکرمہ جو سات ماہ سے بیمار تھیں ۶ نومبر کی صبح کو ان کا انتقال ہو گیا۔“ ۳۱ پھر لکھتے ہیں: ”آپ کا تسلی نامہ ملا..... میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا، اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔“ ۳۲ حضرت لسان العصر نے تعزیت فرمائی، تاریخ کبی ”رحلت من درودہ“۔ ۳۳ اور پھر کیا خوب کہا ہے۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں  
قوم کی نظریں جوان کے طرز کی شیدا ہوئیں  
یہ طریق دوستی ، خوداری با تمکنت  
یہ حق آگاہی، یہ خوشگوئی، یہ ذوق معرفت

اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین اپنے امور تھے  
با خدا تھے، اہل دل تھے، صاحب اسرار تھے۔<sup>۲۵</sup>

بھائی: شیخ عطا محمد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ ہی میں کچھ تعلیم حاصل کی۔ فوج میں ملازم ہو گئے۔ فوج ہی کی وساطت سے رڑکی کان لج پہنچ۔ انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ملٹری ورکس سروس میں ملازمت مل گئی۔ عمر بھرا سی مجھے سے وابستہ رہے۔ محمد اقبال سے بے پناہ محبت تھی۔ محمد اقبال کی تعلیمی زندگی میں شیخ صاحب کا حصہ کچھ کم نہیں۔ ایسے شفیق بھائی کی مثال مشکل ہی سے مل گئی۔ محمد اقبال ان کے احسانات کو کبھی نہیں بھولے۔ ہمیشہ ان کا ذکر محبت اور عزت سے کرتے۔ انھیں اپنے معاملات سے باخبر رکھتے۔ شیخ صاحب بھی بالالتراجم اس کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ کاروبار زندگی میں ان کے ہم پہلو تھے، ان کے دست و بازو، ماں کی محبت کی تصویر،<sup>۲۶</sup> شمعِ محفلِ عشق، یوسف ثانی جس کی اخوت قرار جان اور جس کی محبت نے من تو کا امتیاز باقی نہ رکھا، جس نے انھیں ہوائے عیش میں پالا، جوان کیا اور جس کے لیے وہ ہمیشہ دعا کرتے:

ریاضِ دہر میں مانند گل رہے خداوند۔<sup>۲۷</sup>

شیخ عطا محمد ۱۹۳۰ء میں فوت ہوئے، ۲۲ ربیعہ۔ اپنے عزیز بھائی کی وفات کے تقریباً دو سال آٹھ مہینے بعد۔ محمد اقبال کا یورپ میں تعلیمی سفر بھائی ہی کی بدولت ممکن ہوا۔ محمد اقبال کو بھی بھائی سے بے پناہ محبت تھی، ان کی اولاد بالخصوص ان کے بڑے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد سے جوزمانہ طالب علمی ہی میں اپنے عظیم پچا کا کلام جمع کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی اور ابتدائی دور کا بہت سا کلام ہمیں شیخ اعجاز احمد ہی کی یادداشتؤں سے ملا۔ بقول سید وحید الدین ”میں نے روز گار فقیر کے نقش اول کی ترتیب کا آغاز کیا تو انھوں نے نہایت فیاضی اور فراخ دلی سے احوال و وقار کا تمام تر، جس قدر سرمایہ تھا، میرے سامنے رکھ دیا۔ علامہ کی خود نوشت عبارتوں کی اقتباسات بعض دستاویر اور تمنیے“<sup>۲۸</sup>۔ شیخ اعجاز احمد کی اس مقالے میں احتیاط کا یہ عالم تھا، وہ جب اپنے عظیم پچا کے بارے میں کوئی اناپ شناپ روایات سننے تو انھیں بڑا دکھ ہوتا۔<sup>۲۹</sup> اور یہ امر فی الواقعہ افسوس ناک ہے کہ اس قسم کی اناپ شناپ روایتوں کو بعض ایسے سوانح یا مضامین نگاروں نے بھی صحیح مان لیا جن سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ انھیں بغیر سوچے سمجھے صحیح تسلیم کر لیں گے۔ محمد اقبال کو شیخ اعجاز احمد سے بڑی محبت تھی۔ انھیں دعا اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنے کی ہدایت کرتے۔ اعجاز صاحب نے نبی۔ اے کا امتحان دیا تو محمد اقبال والد

ماجد کو لکھتے ہیں: ”اعجاز کامیاب ہو جائے گا، آئیہ کریمہ کا ورد شروع ہے“۔ اعجاز صاحب نے وکالت شروع کی تو نماز میں پابندی اور تلاوت قرآن مجید کی تاکید کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”قرآن پر زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربے میں آچکے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی علمی نکتہ بھی سمجھا دیتے جنمی کے ماہی ناز شاعر گوئے نے اپنے معاصر نوجوانوں کے روحانی اضطراب اور دلی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے انھیں پیغام دیا تھا فن میں پناہ لوز کہ یہ بات صداقت سے خالی نہیں۔ میرا پیغام بھی مسلمانوں کے لیے وہی ہے جو گوئے کا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے آرٹ کی جگہ مذہب کا لفظ رکھ دیا ہے۔ آرٹ میں اطمینان اور قوت دونوں موجود ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں ”روز گار فقیر میں پچا جان کے بارے میں جو کچھ مرقوم ہے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے حرف بحر صحیح ہیں۔ باقی معلومات کی صحت یا عدم صحت کا میں ذمہ دار نہیں“، ایک مثلاً ذکر اقبال کی ایک روایت۔

محمد اقبال کو ملازمت سے کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس امر سے کیجئے۔ اعجاز کا دل انکم تکیں ملازمت میں نہ لگا۔ اسے چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ ان سے مشورہ لیا تو انھوں نے کیا:

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن

## ۶۔ استاد اقبال

شمیس العلماء مولانا مولوی میر حسن۔ تاریخی نام رونق بخش۔ ۱۲۵۸ھ۔ کہ انھوں نے فی الواقعہ محفل علم و حکمت کو رونق بخشی۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے نھیں فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں۔ سید محمد شاہ طبیب کے بیٹے۔ کم سنی ہی میں باپ کے زیر تدبیت قرآن مجید حفظ کر لیا۔ چند دن اساتذہ کے درس میں بیٹھے۔ پر جو کچھ حاصل کیا اپنی ذاتی محنت اور استعداد سے۔ علم و فضل کی دولت خداداد تھی۔ طباعت میں کہ خاندانی مشغله تھا دل نہ لگا۔ روزگار کے لیے ایک مسجد میں پیش امام ہو گئے۔ شام کے قریب ایک شخص کھانا لے کر آیا تو عزت نفس کو ایسی ٹھوکر لگی کہ غش کھا کر گر پڑے۔ مسجد سے مشن اسکول کا رُخ کیا۔ ۱۶ برس کی عمر تھی، ملازم ہو گئے۔ چھوٹی جماعتوں کو پڑھانے لگے۔ مگر فطرت نے انھیں معلم پیدا کیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی قابلیت کا سکھ بیٹھ گیا۔ بڑی جماعتوں کی پڑھائی ان کے سپرد ہوئی۔ پھر دیکھتے ہی

دیکھتے معلمی سے پروفیسری کے درجے تک جا پہنچے۔ تا حین حیات اسکا جمشن ہی سے وابستہ رہے۔ جمشن نے بھی ان کے علم و فضل اور تعلیمی خدمات کی بڑی قدر کی۔ پیرانہ سالی میں پڑھانے سے مغذور ہو گئے تو ان کی خدمات کے اعتراف میں پیش مقرر کر دی۔ حالانکہ ایسا کوئی قاعدہ نہیں تھا کہ انھیں پیش دی جاتی۔ مرے کا لمحہ تعمیر ہوا تو ہال کو انھیں کے نام سے منسوب کیا گیا۔ میر حسن ہاں۔

میر حسن کہنے کو ایک مقامی اسکول میں مدرس تھے۔ کالج میں عربی کے استاد لیکن حقیقت میں استاذ الکل۔ ان کا حلقة درس بڑا وسیع تھا۔ نصاب درس بھی ویسا ہی وسیع وہ ہمہ وقت استاذ تھے۔ گھر میں استاد، مدرسے میں استاد، کالج میں استاد۔ گھر سے نکلتے، کسی کام سے آتے جاتے تو استاد۔ مسجد میں استادِ حقیقی کے وضو کرتے بھی استاد۔ سیالکوٹ میں میر حسن سے زیادہ شاید ہی کسی کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ ان کے ارادت مندد دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ با ادب سلام کرتے لیکن میر حسن کے اکسار اور فروتنی کا یہ عالم کہ یمشون علی الارض هونا<sup>۲۴</sup> کی زندہ مثال۔ ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے آگے بڑھ جاتے۔ شاگرد منتظر رہتے کب ان کا کہاں گزر ہوتا ہے۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ کہاں استاد سے ملیں گے، سبق لیں گے، الگ ہو جائیں گے۔ کہاں دوسرا کی باری آئے گی۔ شاگرد بہت ہیں مگر سب ایک سے بڑھ کر عزیز، سب کا ایک سا، خیال سب اپنے اپنے وقت پر حاضر، حسب استعداد کسب فیض کر رہے ہیں۔

میر حسن کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ لباس سادہ تر۔ جھوٹے موٹے کپڑے کا سفید پاک صاف کرتہ، سفید چادر، سفید پاجام، سفید چغہ نما کوٹ، کاندھے پر رومال۔ اس کے ایک گوشے میں بُلی ٹائم پیس، ٹالے گھر کا سودا سلف خود ہی خرید کرتے بلکہ ہمسایوں سے بھی پوچھ لیتے انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ شاگرد خدمت گزاری کے لیے آگے بڑھتے، سائے کی طرح ساتھ لگلے رہتے، بالخصوص جشید علی راٹھور اور پروفیسر محمد دین بھٹی۔ لیکن میر حسن بڑی خوش اسلوبی سے روک دیتے۔ محمد اقبال کو البتہ نہیں روکتے۔ حب جاہ ہے، نہ شہرت اور نام آوری کا خیال۔ جسم قفاعت، جسم استغنا، عزت اور خودداری، صدق مقاول اور اکل حلال کا جیتا جاتا نمونہ۔ نہ غرور علم ہے، نہ دعویٰ پارسائی۔ عابد و زاہد، غریب پرور، اقر بانواز، راست باز، تہجد گزار، احکام شریعت کے سختی سے پابند۔ احتیاط کا یہ عالم کہ کوئی بات خلاف سنت نہ ہونے پائے۔ نہایت ضعیف العمری میں روزہ رکھا۔ کالج سے واپس آ رہے تھے۔ ضعف کا یہ عالم کہ

غش آ گیا۔ ہندو شاگرد پریشان ہے، شربت کا گاس لے کر آگے بڑھا۔ منہ سے لگانا تھا کہ انھوں نے دونوں ہونٹ چھینچ لیے۔ اس حالت میں بہ مشکل گھر پہنچے۔ عصر کی نماز کے بعد جیسا کہ معمول تھا قرآن مجید کی تلاوت کی۔ روزہ افطار کیا۔ دوسرا روز پر پسل نے شاید، وعلی اللہ یطیقونہ،<sup>۲</sup> کے حوالے سے پیغام بھیجا کہ اس پیرانہ سالی میں روزہ نہ رکھیں۔ کہنے لگے: یہ عشق و محبت کا رشتہ ہے۔ اس میں جان بھی حاضر ہے۔ سنتیں اور نوافل تک بالالتزام ادا کرتے۔ قرآن مجید حرز جان تھا۔ ”قرآن مجید کی شاید ہی کسی نے اس کثرت سے تلاوت کی ہو۔ جیسے شاہ صاحب نے۔ ان کی عظمت کردار اور ان کی پابندی عہد کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جواناں مرگ بہنوں سے عہد کیا تھا ان سے روز ملا کریں گے۔ یوں ہر روز کا ماننا ان کا معمول بن گیا۔ سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو یا بارش روز صح فاتحہ خوانی کے لیے جاتے۔ جوان مرگ بہنوں اور ماں باپ کے لیے دعا کرتے اور وہ بھی ایک نہیں لگاتار پچھاں برس۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آتے جاتے قرآن مجید کی ایک ایک منزل تلاوت فرماتے۔<sup>۵</sup> کے لوگ کہتے انھیں کشف ہوتا ہے۔ دل کی بات معلوم کر لیتے ہیں۔ بڑھاپے میں جب بینائی جاتی رہی ایک شخص کی جو ملازمت کے لیے آیا تھا آوازن کر رہی کہہ دیا آدمی دیانت دار ہے۔ ایک طالب علم کو دیکھا اور کہہ دیا اس میں ذہانت نام کو نہیں۔ وزیر آباد میں لڑکا مدرسے سے غیر حاضر رہا کرتا تھا، ایک روز بازار میں خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا پڑھنے کا شوق ہے۔ لیکن استاد بہت پیٹتا ہے۔ کہنے لگے میرے پاس آؤ میں تمھیں پڑھاؤں گا۔ پیٹھوں کا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہندو لڑکا حاکم رائے نام میر حسن کے زیر تعلیم ترقی کرتے سرکاری ملازمت میں ایک اعلیٰ عہدے تک پہنچ گیا۔ مولوی ابراہیم جن کو ان سے تلمذ تھا کہتے ہیں کیسی بھی پریشانی ہوتی، کیسی بھی لمحص، شاہ صاحب سے بات کرتے ہی جی خوش ہو جاتا۔ پریشانی جاتی رہتی۔<sup>۶</sup> کے ان کے یہاں ہمیشہ اہل علم کی محفوظ جی رہتی۔ گھنٹوں مختلف مسائل پر دلچسپ بحثیں ہوتیں۔ محمد اقبال کہتے: اسوہ رسول ﷺ پر صحیح معنوں میں کسی شخص کا عمل ہے۔ تو وہ مولوی میر حسن سیالکوٹی ہیں یعنی میر حسن فطرت انسانی کے راز دار تھے۔ ہر ایک سے علیٰ قدر عقلہ بات کرتے۔ کوئی معاملہ ہوتا اس کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ کوئی مشکل ہو چند لفظوں میں حل کر دیتے۔ رہے طالب علم سوان کا ذہن تو ان کی مٹھی میں تھا۔ وہ ان کی نفیات، ان کی عادات، اخلاق اور ذہنی استعداد کا اندازہ نہایت خوبی سے کر لیتے۔ خوب جانتے ان کا مستقبل کیا ہے۔ جیسی کسی کی صلاحیت ہوتی اسے اس راستے پر ڈال

دیتے۔ ویسا ہی ذوق پیدا ہو جاتا اور یہی ان کی تعلیم کا خاصہ<sup>۸</sup> کے میر حسن گھر میں بیٹھے ہیں۔ چنانی یاد ری کا فرش ہے۔ ادب اور لغت کے عقدے کھل رہے ہیں۔ تفسیر اور حدیث کا درس ہو رہا ہے۔ فقہ و کلام، تصوف اور الہیات کی گنتیگو ہے۔ کوئی ایک کتاب کھولے بیٹھا ہے، کوئی کسی دوسرے مضمون کی۔ میر حسن ہر ایک کسب دے رہے ہیں۔ شاگرد ہمہ تن گوش ان کے ارشادات سن رہے ہیں۔ ان کی ہربات دل میں اُتر جاتی۔ اندراز تعلیم سادہ اور دل نشین۔ افہام و تفہیم کی نوبت آتی تو مثالوں پر مثالیں دے کر سمجھا رہے ہیں۔ حوالوں پر حوالے دے رہے ہیں۔ اس میں نظم و نثر کی قید ہوتی، نہ فارسی اور عربی، نہ اردو اور پنجابی کی۔ عرب جاہلیت سے لے کر فارسی کے اساتذہ، مولانا روم، فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، عرفی، بیدل، غالب حتیٰ کہ فضل شاہ، بلحے شاہ، علی حیدر کے اشعار سے بھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انگریزی کی کوئی سند پیش کر دی۔ معلومات کا ایک بحر ذخیر املا کا چلا آتا۔ ایک طرف کسی جید مولوی کو تفسیر قرآن کے نکات سمجھا رہے ہیں، دوسری طرف کسی دوسرے مولانا کو حدیث نبوی کا درس دے رہے ہیں۔ اس پر لطف یہ کہ بچوں پر بھی یکساں توجہ ہے۔ وہ بھی سبق کے لیے منتظر بیٹھے ہیں۔<sup>۹</sup> لے بکھیت استاد میر حسن سخت گیر ضرور تھے، مگر اس انداز سے کہ جیسا کوئی شاگرد ہے اس کی صلاحیت اُجگر ہو جائیں۔ وہ ان کے دل سے ہمدرد تھے۔ میر حسن شاگروں کی بہت بڑھاتے۔ ان کی خاطر، مدارات کرتے۔ نتیجہ یہ کہ طفیل گریز پا بھی آپ ہی آپ ان کی طرف کھنچا چلا آتا۔<sup>۱۰</sup> بقول ڈاکٹر ملک راج آندہ، مولانا موصوف ان باقیات الصالحات میں سے تھے جن کے دم سے ملکہ وکٹوریا کے عہد میں مغل تہذیب و تمدن کی شمع اکناف ہند میں فروزان رہی اس مشفق“ استاد کی صحبت سے شاعر کے قلب میں ایرانی ادبیات کی وہ شیفتگی پیدا ہو جاتی جوان کی پختہ سالی کی تصانیف میں نمایاں نظر آتی۔<sup>۱۱</sup> ریاضی، طب، قدیم و جدید نصاب تعلیم سب پر نظر ہے۔

درامل میر حسن اپنی ذات سے ایک دارالعلوم تھے۔ ان کے شاگروں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی شامل تھے۔ سب نے ان سے کسب فیض کیا۔ سولہ برس کی عمر سے لے کرتا ہیں حیات جب بالکل معدود نہیں ہو گئے ساری عمر عربی، فارسی علوم و فنون کا درس دیتے رہے وہ بھی بلا معاوضہ۔ کسی کا احسان نہیں لیا۔ حالانکہ ان کے شاگرد اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے زرودلت سے مالا مال خاندانوں کے چشم و چراغ سب سے ان کی ملاقات رہتی۔ ان کے ملاقاتیوں میں بھی امیر اور غریب کی قید تھی، نہ چھوٹے بڑے کی۔ رو سائے شہر، حکامِ ضلع،

اربابِ مشن، علماء، صوفیہ، سب سے ان کے مراسم تھے۔ سب سے گفتگو کمیں ہوتیں۔ مسائل زیر بحث آتے۔ یوں بھی یہ زمانہ قدیم و جدید کے تصادم کا تھا جس میں عیسائیت کی یلغار نے اور بھی اضافہ کر رکھا تھا۔ جدھر دیکھیے مذہبی نزاع و جدال کا ذریعہ۔ مناظرہ بازی عام تھی۔ لیکن میر حسن کے پاس فالتوں عقل تھی ہی نہیں۔ انھیں مناظروں سے دلچسپی تھی، نہ مذہبی فرقہ بندیوں میں قیل و قال سے۔ وہ اول و آخر انسان تھے نقطہ نظر خالصہ انسانی۔ وہ ان بحثوں میں ارباب علم ہوں، یا اربابِ مذہب سب کو انسانیت کی اس سطح پر لے آتے جہاں اختلاف عقائد اور اختلاف مسلک و مشرب کے باوجود حق و صداقت کی طلب سب کو ایک کر دیتی، اس مقام پر لے آتی ہے جہاں وہ آپ ہی آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے راستے اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن منزل ایک۔ سب ایک ہی نصبِ اعین کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انھیں ایک ہی صداقت کی تلاش ہے۔ سب اس کے حصول کے آرزو مند۔ یوں ذہن انسانی جب اپنی خود ساختہ حدود و قیود، تعصباً اور تنگ نظری سے پاک ہو کر ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جاتا ہے تو اس میں ایک دوسرے کے لیے جذبہ احترام، احسان و محبت اور رواداری اُبھرتی ہے۔ اس ادراک اور یقین کو تقویت پہنچتی ہے کہ بنیادی طور پر ہم سب ایک ہیں کوئی کسی کا غیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر حسن کی صحبت میں نہ کسی کو کسی کے عقائد سے بحث ہوتی، نہ اس کے ملی اور قومی تشخص سے۔ ان میں دوئی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یتھی میر حسن کی انسان اور انسانیت کے لیے دل سوزی جو حقیقی روح ہے اسلام کی۔ میر حسن اول و آخر انسان تھے۔ نہ ملائے مسجد، نہ زاہدِ خشک۔ ان کی با اصول اور با وقار شخصیت، علم و فضل، صاف و سادہ اور درویشانہ زندگی سے ہر کوئی متأثر ہوتا۔ ان کا ادب کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ جو بھی ملتا اس کا بھی خوش ہو جاتا۔ وہ ہر ایک سے بلا تکلف اور بمروت پیش آتے۔ کم گو تھے، لیکن سرتاپا التفات۔ ہر ایک سے تعلق خاطر، ہر ایک کے خیر خواہ۔ نہ مکھ شگفتہ مزاج۔ بات بات میں ظرافت کی چاشنی۔ لطیفے پر لطیفہ، مگر ایسا نہیں کہ خالی از معنی ہو۔ اس میں کوئی نہ کوئی پہلو نصیحت یا مصلحت کا ضرور ہوتا۔ میر حسن مسجد سے نکل رہے ہیں۔ شاگرد تیزی سے آگے بڑھتا ہے، عقیدت کا تقاضہ ہے کہ استاد کو جو نتا پہنائے۔ لیکن ابھی ایک پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ میر حسن نے دیکھ لیا۔ تیزی سے آگے بڑھے۔ شاگرد کا ہاتھ روک لیا۔ کہنے لگے ارے یہ تو میرے ہے شاگرد کی دل شکنی ہوئی، نہ میر حسن کے استغنا اور فروتنی میں فرق آیا۔ یوں میر حسن با توں با توں ہی میں شاگردوں کی تربیت کرتے۔ ان کا ہر فعل تعلیم تھا۔ وہ

تعلیم نہیں جس کا تعلق کتابوں کی ورق گردانی اور مدرسے کی قیل و قال سے ہے بلکہ وہ جس سے  
معنوں کا تعلق نہیں کیا۔ میر حسن آدم گیر تھے۔ انہوں نے کتابیں  
تعمیف نہیں کیں، انسان تعمیف کیے ہیں۔

ناممکن تھا میر حسن ایسے استاد سے محمد اقبال ایسا شاگرد متاثر نہ ہوتا۔ میر حسن کی انسان  
دوستی، میر حسن کا آفاقتی نقطہ نظر، میر حسن کا ایمان و یقین، میر حسن کی عزت نفس، خودداری اور  
استغنا، صاف و سادہ اور بے ریاضتی۔ میر حسن کی وسعت قلب، رواداری، وسیع النظری اور  
وسیع الہمشربی۔ مروت، تواضع اور اکسار، خوش مزاجی اور خوشی کلامی وہ اوصاف تھے جن سے محمد  
اقبال نے گہرا اثر قبول کیا۔ یہ میر حسن کا ہی درس تھا۔ جس نے ان کے لیے اسلامی علوم و معارف  
کی راہیں کھول دیں۔ میر حسن کے درس ہی میں وہ مشرق کی روح سے آشنا ہوئے۔ اسلامی  
تعلیمات کی غایت مقصود کو سمجھا۔ میر حسن ہی کی صحبتوں میں انہوں نے نوع انسانی کی محبت،  
عزت اور احترام کا سبق سیکھا۔ نظر میں وسعت اور آفاقت پیدا ہوئی۔ اسلامی قومیت اور امت  
کے حفظ و استحکام کا خیال دل میں جم گیا۔ تا آنکہ محمد اقبال کی ذات اور میر حسن کی شخصیت ایک  
دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو گئی کہ ایک سے ہمارا ذہن لازماً دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا  
ہے۔ محمد اقبال کے ایمان و یقین، محمد اقبال کے فکر و نظر، محمد اقبال کے دل و دماغ، سیرت و کردار  
کی تغیریں میر حسن کا حصہ فیصلہ کن ہے۔ ان کی شخصیت میں بڑی حد تک استاد کارنگ جھلکتا  
ہے۔<sup>۵۲</sup> میر حسن کے ہاتھوں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت جس نئی پر ہوئی اس سے ان کی زندگی کا  
رخ بھیشہ کے لیے متعین ہو گیا۔ نہ میر حسن کے بعد کوئی شخص ان کی زندگی میں آیا۔ کسی نے ان  
کے دل و دماغ کا رنگ بدلا۔ نہ اس راستے سے جو میر حسن کی بدولت بنیادی طور پر متعین ہو گیا  
تھا کسی دوسرے راستے کی تلاش کا سوال پیدا ہوا، لکھتے ہیں:

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں  
خیالات کا ارتقا البتہ سبق آموز ہے۔<sup>۵۳</sup> میر حسن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شروع ہی میں  
اندازہ کر لیا تھا کہ محمد اقبال ایک نابغہ اور عبقری کا ذہن لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی  
جب محمد اقبال اس نبوغ و عبقریت کو جوان کی طبیعت میں طرح طرح سے اپھر رہا تھا۔ حصول  
تعلیم میں، شعر و شاعری میں، دوستوں کی محفل میں، جس سے جیسے جیسے عمر میں آگے بڑھے  
طبیعت میں ایک خلش، ایک بے چینی اور ایک یہجان پیدا ہوتا گیا جسے خود بھی نہیں سمجھتے تھے میر

حسن نے اسے سمجھ لیا اور اس کا رخ اس کی صحیح سمت میں موڑ دیا۔ لہذا محمد اقبال کو اس شمع بدرگہ خاندان مرتضوی سے جس کا آستان ان کے لیے مثل حرم رہا<sup>۵۷</sup> جو عقیدت تھی اس کے اعتراض میں غلط نہیں کہا:

نفس سے جس کے کلی میری آرزو کی کھلی  
بنا یا جس کی مروت نے گئتے داں مجھ کو

محمد اقبال سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ والدہ کی محبت انھیں بار بار سیالکوٹ لے جاتی۔ ماں باپ سے مل کر ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ میر حسن کی خدمت میں با ادب حاضر ہوں۔ میر حسن سے ان کا رشتہ تتمذع عمر پھر قائم رہتا آنکہ سوز و ساز رومی، ہو یا تب و تاب رازی، وہ انھیں ہر بات سے باخبر رکھتے۔ ایک روز کہنے لگے میری طبیعت میں غم بہت ہے۔ میر حسن نے کہا اقبال پھر تمھیں اور کس چیز کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی فرمات ہے اسے سنن جاں کر رکھو۔ ضائع نہ ہونے پائے<sup>۵۸</sup> پورپ سے واپس آ کر، ڈاکٹریٹ کے لیے جو مقالہ لکھا تھا اسے کئی پہلوؤں سے ناقص پایا تو میر حسن کے زیر نگرانی کئی ایک پارسی صحف کا مطالعہ کیا۔<sup>۵۹</sup> اس کے ترجیح کی تحریک ہوئی تور وک دیا۔<sup>۶۰</sup> ”میں نے بڑے بڑے اہل علم سے گفتگو کی ہے۔ لیکن کیا بات ہے کہ باوجود اختلاف شاہ صاحب کے آگے میری زبان نہیں کھلتی۔ ان سے بات کرتے میری قوت گویائی جواب دے جاتی ہے۔ حالانکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجھے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف ہو۔ پورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم اور فلسفی نہیں ہے جس سے بتکف بات نہ کی ہو۔“<sup>۶۱</sup> ۱۹۲۳ء میں جب سوال پیدا ہوا کہ پنجاب کی باری ہے، پشی العلما کا خطاب کے دیا جائے اور گورنر پنجاب سر میلکیکن نے سرفضل حسین کے ایماء پر محمد اقبال سے مشورہ کیا تو انھوں نے میر حسن کا نام پیش کیا مگر اس شرط پر کہ پھر کسی دوسرے نام پر غور نہ کیا جائے۔ پوچھا گیا کیا ان کی کوئی تصنیف بھی ہے۔ سر جھکا کر کہنے لگے میں ہوں ان کی تصنیف۔ اس میں کوئی شک نہیں استاد اگر استاد ہے تو شاگرد کو اس کی تصنیف ہی کہا جائے گا۔ لیکن میر حسن ایسے استاد اور محمد اقبال ایسے شاگرد کی مثالیں کہاں ملیں گی۔ جی چاہتا ہے میر حسن ایسا استاد اور محمد اقبال ایسا شاگرد پھر پیدا ہو۔

محمد اقبال سے بڑھ کر شاید ہی کسی شاگرد نے استاد کی عزت کی ہوا اور میر حسن سے بڑھ کر شاید ہی کسی استاد نے شاگرد کا خیال رکھا ہو۔ محمد اقبال سر میلکیکن سے رخصت ہو کر باہر آئے۔

چند قدم اٹھائے تھے کہ پھر سر میکلگین کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کہنے لگے خطاب کے لیے اگر میری سفارش منظور ہو جائے تو میرے ضعیف العزم استاد کو لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔ چنانچہ انہیں شمس العلماء کی سندسیا لکوٹ، ہی میں دی گئی۔ خود میر حسن نے خطاب کا سنا تو اپنے بڑے صاحبزادے سید علی نقی کو لکھا: میں خطاب سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا عتاب سے۔<sup>۵۹</sup> محمد اقبال کے دل میں استاد کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ ان کے پیچے چلتے۔ ایک روز گھر سے باہر کسی دکان پر بیٹھے تھے کہ میر حسن کو آتے دیکھا۔ دیکھتے ہی تقطیماً اٹھ کھڑے ہوئے مگر جلدی میں جوتا نہ پہن سکے۔ اب ایک پاؤں پیروں میں ہے اور دوسرا جہاں بیٹھے تھے وہیں۔ اسی حالت میں گھر تک ساتھ گئے۔ واپس آ کر دوسرا پیروں پہننا۔ لیکن اس تعظیم و تکریم، ادب اور احترام کے باوجود استاد اور شاگرد میں کچھ الگی مفاہمت تھی کہ تکلفی تک کی نوبت آ جاتی۔ میر حسن بیٹھے ہیں محمد اقبال کا انتظار ہے کہ آئیں تو سبق شروع ہو۔ محمد اقبال آتے ہیں میر حسن کہتے ہیں اقبال دیر سے آئے ہو۔ بے ساختہ جواب دیتے ہیں اقبال دیر ہی سے آتا ہے۔<sup>۶۰</sup> میر حسن جی ہی جی میں خوش مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک روز ان کے گھر کا سودا لیے جا رہے تھے۔ میر حسن نے دیکھ لیا۔ روک کر کہنے لگے میں نے تمھیں بارہا کہا ہے تم میرے شاگرد ہو نو کرنہیں ہو۔ یہ سودا کیوں لیے جا رہے ہو۔ محمد اقبال نے بر جستہ جواب دیا، میں آپ کا شاگرد نو کر ہوں۔ اس طرح کے کئی لٹائف ہیں۔ ایک طرف محمد اقبال کی عقیدت دوسری جانب میر حسن کی شفقت۔ محمد اقبال ہربات میں میر حسن سے مشورہ کرتے اور میر حسن کا مشورہ فیصلہ کن ہوتا۔ ۱۹۲۸ء میں جب درد گرده نے اندیشہ ناک صورت اختیار کر لی اور ڈاکٹروں نے کہا آپریشن ناگزیر ہے تو محمد اقبال نے کہا بشرطیکہ شاہ صاحب کی رائے بھی یہی ہو۔ ڈاکٹر حیران کہ اس معاملے میں شاہ صاحب کی رائے چہ معنی دارد۔ انہوں نے ہر چند اصرار کیا لیکن محمد اقبال اپنی بات پر قائم رہے۔ شاہ صاحب سے رائے لی گئی تو انہوں نے کہا بہتر ہو گا محمد اقبال طب سے رجوع کریں۔ محمد اقبال دہلی گئے۔ حکیم ناپینا سے مشورہ کیا اور ان کے علاج سے صحت یاب ہو گئے۔ ادھر میر حسن کی یہ کیفیت کہ بصارت سے محروم ہیں۔ ساری دنیا سمٹ کر چار پاؤں میں آگئی ہے۔ لیکن محمد اقبال اتنے عزیز ہیں کہ ہر روز ایک آدمی اشیش جاتا روز نامہ انقلاب لے آتا۔ غرض یہ تھی کہ شاگرد کی صحت کا حال معلوم ہوتا رہے۔ افسر در گردا کا یہی دورہ تھا جس میں بغاٹیت اخطراب یہ شعر کہے گئے:

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

وہ مرا فرصت ہو حق دو سہ روزے دگرے  
کہ درین دیر کہن بندہ بیدار کجا است  
میر و مرزا بسیاست دل و دیں باختہ اند  
جز برہمن پرے محروم اسرار کجا است  
اندریں عصر کہ لا گفت من الا گفت  
ایں چنیں دیدہ رہ بین بہ شب تار کجا است  
حرف ناگفتہ مجال سخنے می خواہد  
ورنه ما را بہ جہاں تو سروکار کجا است

۱۹۳۸ء میں بیماری کی شدت بڑھ گئی تو بار بار کہتے۔ ”شاہ صاحب ٹھیک کہتے تھے اول  
با آخوندیتے دارد،<sup>۹۲</sup> فرمایا ان کا ارشاد تھا سعدی کو ان کے مرشد نے جو نصیحت کی اس پر ہمیشہ  
کاربند رہوں اور واقعی یہ ہے کہ محمد اقبال اس نصیحت پر ہمیشہ کاربند رہے۔<sup>۹۳</sup> انجمن اسلامیہ  
سیالکوٹ نے اسلامیہ ہائی اسکول کی نئی عمارت تعمیر کی توہاں کا نام میر حسن کے نام پر رکھا۔ رسم  
افتتاح حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم نے ادا کی۔ محمد اقبال کو انجمن کی حکام پرستی پسند نہ آئی۔  
ایک صحبت میں شکایت کی کہ انجمن نے میرے استاد کے نام سے ہال منسوب کیا۔ مناسب تھا  
میں اس کا افتتاح کرتا۔ لوگوں کو بتاتا میر حسن کیا تھے۔<sup>۹۴</sup>

۱۹۲۹ء کو جب میر حسن کا انتقال ہوا تو شہر ماتم کدہ بن گیا۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب  
نوحہ کنان تھے۔ محمد اقبال سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ ریل کا وقت گزر چکا تھا ایک مال گاڑی وزیر  
آباد جاری تھی اسی پر بیٹھ گئے۔ وزیر آباد سے سیالکوٹ پہنچے۔ میر حسن کے عزا اقربا، شاگرد اور  
عقیدت مند منتظر تھے کہ محمد اقبال کب آتے ہیں۔ محمد اقبال آئے با چشم نم آگے بڑھے، استاد  
کے چہرے کی آخری مرتبہ زیارت کی نہ معلوم اس وقت ان کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ جنازے  
کے ساتھ قبرستان کا رخ کیا۔ مولانا ابوالاہیم نے حسب وصیت نماز جنازہ پڑھائی۔ تدبیین کا وقت  
آیا تو ہندوؤں اور عیسائیوں نے اپنے اپنے طریق پر دعا کی۔ شیخ نور محمد نے کہا اب میرا وقت  
بھی قریب ہے۔<sup>۹۵</sup> محمد اقبال نے تاریخ کہی، وما ارسلناك الا رحمة اللعالمين۔

## ۷۔ شہر اقبال

میں ایک ایسے شہر میں پیدا ہوا جو اس وقت شہر بھی نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں سکھوں کی حکومت ختم ہوئے بیس چھپیں برس گزرے تھے۔ ۹۶ یعنی ۱۸۷۷ء کا سیالکوٹ شہر اقبال، جس کی قدامت مسلم ہے، تاریخی، جغرافی، علمی اور ثقافتی اہمیت مسلم، جو کبھی علم و فضل کا گھوارہ اور کاغذ سازی کے لیے کہ علم اور کاغذ میں چوپی دامن کا ساتھ ہے، مشہور تھا۔ لیکن اب کھلیوں کے سامان کا عالمی مرکز۔

سیالکوٹ دامن کوہ سے کوئی بیس چھپیں میل دور کوہستان ہمالہ کے جنوب مغربی سلسلے شوالک کی تہائی میں ایک پہاڑی ندی ایک کے کنارے دریائے راوی سے نسبتاً دور، لیکن چنان سے قریب ایک سریز اور شاداب میدان میں واقع ہے۔ روانیا اس کی بنیاد پانڈو خاندان کے راجہ سل نے رکھی۔ صدیاں گزر گئیں۔ ایک بہت بڑا سیالاب آیا۔ ہر طرف ویرانی چھاگئی۔ پھر سے آباد ہوا، تحقیقاً سکالا<sup>۹۷</sup> کے کھنڈروں پر۔ ویدک دور میں مدار اقبال کا دارالحکومت رہا۔ اسکندر یونانی کی یورش کے بعد جب چند ریگ پت سوریا نے (۱۸۲۴ق۔م) سلوک کو شکست دے کر شمالی ہندوستان میں موریا سلطنت قائم کی تو سکالا کو بڑا عروج ہوا۔ سکالا بڑا پر رونق شہر تھا۔ سچے ہوئے بازار، دولت کی افراط، ہاتھیوں کی آمدروفت۔ اشوک کا زمانہ آیا تو سکالا بده مت کا مرکز بن گیا۔ مشہور بده چینی سیاح ہیون تساک نے اس کی یاترائی۔ آگے چل کر باختی حکمرانوں کی جن کو دولت موریا کے زوال پر عروج ہوا، راجد ہانی بنا۔ مالنده (یونانی مینانڈر) اور یوئی دامون<sup>۹۸</sup> اسی خاندان کے حکمرانوں میں سے ہیں۔ سفید ہون قبائل شمال مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو ان کا ایک سردار مہراںگل یا مہراںکل سیالکوٹ میں جم کر بیٹھ گیا۔<sup>۹۹</sup> تا آنکہ ۳۶۰ء میں کبر ماجیت کے معاصر سالاہن نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ وہ قلعہ تعمیر کیا جو ایک مدور سے ٹیکی کی شکل میں اب بھی موجود سیالکوٹ کا بہترین نظر انداز ہے۔ موسم خوشنگوار ہو، فضا مصafa اور آپ ان دفاتر کے عقب سے ہوتے ہوئے جو قلعے کے بالائی کناروں کے ساتھ ساتھ تعمیر ہوئے، شمال مشرقی افق پر رنگاہ ڈالیں تو شمال میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں آپ کے سامنے ہوں گی۔ نیچے سیالکوٹ کے بازار اور گلیاں، سڑکیں اور بلندو پست مکان جو قلعے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ہر چہار طرف پھیل گئے ہیں۔ پھر قلعے سے کوئی ڈیڑھ دو میل دور شمال میں ایک کھلے میدان میں چھاؤنی۔ اس سے بہت قریب ریلوے اسٹیشن

جس سے ذرا آگے، مگر کچھ ہٹ کر کچھری اور ضلع کے دفاتر۔ سیالکوٹ بڑا پر رونق اور صاف سُتھرا شہر ہے۔ گردوبیش دل کشا۔ آب و ہوا گوار۔ زمین زرخیز۔ جدھر دیکھیے درختوں کے جھنڈا ورلہلہاتے ہوئے کھیت۔

سیالکوٹ کی قدامت مسلم ہے۔ تاریخی عظمت مسلم۔ موریا عہد میں سیالکوٹ کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت میں خاصا اضافہ ہوا۔ سیالکوٹ راجگان کشمیر کے زیر تسلط رہ چکا ہے۔ لیکن موریا سلطنت کے زوال اور باختری حکمرانوں کے بعد ہندو عہد میں سیالکوٹ نے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی۔ الایہ کہ سالہاں کے بیٹھے پورن اور راجہ رسالوکی کہانیاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ وہ کنوں بھی موجود ہے بلکہ اس نام کی ایک یستی بھی بس گئی ہے جس میں پورن کی سوتیلی ماں نے انتقاماً پورن کے بازو کٹوائے اور اس کنوئیں میں ڈلوادیے یا پھر ۷۹۰ء میں مغربی پنجاب کے راجہ نزوت کے ہاتھوں قلعے کی تباہی کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۵۵۶ء اسلامی عہد میں البتہ سیالکوٹ کی قدر و منزلت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ سیالکوٹ سے محمود غزنوی کا گزر ہوا۔ سیالکوٹ غزنویہ پنجاب کا عارضی دارالحکومت رہ چکا ہے۔ سیالکوٹ کے ویران قلعے کی شہاب الدین غوری کے حکم سے مرمت کی گئی۔ طبقات ناصری میں سیالکوٹ کا ذکر موجود ہے۔ تیمور نے جموں فتح کیا تو سیالکوٹ بھی آیا۔ دولت خان لودھی نے شاید سیالکوٹ ہی میں باہر سے ملاقات کی۔ اکبر کے عہد میں اسے سرکار کا درج حاصل تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کاغذ کی صنعت نے بالخصوص ترقی کی۔ سیالکوٹ کے جہانگیری کاغذ کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ شاہ جہاں کا زمانہ آیا تو سیالکوٹ کی علمی سرگرمیاں انہا کو پہنچ گئیں۔ سیالکوٹ ارباب علم کا مولود و منشا، مرجع و مسکن بنا۔ سیالکوٹ کا شمار اسلامی ہندوستان کی عظیم درس گاہوں میں ہونے لگا۔ تشنگان علم دور دور سے سیالکوٹ کا رخ کرتے۔ سیالکوٹ کا تعلق نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے جانشینوں تک دولت مغلیہ سے قائم رہا۔ اسکے گردی کے پاشوں ایام میں البتہ سیالکوٹ کا گزر ہے۔ ہی آلام و مصائب سے ہوا جیسے پنجاب کے دوسرے اضلاع واقطاع کا۔ سکھوں نے شہروٹا، آگ کا دی۔ کتب خانے جلا دیئے۔ ۱۸۳۹ء میں اسلاف کی یادگاریں مٹ گئیں۔ ۱۸۴۱ء میں بريطانی اقتدار اور پھر ۱۹۳۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جب امن و امان کی ایک صورت پیدا ہوئی تو سیالکوٹ کی شہری، یعنی اور تمدنی زندگی نے پھر ایک کروٹ لی۔ ۱۹۴۷ء میں باڈنڈری کمیشن ۱۰۳ کا نام منصفانہ فیصلہ اس کی ترقی کے راستے میں حائل ہو گیا۔

مگر ۱۸۷۷ء کا سیالکوٹ تو ”ایک چھوٹا سا قصہ تھا“۔ قلعے سے جنوب مشرقی سمت میں ایک پر شاہ دولہ کے تعمیر کردہ پل، امام صاحب اور منڈی تک ۵۰ ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ تھلک محلوں میں منقسم ایک محدود سے رقبہ میں پھیلا ہوا جس کے ارد گرد کی نواحی بستیاں، اجتماعی، مذہبی اور علمی زندگی میں بنت رہی تھی تغیر و نما ہو رہا تھا۔ سیالکوٹ ضلع کا صدر مقام بنا، سیالکوٹ میں چھاؤنی تعمیر ہوئی۔ بایس ہمہ اس کی آبادی بیس پیس ہزار نفوس سے زیادہ نہیں بڑھی، ۵۰ برطانوی اقتدار ایک نیا طرز حکومت، نئی تعلیم، نیا آئین و قانون، نیا طرز زندگی اور نئی نئی قدریں لے کر آیا۔ حکمرانوں کی قدر راتا خواہش تھی کہ مکالموں کا دل و دماغ بدل دیں۔ وہ سمجھتے تھے عالم انسانی کا مستقبل اب انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ مغربی تہذیب ہی انسانیت کی صورت گر ہے۔ وہی اس کا مقصود و منتها۔ پھر جب نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز ہوا۔ سیالکوٹ مسیحی مبشرین کا گڑھ بن گیا۔ ۱۸۷۸ء انھوں نے شفاخانے اور مرسرے کھولے تو زمانے نے ایک کروٹ لی۔ دنیابدی رہتی ہے۔ اور بدلتی تھی مگر اس تبدیلی نے سیالکوٹ کی زندگی میں قدیم و جدید کے تصادم کے ساتھ ساتھ نئے نئے خیالات اور نئے نئے رسم جمادات بالخصوص ایک شدید مذہبی اور اخلاقی نزاع و جدال کا دروازہ کھول دیا۔ مسلمان، ہندو، سکھ سب سوچ رہے تھے اپنا قومی شخص کیسے برقرار رکھیں۔ اپنے طرز زندگی اور اپنے معاشرے کی حفاظت اور تقویت کے لیے کیا تداہیر اختیار کریں۔ ماضی سے رشتہ منقطع کیے بغیر مستقبل کی تعمیر میں کس نئی پرقدم اٹھائیں۔ مسلمان سب سے زیادہ زخم خورده تھے۔ سب سے زیادہ زبوں حال۔ مسلمانوں کے لیے یوں بھی ایک نئی تہذیب کی یلغار موت و حیات کا مسئلہ تھا۔ محمد اقبال طالب علم ہی سبھی، اٹھتے بیٹھتے، گھر سے نکلتے، لوگوں سے ملتے، ان تبدیلیوں کو دیکھتے۔ اسکوں میں کالج میں بزرگوں کی صحبت میں گزرے ہوئے دنوں کی باتیں سنتے۔ زمانہ کیا تھا کیا ہوگا، کیسے بدلتا ہے۔ زمانہ بدلا تو اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بدلتے۔ ان کے طور طریق، وضع قحط، عادات و اخلاق بدل گئے۔ کسی بات کی تعریف کی جاتی کسی کی نہ مت۔ میر حسن کے یہاں اہل علم کی مغلوقوں کی بھنک محمد اقبال کے کانوں میں پہنچتی۔ سوچتے ہوں گے یہ کیا مسائل ہیں جن میں لوگوں کا ذہن اچھ گیا ہے۔ جن پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ ہندو، سکھ اور عیسائی تنظیمیں کیا ہیں ان کا مقصد کیا ہے۔ مسلمان بمقابلہ ان کے کس حال میں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ محمد اقبال بڑے ہونہار اور حساس طالب علم تھے۔ یوں ان کا ذہن بھی ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف منتقل ہو رہا

تھا۔ وہ بھی اپنے طور پر کچھ سوچتے ہوں گے۔ یہ حالات تھے جن میں خوش قسمتی سے مسلمانوں کو ایک راستہ مل گیا۔ وہ راستہ جس کی نشاندہی سرسید نے کی اور جس پر نصیرت، کفر اور الحاد کے طعنوں سے بے تعلق وہ ایک ثابت قدم اٹھا چکے تھے۔ لہذا جیسے جیسے محمد اقبال مدرج تعلیم میں آگے بڑھے، جیسے جیسے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ ان حالات کا اندازہ کیا جن سے مسلمانوں کا گزر ہو رہا تھا وہ بھی اس راستے پر مضبوطی سے جنم گئے۔ سرسید کی طرح ان کی سیاست کا بھی ایک ہی محور تھا اور وہ اسلامی قومیت، مسلمانوں کے بھیثیت ایک قوم وجود میں کا تحفظ۔ لہذا شاعری ہو، فلسفہ یا سیاست ان کے ذہن میں اس کے کوئی دوسرا خیال ہی نہیں تھا۔ نہ بھی اس راستے جو اختیار کر چکے تھے اخراج کا سوال پیدا ہوا جیسے جیسے ہندوستان کی سیاست ایک مرحلے سے دوسرے میں داخل ہوئی۔ انھوں نے اس راستے کی حمایت میں کوئی دیقہ اٹھانے رکھا بلکہ اصولاً اور عملًا ہر پہلو اور ہر وجہت سے واضح اور روشن کرتے رہے۔

سیالکوٹ ایک اسلامی شہر ہے اور تھا۔ سیالکوٹ سے خواجہ معین الدین چشتی کا گزر ہوا۔ سیالکوٹ میں خواجہ فرید الدین شکرِ فتح کے صاحبزادے بدر الدین تشریف لائے سیالکوٹ کو امام علی لاحق نے اپنا مستقر بنایا۔ سیالکوٹ کا رشتہ کشمیر سے نہایت پرانا ہے۔ اسلامی عہد میں یہ رشتہ مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ علمی اور تہذیبی روابط قائم ہوئے تو سیالکوٹ میں علم و عرفان کی اس روایت نے جس کی ابتداء امیر کبیر سید علی ہمدانی سے ہوئی اسلامی ہند کی علمی اور مذہبی روایات سے مل کر ایک نہیں دو مرتبہ مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ ایک مرتبہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی ہمہ گیر دعوت کے سہارے جن کے ہاتھوں اکبری الحاد کی بخش کرنی ہوئی۔ دوسری مرتبہ خطبہ اللہ آباد کی بدولت جب اس صدی کے تیسراۓ عشرے میں برصغیر کی سیاست نے کچھ ویسا ہی رنگ اختیار کر لیا تھا گو ایک دوسری شکل میں، جیسے اکبر کے عہد میں اور جس سے مقصود ہبھر حال یہی تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اور ملیٰ شخص کی نئی ہو جائے۔ سیالکوٹ کو اس رہنمائی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ سیالکوٹ ارباب شریعت و طریقت کا مرکز اور مسکن رہا ہے۔ ان میں سرفہرست ملامکمال کشمیری کی ذات گرامی ہے۔ جن سے حضرت مجدد نے کسب فیض کیا جوانے بھائی ملا جلال کے ساتھ سیالکوٹ آئے اور ملا فتح اللہ حقانی کی شاگردی اختیار کی۔ ملا عبد الحکیم جن کو دنیاۓ عرب ”سیل کوئی“ کے نام سے جانتی ہے۔ ملامکمال ہی کے شاگرد تھے۔ شاہ جہان کے وزیر الوزراء نواب سعد اللہ خان چنیوٹی نے ملا عبد الحکیم سے بھی کسب فیض کیا۔ اس سلسلے میں میر اسماعیل بلکر ای کا نام بھی بالخصوص قبل

ذکر ہے جو حصول تعلیم کے لیے سیالکوٹ آئے۔ سیالکوٹ میں علوم و عرفان کی یہ روایت دولت مغلیہ کے انحطاط تک برابر قائم رہی۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی میں بھی ملا افضل سیالکوٹی نے دہلی میں مظہر جان جانا اور شاہ ولی اللہ کو حدیث اور تصوف کا درس دیا۔ سیالکوٹ میں تہذیب و تمدن کو فروغ ہوا تو شعروادب کی دنیا میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ میر محمد علی راجح اور ان کے شاگرد سیالکوٹی مل وارستہ نے فارسی زبان میں شاعری کی۔ پھر جب سکھ گردی کے پرآشوب ایام میں سیالکوٹ کی تباہی کے ساتھ ساتھ برطانوی اقتدار کے ہاتھوں مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا تو علم و ادب کی مخلیقین سونی پڑ گئیں۔ سیالکوٹ ویران ہو گیا یہ لیکن اس کے باوجود سیالکوٹ اور سیالکوٹ کی نواحی بستیوں میں تعلیم و تعلم کا رشتہ کسی نہ کسی مسجد، کسی نہ کسی خانقاہ، کسی نہ کسی شخصیت سے قائم رہا۔ یہ کویا اپنی اپنی جگہ پر چھوٹی چھوٹی درسگاہیں تھیں۔ اسلاف کے بچے کچھ ورثے کی محافظت جن کا طالب علم رخ کرتے۔ محمد اقبال نے ہوش سنجلات سیالکوٹ کا ماضی اور سیالکوٹ کا آثار و باقیات ایک تصویری مرقع کی طرح ان کے سامنے تھا۔ محمد اقبال گھر سے نکلنے اسکوں جاتے تو پاس ہی مسجد دو دروازہ سے گزر رہتا۔ جسے بدر موہن نے تعمیر کیا۔ بدر موہن عہد عالمگیری میں اودھ سے دہلی آیا۔ صداقت کی تلاش تھی۔ مذہبی بحثوں میں بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ رحمت اللہ نام ہوا اور عالمگیر نے اسے سیالکوٹ میں ایک عہدہ عطا کر دیا۔ مسجد دو دروازہ کی حیثیت اس وقت بھی ایک چھوٹی سی درس گاہ کی تھی۔ مسجد میر حسام الدین ۱۸۷۶ء میں تعمیر ہوئی۔ میر حسن یہاں بھی درس دیا کرتے تھے۔ اس مسجد کا وہ کرہ جہاں محمد اقبال نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کیا اب بھی موجود ہے۔ یہ مسجد کشمیری محلے میں محمد اقبال کے آبائی گھر کے قریب ہی واقع ہے۔ پھر کشمیری محلے ہی کے اندر وہ عظیم مسجد تعمیر ہوئی جہاں غالباً ملکمال درس دیتے تھے اور جس کا نام اس زمانہ سے کبوتروں والی مسجد چلا آتا ہے۔ اس کی چھتوں اور گنبدوں پر اب بھی کبوتروں کا جھوم رہتا ہے۔ محمد اقبال کا اس مسجد سے گزر رہتا اور اس سے امام صاحب کا رخ کرتے تو بہلوں دانا کا مزار راستے میں پڑتا۔ امام صاحب کا مزار ایک بلند و بالائی پر استادہ اس روایت کی یاد تازہ کرتا ہے کہ امام علی الاحق کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ امام صاحب کی عمارت بڑی پروقار ہے۔ خوشنماں نکنین گنبد، نکنین مگر نگنین دیواریں، جھرے، صحن اور مسجد جن میں امام صاحب کے رفقاء بھی جنمون نے ان کے ساتھ جام شہادت نوش کیا محفوظ ہیں۔ امام صاحب کے مزار نے اہل سیالکوٹ کے لیے ”بست“، یعنی پناہ گاہ کا کام بھی دیا ہے۔

یہاں بحالت پریشانی لوگ اکثر گوشہ گزیں ہو جاتے۔ امام صاحب سے شماں سمت میں تھوڑی دور ”ایک“ ندی بہہ رہی ہے جس کا پانی کاغذ سازی کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔ سیالکوٹ کاغذ سازی کا مرکز بن گیا۔ سیالکوٹ کاغذ کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ یہ کاغذ بیسویں صدی کے آغاز تک بھی استعمال ہوتا رہا۔ برسات کے دنوں میں سیالب آتا ہے تو اس کا پانی آس پاس کے گلی کو چوں میں درآتا ہے۔ ”ایک“ کے کنارے بالخصوص پل پر میلہ سالگ جاتا ہے۔ تیراں جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے کمال فن کی خوبیاں اور جوہر دھاتا ہے۔ محمد اقبال بھی اس میلے کا لطف اٹھاتے ہوں گے۔ شاہ دولہ عہد مغلیہ کے امراء میں سے تھے۔ تصوف اور علم و فضل میں دست گاہ کے ساتھ ساتھ مہندسی میں بھی ماہر۔ محمد اقبال ان کا ذکر سنتے ہوں گے۔ قاعدہ ہے کہ انسان جس شہر میں پیدا ہوتا ہے بڑے بوڑھے اس کے آثار اور باقیات کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ بچے بزرگوں سے اس کی روایات اور حالات سنتے ہیں۔ محمد اقبال بھی بزرگوں سے سیالکوٹ کا گذشتہ حال سنتے۔ شاہ دولہ کے ساتھ عہد مغلیہ کے نامور مہندس علی مروان خاں کا ذکر بھی آتا ہوگا۔ محمد اقبال پوچھتے ہوں گے وہ فضیل کیا ہوئی جو علی مروان خاں نے سیالکوٹ کے ار دگرد تعمیر کی تھی۔ سیالکوٹ اس زمانے میں کیسا پر واقع شہر ہوگا۔ لیکن آج ملا عبد الحکیم سیالکوٹ کا مزار، ان کی بنا کردہ مسجد، مدرسہ اور تالاب ویران پڑے ہیں۔ ملا عبد الحکیم کی عالمگیر شہرت کا سن کر شاہ جہاں نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دفیقتہ اٹھانہیں رکھا۔ محمد اقبال فوق کو لکھتے ہیں：“سیالکوٹ فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشکافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکماء کو محوجت کیا کرتی تھیں۔ ان کی فلسفیانہ تصانیف میں سیل کوتی علی التصورات مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر سے شائع ہوا۔ توحید باری تعالیٰ نے بھی ایک رسالہ ہے جو انہوں نے شاہ جہاں کی فرمائش پر لکھا۔ میری نظر سے گزر آئے۔ سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب ہی اب ان کی یادگار ہیں۔ مزار جو تالاب کے قریب واقع ہے۔ نہایت کس پھری کی حالت میں اہل سیالکوٹ کی بے حصی اور سرد مہری کا گلہ گزار ہے۔”<sup>۱۸</sup> محمد اقبال سیر کرتے۔ دوستوں کے ساتھ پھرتے پھراتے ادھر بھی جائکتے ہوں گئے۔ چھاؤنی اور اس کے مضائقات بلکہ پورن کے کنوئیں سے ہوتے ان کا گذر بابے کے پیر جہاں گروناں کا قیام رہتا اور اس کے پاس ہی سید حمزہ غوث کے مزار سے بھی ہوتا ہوگا۔ رہا قلعہ، سو قلعہ تو اہل سیالکوٹ کی سیر گاہ تھا۔ محمد اقبال قلعہ کی سیر کرتے، گرد و پیش کے مناظر کا لطف اٹھاتے۔ تیجا سلگھ کے شوالے کا کلس دیکھتے تو سکھ گردی کی

یاد تازہ ہو جاتی۔ چھاؤنی میں نو تعمیر گر جے کا افون میں نکتا ہوا ملک سلطنت برطانیہ کی شان و شوکت، جہانگیری اور کشور کشائی کے ساتھ ارض پاک و ہند میں ایک نئی حکومت، ایک نئے مذہب اور ایک نئی تہذیب و تمدن کی برتری کا اعلان کرتا۔ محمد اقبال اسے دیکھتے اور غیر اغلب نہیں کہ ان کے دل میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خونین کی یاد تازہ ہو جاتی جس میں سیالکوٹ نے بھی حصہ لیا اور حرمت خان نے بہ کمال دلیری بدی کی حکمرانوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ حرمت خان کا مزار شاید سیالکوٹ ہی میں واقع ہے۔<sup>۰۹</sup> سیالکوٹ میں قدم قدم پر بزرگوں کے مزار، مساجد اور معابد بھیلے ہوئے ہیں۔ سیالکوٹ میں ماضی کے اثرات ابھی تک دلوں میں جاگزیں تھے دور مغلیہ کی یاد، شاہی زمانہ، مسلمانوں کی شان و شوکت، پرانی عمارتوں کے بچے بچے نشانات، سکھ گردی اور پھر برطانوی حکومت کے ہاتھوں بتاہی۔ سیالکوٹ کی فضا میں تاریخ بھی تھی، سیاست اور سیاسی انقلابات، مذہب اور تصوف قومی اور علمی کشاکش بھی، اخلاق و معاشرت بھی، وضع قطع، زندگی کے طور طریق، غرضیکہ تہذیب و تمدن کا بدلتا ہوارنگ۔ یہ سب محمد اقبال کے ذہن میں طرح طرح سے کام کر رہے تھے۔ وہ بھی جن کا تعلق میر حسن کے درس سے تھا کہ باوجود اختلاف عقائد، سیاسی اور مذہبی نزعات کے ہندو، سکھ، عیسائی سب ان کی خدمت میں بیٹھتے۔ میر حسن کے علم و فضل، ان کی گفتگوؤں، صحبوؤں اور روابط کی سطح کیسی بلند تھی۔ محمد اقبال نے میر حسن کی انھیں صحبوؤں میں انسان دوستی، رواداری، طبعی بلندی اور مشربے نابے کا سبق سیکھا۔ پھر ان کے گھر کی فضا کہ والد ماجد کو دیکھتے، ان کے ہاں اہل دل جمع ہیں۔ محمد اقبال نے اگرچہ صرف اتنا کہا ہے کہ اس حلقے میں کتب تصوف کا مطالعہ ہوتا لیکن یہ نہیں بتایا یہ حلقہ کن بزرگوں پر مشتمل تھا۔ اتنا معلوم ہے کہ ان میں ایک سید چراغ شاہ بھی تھے۔ گمراہ سے ترک وطن کر کے انھیں کے قریب محلہ کشمیر یاں میں آباد ہوئے۔ مولوی غلام مرتضی کے جن کی میر حسن نے بڑی تعریف کی ہے، شاگرد تھے۔ یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مساجد کی اگرچہ وہ شان نہیں رہی تھی جو شاہی زمانے میں تھی، لیکن اب بھی ان کی حیثیت درس گاہوں کی تھی۔ میر حسن زیادہ تر مسجد حسام الدین میں درس دیتے۔ مولوی غلام مرتضی مسجد کبوتروں والی میں۔ مولانا غلام حسین بھی ایک مسجد میں درس دیتے، علی ہذا مولوی مزل بھی۔ مسجد دودروازہ میں بھی سلسہ درس جاری تھا۔

لیکن ماضی کا سیالکوٹ، ماضی کی روایات اور ماضی کے آثار و باقیات سے محمد اقبال کا

ذہن جہاں بتدریج ایام سلف کی طرف منتقل ہو رہا تھا، جس سے وہ دن دور نہیں تھا کہ ان کا دل تڑپ اٹھے۔ جس کی یاد ہماری خاک کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اللہ اس لیے کہ یہی وہ ماضی ہے جس میں محمد اقبال کو مستقبل کی جھلک نظر آتی، وہاں یہ خیال بھی اُن کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا کہ حال ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے۔ میر حسن کے سلسلہ درس و تدریس میں ان کا شعور جس طرح بیدار ہوا۔ ان کے یہاں اہل علم کی گفتگوؤں کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی صحبت میں ہندوؤں اور سکھوں کی قومی تنظیموں بالخصوص میسیحی مبشرین کی سرگرمیوں کو دیکھ دیکھ کر جن کے قدم سیالکوٹ اور اس کے گرد نواح میں مضبوطی سے جم گئے تھے۔ محمد اقبال کے ذہن میں بھی وہ مسائل اُبھر رہے تھے جن میں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ آگے چل کر الجھنے والے تھے۔ سیالکوٹ میں آریہ سماج کا زور تھا۔ منگھ سبھا سنان دھرم سبھا اور برہمو سماج بھی اپنے طور پر کام کر رہی تھیں۔ محمد اقبال یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ محمد اقبال کا ڈھنی ارتقا جاری تھا۔ اس تصادم اور ارتقابل کا احساس پیدا ہو رہا تھا جو مشرق اور مغرب بلکہ یوں کہنا چاہیے اسلام اور یورپ کے درمیان رونما ہوا اور جس کا شہر کی بدلتی ہوئی زندگی اسکول اور کالج میں وہ ہر روز مشاہد کرتے۔ کس قدر مختلف تھی اسکول اور کالج کی فضا، اس کا نصاب تعلیم، قواعد و ضوابط، اساتذہ کی وضع قطع قدیم درس گاہوں سے، کیسے کیسے اثرات تھے جو اس طرح بڑے بوڑھوں، بچوں اور نوجوانوں پر مرتب ہو رہے تھے۔ معاشرے میں ایک اختلال اور اضطراب رونما تھا۔ سوال یہ تھا اور یہ سوال ہر شخص کی زبان پر کہ یہ جو ہم سر کار انگریزی کے ہاتھوں بے لب ہو کر رہ گئے ہیں کیا کریں؟ مخصوصی پر راضی ہو جائیں۔ حاضر سے سمجھوئے کر لیں۔ قدیم و جدید میں کوئی پیوند لگائیں، یا اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ اپنا طرز زندگی نہ چھوڑیں۔ لیکن عقائد کیسے بھی مضبوط ہوں۔ ایمان و یقین کیسا بھی محاکم، سیرت و کردار میں کیسی بھی پختگی مسلک و مشرب کیسا بھی خالص، یوں قوم کا مسئلہ تحل نہیں ہوتا۔ نہ اس کی زندگی، نہ اس کے حفظ و استحکام کا، افراد کا مسئلہ البتہ حل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ایک حد تک گوا آخراً امران کا رشتہ جماعت سے کٹ جاتا ہے۔ قوم کا وجود ملی تو درکنار ان کی اپنی ہستی میں کوئی معنی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ سیاست کی گرفت زندگی پر نہایت کڑی ہوتی ہے۔ بلکہ فیصلہ کن سیاست ہی ہمارے نیک و بد کی صورت گر ہے۔ فرداور جماعت کا ربط با ہم ان کی ملی اور قومی ہستی ان کی سیاسی جدوجہد ہی پر مختص ہے۔ ہم ان کی خوبیوں کا اندازہ افراد ہوں یا جماعت اس جدو جہد کی رعایت ہی سے کر سکتے ہیں اور اس

جدو جہد کی نوعیت لازماً سیاسی ہوگی۔ خوش قسمتی سے سر سید نے اس جدو جہد کی ابتداء کر دی۔ اسلامی ہند میں ہر کہیں تحریک علی گڑھ کا چرچا ہورہا تھا، تا آنکہ یہ تحریک مسلمانوں کی قومی تحریک بن گئی۔ میر حسن اس تحریک کے زبردست مؤید تھے۔ ۱۸۷۶ء میں سر سید سے ان کی ملاقات ہوئی، مراسم بڑھتے گئے، خط و کتابت ہوتی۔ میر حسن بالاترزاں ہر سال علی گڑھ جاتے، سر سید لا ہو ر آتے تو ان کی پیشواں کے لیے لا ہو ر پہنچتے۔ سر سید کی سیاسی بصیرت اپنی جگہ پر مسلم ہے، اس سے انکار کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان کوئی جدا گانہ قومی وجود نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اور سیاست کو باہم کوئی تعلق نہیں۔ رہی ان کی تعلیمی تحریک تو سر سید کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ ایسے نوجوان پیدا کرے جو اسلام کی صداقت اور حقانیت میں یقین رکھتے ہوئے اس جدو جہد میں حصہ لیں جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش ہے۔ ان کے قوائے علم و عمل بیدار ہوں۔ تعلیم کی ضرورت سے اصولاً تو کچھ اختلاف ممکن تھا لیکن انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سر سید کی نگاہیں مستقبل پر تھیں۔ ان کی آرزو تھی نوجوان مستقبل کا رشتہ اپنے ہاتھ میں لیں۔ میر حسن اس نکتے کو سمجھ گئے، انھوں نے محمد اقبال کی ذات میں مستقبل کے انسان کی جملک دیکھی۔ مستقبل کا انسان پیدا کر دیا۔ کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہے کہ محمد اقبال کا دل و دماغ اس سانچے میں ڈھل جائے جو ملی ذہن کا صورت گر ہے۔ لہذا جیسے جیسے محمد اقبال مدرج تعلیم میں آگے بڑھے۔ جیسے جیسے زندگی میں قدم رکھا، یہ دیکھا قوم کا گزر کرنے والے میں ہو رہا ہے۔ تحریک علی گڑھ کی حقیقی روح کو سمجھ گئے۔ اسے دل سے لبیک کہا۔ کہتے افسوس ہے مسلمانوں کو سر سید ایسا رہنمائی ملا۔ اللہ انھیں سر سید کے ایمان و یقین، سر سید کی اسلام سے محبت، اسلامی تہذیب سے شیفتگی، سر سید کی بصیرت اور قیادت کا دل سے اعتزاف تھا۔ سر سید حقیقی رہنمائی۔ ان کی ذات بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ دل سے مسلمانوں کی نشۃ الثانیہ کے آرزومند تھے۔ اس آرزو میں انھوں نے مسلمانوں کو ہر پہلو سے چھیڑا۔ انھیں ہر طرح جھنجورا۔ یوں ایک عظیم علمی، اخلاقی اور دینی، سیاسی نزاع و جدال کی صورت پیدا ہو گئی۔ جس میں بعض حلقوں کو بجا طور پر ان سے اختلاف تھا، بلکہ اختلاف جو انھوں نے چاہیے تھا۔ سر سید کے بہت سے اجتہادات غلط تھے۔ لیکن اس راستے سے اختلاف جو انھوں نے قوم کی سیاسی اجتماعی، سنتی کے استحکام اور تحفظ کے لیے تجویز کیا، جس سے مقصود تھا مسلمانوں کی ذہنی بیداری، ان کے سیاسی ملی شعور کا احیا اس راستے سے اختلاف سرتاوا جب اور ارض

پاک و ہند میں مسلمانوں کو ایک غیر حکومت اور علمی سیاست کی طرف سے جو خطرات درپیش تھے ان سے انماض یانا واقفیت پر مبنی۔ ہمیں اس اختلاف کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔<sup>۱۳</sup> ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا تو محمد اقبال نے میر حسن کے ایما سے تاریخ کہی۔ سرسید کے ایمان و یقین، سرسید کے شعور ملی اور جذبہ خدمت کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ کس طرح معتبرین کے طبع و تشنیع کا نشانہ بنے، حتیٰ کہ انھیں کافرا اور ملعون کیا کچھ نہیں گیا محمد اقبال نے قرآن مجید سے رجوع کیا اور آیہ شریفہ انی متوفیک و رافعک الی مطہرہ کے تاریخ نکالی۔ تاریخ میر حسن نے بھی کہی مختصر اور دعا یہ، غفرلہ یہی تاریخ سرسید کی لوح تربت پر ثبت ہے۔<sup>۱۴</sup> شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ بعض لوگوں کو جب محمد اقبال کی نکالی ہوئی تاریخ پر اعتراض ہوا تو انہوں نے ایک دوسرا کانہ مسیح لکل امر ارض<sup>۱۵</sup> مفہوم ایک ہے الفاظ مختلف۔ آگے چل کر محمد اقبال نے تصور ہی تصور میں سرسید کی تربت پر اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور حاضری دیتے۔ سرسید کی زندگی اور قوم کے نام ان کے پیغام کی ترجمانی بڑے دلنشیں الفاظ میں کی۔<sup>۱۶</sup>

## ۸۔ نوجوان اقبال

محمد اقبال کشمیری نژاد، کشمیری ذہانت و طباعی، کشمیری احساس حسن اور ذوقِ جمال کے فطری ملاکت کو لیے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو زمانے کی ختنیوں، عمرت و تنگ دستی کے باوجود دولت ایمان و یقین اور فہم و دلنش سے بہرہ و رخا۔ گورے چٹے، ماں باپ کے لاڈے، جب عالم شیر خوارگی کے اس شور و شغب نے جو کان رہے تھے۔ اس نور اور چمک، سایوں اور تاریکیوں نے جو آنکھیں دیکھ رہی تھیں رفتہ رفتہ کائنات کی شکل اختیار کی۔<sup>۱۷</sup> جب ماں کی آنکھوں ہی ان کی ساری دنیا اور زمین و آسمان ایک دیار نہ معلوم ہوتے۔ جب آنکھ وقف دیدار تھی، لب مائل گفتار۔<sup>۱۸</sup> جب ذرا ہوش سننجلالا۔ بچپن میں قدم رکھا۔ مسجد میں بیٹھے قرآن مجید کے ساتھ نوشت و خواند کی ابتداء ہوئی۔ ماں باپ نے احکام شریعت کی پابندی سکھائی۔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی بلا نامہ تلاوت کرنے لگے۔ صبح سوریے اٹھتے، سحر خیزی معمول ہن گئی۔<sup>۱۹</sup> تعلیم و تربیت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ آداب و اخلاق سنورتے چلے گئے۔ سیرت و کردار کی پرورش ہونے لگی۔ احساس ذات میں شخصیت کا رنگ پیدا ہو رہا تھا۔

ذوقِ علم اور ذوقِ شعر خداداد تھا۔ طبیعت فلسفہ پسند، دل و دماغ بیدار زندگی طرح طرح سے انھیں چھیڑ رہی تھی، خیالات تھے، تصورات، جذبات اور احساسات۔ ضرورت تھی ایک رہنمای ہاتھ کی۔ علم و حکمت کی طلب، شعرو ادب میں انہاک اور غور و فکر کی جوانیوں کے ساتھ ساتھ ذرا دل کی۔ بقول عطار:

کفر کافر را و دین دین دار را  
ذرہ درد دلے عطار را

کچھ خاندانی روایت، کچھ باپ کی درویش مشی، محمد اقبال کو بد و شعور ہی میں ذرا درد دل کی دولت مل گئی۔ میر حسن کی توجہ اور نظر اس پر مستزد بچپن ہی میں قرآن مجید بڑے ادب و احترام اور دل سوزی سے پڑھتے۔ جمیل علی راٹھور کہتے ہیں ایک روز مسجد میر حسام الدین میں بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ میر حسن آگئے، استاد کو دیکھ کر رکنا چاہا۔ میر حسن نے اشارے سے کہا تلاوت جاری رکھو۔ آواز میں سوز تھا۔ تلاوت ختم کی تو میر حسن کے کہنے پر بڑی خوشحالی سے اذان دی۔ پھر ہم سب نے باجماعت عصر کی نماز ادا کی<sup>۱۹</sup>۔ لٹکپن کا زمانہ کھیل کو دکا زمانہ ہے۔ محمد اقبال ذہین تھے ان کی ذہانت کا انہمار بڑی مخصوصانہ شرارتؤں میں ہوتا۔ ایک روز تختی کھتھے غلط کو غلت لکھ دیا۔ استاد نے کہا غلط کو صحیح کر دو۔ کہنے لگے غلط تو غلط ہی رہے گا، میں اسے صحیح کر دوں کیسے؟ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کو دیں وقت گزرتا۔ سن و سال میں آگے بڑھے تو لال دین پہلوان کے یہاں اکھاڑہ کرنے لگے۔ ڈنٹر پیٹتے۔ لال دین سے دوستی ہو گئی اور اس دوستی کا محمد اقبال نے ہمیشہ پاس رکھا۔ سیالکوٹ جاتے لال دین سے بے تکلف ملتے۔ لال دین کہتے ہماری سمجھ میں ان کی باتیں تو بہت کم آتیں لیکن وہ ہماری دوستی کا بڑا خیال رکھتے، ایسا بھی نہ ہوا کہ کوئی بڑا آدمی ان سے ملنے آئے اور وہ ہمیں نظر انداز کر دیں۔ لاہور آئے تو یہاں اکھاڑہ تو کیا ہوتا البتہ ملدر ہلاتے، ڈنٹر بھی سیٹتے۔ چنانچہ علی بخش ان کے یہاں ملازم ہوا تو ان کے یہاں ملازم ہوا تو ان کے کسرتی بدن کو دیکھ کر جیران رہ گیا۔ علی بخش سے کہتے، علی بخش نوجوانوں کو چاہیے کسرت کریں۔ یوں لاہور میں بھی کبھار کوچ ہنومان میں جہاں اس زمانے میں ان کے دوست سید غلام بھیک نیرنگ کا قیام تھا دوران ملاقات میں اکھاڑے کا شوق تازہ ہو جاتا۔ اکھاڑہ تو ریاضت بدنبی کا ذریعہ تھا۔ تفریح طبع کے لیے کبوتر اڑاتے۔ سیالکوٹ میں ان دونوں کبوتر بازی کا رواج عام تھا۔ لوگوں نے گھر گھر کبوتر پال رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کبوتر اڑاتے

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

ہیں تو ان کے پروں سے جو ہوا نکلتی ہے بچوں کے لیے خاص طور سے مفید ہے۔ یہ ایک مخصوصانہ مشغله تھا جس سے میر حسن نے روکا، نہ شیخ نور محمد نے۔ شاید اس لیے کہ انھیں خواب میں جو اشارہ نیبی ہوا تھا کبوتر کی شکل میں۔ میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی جو محمد اقبال کے ہم جماعت بھی تھے کبوتر بازی میں ان کے دست راست تھے۔ ابتداء کبوتر بازی کی بقول سید محمد تقی یوں ہوئی کہ اول اول ہم شوالہ تجسسگھ کے پاس کھلے میدان میں شام کے قریب کبوتر بازی کے ماہروں کو کبوتر اڑاتے دیکھتے۔ کبوتر فضائے نیلوں میں طرح طرح سے اور بل کھا کھا کر اڑاتے تو محمد اقبال کی نگاہوں میں چک پیدا ہو جاتی۔ ایک شام گھر آئے کہنے لگے، مجھے کبوتروں سے عشق ہو گیا ہے لیکن کبوتر پالے تو رکھیں گے کہاں؟ سید محمد تقی کہیں سے کبوتروں کے چار جوڑے لے آئے۔ گھر کی چھپت پر کاؤک تیار کیے۔ یوں سید محمد تقی کے یہاں بالفاظ دیگر میر حسن کے گھر سے کبوتر بازی کی ابتداء ہوئی۔ محمد اقبال نے شعر کیا:

جی میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے  
کوئی کالا، کوئی اپسید ہے، دو میالے

رفتہ رفتہ گھر میں بھی کاؤک اور چھتری بن گئی۔ کبوتر پلنے لگے۔ ایک روز میر حسن نے کوئی سوال پوچھا، محمد اقبال کی نگاہیں آسمان میں کبوتروں کی پرواز پر تھیں، جواب نہ دیا۔ میر حسن نے کہا علم کتابوں میں تلاش کرو کبوتروں کی پرواز سے علمی جدوجہد ہی کو تحریر ہو سکتی ہے۔ ۱۵ یہ تھی میر حسن کی خوبی تربیت کہ کبوتروں سے لگاؤ اور کبوتر بازی میں بھی تنفر کے طبع کے ساتھ ساتھ ایک عملی تجسس پیدا کر دیا۔

محمد اقبال کہتے میں جب کبوتروں کو پہنائے فضائیں پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں جیسے میں بھی ان کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں اڑا رہا ہوں۔ افلک کی سیر ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کبوتروں کی اڑان اور آسمان پروازی محمد اقبال کی شاعرانہ اور فلسفہ پسند طبیعت کو بڑی مرغوب تھی۔ لقا کبوتر سے انھیں دلی لگا تھا۔ کہتے اس کبوتر کا سینہ تان کر ایک شان تمکنت اور طمثاق سے چلنا مجھے بہت پسند ہے۔ رفتہ رفتہ کبوتروں سے انھیں ایک جیاتیات وال کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ ان کی عادات اور خصائص، طاقت پرواز اور مختلف انواع کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے۔ کہتے ان کی اصل تو ایک ہے لیکن یہ گھر یلو کبوتر جنگلی کبوتروں سے کہیں الگ ہوئے، اس حد تک الگ کہ ان کی عادات و خصائص کو جنگلی کبوتروں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ یوں کوئی

کبوتروں سے ان کا ذہن وحش و طیور کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ ان کی عادات اور خصائص کا مطالعہ کرنے لگے۔ تا آنکہ یوں انھوں نے ایک ایسا نظام علامات وضع کر لیا جوان کے خیالات اور تصورات کے ابلاغ کا نہایت موثر ذریعہ ثابت ہوا۔ ان کے بیہاء کبوتر ایک علامت ہے، شاہین ایک علامت، کنجشک فرمادیہ بھی علامت۔ حتیٰ کہ مولانا عبدالسلام نیازی نے جوان کے علم و فضل کے قائل اور باوجود وحدۃ الوجود پر شدید اصرار کے اسرار خودی کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ جب ان سے خودی کے بارے میں سوال کیا کہ خودی ہے کیا تو انھوں نے لکھا ”میرے پاس کبوتروں کا ایک نہایت عمدہ جوڑا ہے۔ ارشاد ہوتا نذر خدمت کر دوں“ ۱۲۱ مولانا جن کو خوب بھی کبوتروں سے بڑا شغف تھا ان کا اشارہ سمجھ گئے۔ کہنے لگے ہم نے جان لیا خودی کی حقیقت کیا ہے۔ کیوں صاحب یہ جوڑا جواب اقبال میری نذر کرنا چاہتے تھے کیا اس کی اپنی ایک خودی نہیں تھی۔ مولانا نے خود ہی مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ گو بسبب ان کے ادب اور رعب و ادب کے میں نے ان سے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ یوں خودی کا جو تصور آپ کے ذہن میں پیدا ہوا اس سے ہم کیا سمجھیں؟ کیا اس طرح خودی کی حقیقت واضح ہو گئی: محمد اقبال نے کبوتروں کے جس جوڑے کی طرف اشارہ کیا اس کی کیتائی مسلم۔ آپ نے اس کیتائی کو خود سے تعبیر کیا۔ لیکن سوال خودی کی کیتائی کا نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ خودی فریب ہے یا حقیقت۔ مدینہ منورہ سے ایک کبوتر آیا۔ محمد اقبال نے اسے بڑی عقیدت سے پالا۔ اتفاقاً یہ کبوتر ملی کی نذر ہو گیا۔ ظفر علی خاں نے مرثیہ لکھا:

رحمت ہو تیری جان پاے مرغ نامہ بر  
آیا تھا اُڑ کے ذرۂ بام حرم سے تو  
تجھ پر ابوہریرہ بھی قربان ہیں کہ تھا  
وابستگانِ دامنِ فخرِ الامم سے تو  
شاید انھی کی راہ میں تو ہو گیا شار  
گر نج سکا نہ گربہ کی مشقِ ستم سے تو ۱۲۲

کبوتروں سے محمد اقبال کے شعف کا یہ عالم تھا کہ سیالکوٹ سے لاہور آئے تو کبوتر ساتھ لائے۔ یورپ سے واپس لوٹے، انارکلی میں اقامت اختیار کی تو کبوتر بھی آگئے، میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہوئے تو کبوتروں کے لیے عمدہ کا وک تیار کیے گئے۔ کبوتروں کو ۱۹۲۳ء میں

خیر باد کہی۔ جاوید کی پیدائش سے کچھ پہلے اور وہ بھی شايد باول ناخواستہ۔ کبوتروں کے بارے میں نیاز الدین خاں سے خط و کتابت ہوتی۔ نیاز الدین کے بھی گرامی مرحوم سے بڑے گھرے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے سے خطوں میں ان کا ذکر ہوتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: کبوتروں کے ایک جوڑے نے بڑی مشکل سے کچھ بچے پالے ہیں۔ ایک دوسرے خط میں شکایت کی ہے کہ ان پر مغربی تہذیب کا اثر ہو گیا ہے۔ بچوں کا خیال نہیں کرتے۔ ۱۳۳ بات یہ ہے کہ ان کے لیے بعض کبوتروں کی نسل نیاز الدین خاں کے بڑے صاحبزادے نوہبار الدین خاں مرحوم نے تیار کی تھی۔ ۱۳۴ پھر جس طرح کبوتر بازی میں سید محمد تقیٰ ان کے دوست راست تھے۔ شعرو شاعری میں سید محمد تقیٰ کے قریبی عزیز سید بشیر حیدر آن کے ندیم و علیم ان کے ساتھ شعرو شاعری کی محفلیں گرم ہوتیں۔ رفتہ رفتہ حلقة، احباب بڑھنے لگا۔ آغا محمد باقر رئیس سیالکوٹ سے کہ قریباً قریباً ہم عمر تھے گھری دوستی ہو گئی۔ آغا صاحب کی طبیعت میں بڑی درویشی تھی۔ کوئی سائل آتا یا دیکھتے اس کی کوئی ضرورت ہے تو بلا تکلف فقیتی سے قیمتی چیز اس کی نذر کر دیتے۔ محمد اقبال کو ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹ کے مشہور عالم دین، اہل حدیث کے پیشووا میر حسن سے کسب فیض کرتے۔ محمد اقبال سے دوستانہ روابط قائم ہو گئے۔ سیر و تفریح میں ساتھ رہتے۔ باہم کر دل لگی ہوتی۔ ڈاکٹر محمد حسین شاہ اینٹرنیشنل میں ان کے ہم جماعت تھے۔ ان سے بڑی دوستی تھی۔ محمد اقبال ان کی بڑی عزت کرتے، بڑی محبت سے ملتے۔ میر حسن کے ہندو، سکھ اور مسلمان شاگردوں اور ارادت مندوں میں رکن الدین، کنور سین نہال سنگھ، جدت سنگھ، جمشید علی راٹھور کے علاوہ جنہوں نے آگے چل کر بڑا نام پایا کتنے اور حضرات تھے نرا نجیں داس، کھڑک سنگھ، بیلی رام جو صح و شام میر حسن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کھڑک سنگھ نے سیاسی زندگی میں بڑا نام پایا۔ بیلی رام بڑے با اثر ہندو و کیل تھے۔ نہال سنگھ ڈپی کمشٹری سے پیالہ میں وزارت تک جا پہنچے۔ کنور سین کے والد بھیں میں بڑے کٹر آریا بماجی تھے۔ اسلام پر طرح طرح سے مفترض ہوتے ایک دن مرا زاغلام احمد مرادی میں بیٹھ گئے۔ کمل اوڑھ لیا۔ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ کہنے لگے ان کے ماتھے پر جلی حروف میں لفظ دجال لکھا ہے۔ رکن الدین نے پر ائمہ کی تو میر حسن نے خود ان کی تعلیم کا ذمہ لیا۔ ایم۔ اے تک ہر امتحان میں اول آئے۔ کنور سین لا کالج کے پرنسپل بنے۔ ریاست جموں کشمیر میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے۔ مختصراً یہ کہ محمد اقبال کی زندگی ان دونوں بڑی ہمہ گیر تھی۔ اکھاڑہ، کبوتر بازی، سیر و تفریح، شعرو شاعری،

میر حسن کا حلقة درس، کالج کی تعلیم، باب کی صحبت، ارباب شریعت اور طریقت کا ذکر آتا تو محمد اقبال ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ محمد اقبال کے جملہ مشاغل ایک سلیقے اور قرینے سے جاری تھے اور یہ اس زمانے میں جب مسلمان ایک شدید روحانی انفراط سے گزر رہے تھے۔ ہر طرف بیدلی کا عالم تھا۔ سکھ گردی کے دور میں ان پر جو گزری سو گزری اب ایک نئی قوم کی مکومی کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی غلامی کا خطرہ تھا۔ ان کا وجود ملی خطرے میں تھا۔ تہذیبی و روش خطرے میں، اخلاق اور معاشرت، ایمان اور عقائد خطرے میں، عیسائیت اور آریا سماج نے ان کے خلاف ایک مجاز قائم کر رکھا تھا۔ خود مسلمانوں کے اندر نہ ہی اختلافات اور نزعات کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی گروہ بندیاں قائم تھیں۔ تحریک علی گڑھ کی بلا وجہ مخالفت پکھ کم یا سانگینیز نہیں تھی۔ مرزا غلام احمد بھی ان دنوں سیاکلوٹ میں مقیم تھے۔ شیخ نور محمد کے قریب ہی ایک مکان میں رہتے۔ ہنوز ان کی دعوت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ زمانہ ان کے مراقبوں، علمی اور نہ ہی گفتگوؤں کا تھا۔ شیخ نور محمد اور میر حسن سے ملاقات رہتی۔ محمد اقبال یہ سب کچھ دیکھتے اور سب کچھ سنتے۔

گویا محمد اقبال نے جوانی میں قدم رکھا تو جیسا کہ ان کی ڈھنی اور اخلاقی تربیت کا تقاضا تھا۔ جیسے جیسے سن و سال کے ساتھ ساتھ ان کے شعور میں پختگی پیدا ہوئی، وہ خود بھی خواہ ایک نو عمر طالب علم کی حیثیت ہی سے سہی سوچ رہے تھے کہ یہ نہ ہی اختلافات اور نزعات، یہ اخلاق و معاشرت کا فرق، یہ زندگی کی الگ تھلگ را ہیں۔ یہ نئی اور پرانی تہذیب کی گفتگوؤں، یہ مسائل۔ یہ علم و حکمت کی بحثیں یہ سب کیا ہیں، کس لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے محمد اقبال کی زندگی میں عنفو ان شباب ہی سے وہ سب عناصر جمع ہو رہے تھے جن سے آگے چل کر ایک عظیم شخصیت کی تعمیر ہوئی اور جس نے صدیوں کے انتشار فکر، ثروتیہ خیالی اور لاماحا صل بحث و جدال، خود ساختہ مسائل حتیٰ کہ تعصباً اور تنگ نظری کے باوجود ادعاء اور تحکم کا حصار توڑا۔ اسلامی تعلیمات کی ترجمانی نہایت صحت سے کی۔ اسلام کی صداقت اور حقانیت تو بچپن سے ہی دل میں گھر کر چکی تھی جیسے مدرج تعلیم میں آگے بڑھے، زندگی کو دیکھا، اس کی کشاکش، اس کے گوناگوں احوال و ارادات، جیسے جیسے عقل و فکر کو ترقی ہوئی، ادب اور فن کی نزاکتیں آشکار ہوتی گئیں وہ خیالات اور تصورات، وہ جذبات اور احساسات ابھرے جو زندگی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ محمد اقبال زندگی کے لذت آشنا تھے۔ اس کے تاب و تب سے شناسا، اس کے جمال و جلال سے لطف اندوز، اس کی دل کشی، حسن اور زیبائی کے قدر دان، جوانی ایک نووارد کی طرح انھیں اس

عالم میں لے آئی جس سے ایک سفر کی ابتداء ہوتی ہے وہ اس کا آغاز، وہ اس کی مشکلات اور موانع، توقعات اور امکانات۔ وہ ایک دور دراز منزل اور اس کے خطرات۔ وہ عزائم اور مقاصد، امکنگوں اور آرزوؤں کی ترپ۔ وہ امید و تہم، وہ ذوق و شوق۔ انتظار اور اضطراب کی ساختیں۔ رفیقان سفر، دوستی اور یک دلی بھلی محبت، وہ ہجر و صال، وہ حسن و عشق اور اس کا ناز و نیاز۔ وہ رنج و ناکامی اور وہ شکست خمار کا عالم۔ وہ بالیدگی، شوق اور وہ عقل اور دل کی کشمکش۔ وہ مستقبل کی جھلک اور اس کا فریب۔ وہ منزل مقصود کا سفر اور اس کا اختتام۔ انسان سوچتا ہے کیا اس سے آگے بھی کوئی سفر ہے کوئی اور منزل؟ نہیں ہے تو بقول گوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ماضی ہی سب کچھ ہے۔ ماضی ہی حقیقت۔ ۲۵۔ محمد اقبال بھی یہ سفر طے کر رہے تھے۔ اس کے گوناگوں مرحبوں سے گزر رہا تھا۔ سراپا شوق سر اپا امید، لیکن با احتیاط اور ہوش مندی، سیرت و کردار کی پختگی، ذہن رسا، ضبط اور متنانت کے ساتھ جس نے انھیں شباب کی ہر لغزش اور ہر بے راہ روی سے محفوظ رکھا۔ تا آنکہ جوانی ہی میں ان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا، جوانی ہی میں سیالکوٹ کے علمی اور مذہبی حلقوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ رہی تھیں ۲۶۔ چنانچہ ۱۸۔ ابرس کا یہ جوان رعناء خوش اطوار، خوش گفتار، شاعر، متعلم جس طرف سے گزر کرتا لوگ سمجھتے ایک عظیم مستقبل ان کے سامنے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک عظیم مستقبل اس کے سامنے تھا۔

۱۸۹۵ء میں محمد اقبال لاہور آگئے۔ لیکن سیالکوٹ کے دوستوں اور ساتھیوں کو نہیں بھولے۔ جب بھی سیالکوٹ جاتے ان سے بلا تکلف ملتے۔ میر حسن کے درس کا رخ کرتے اور کوچ میر حسام الدین میں قدم رکھتے تو سر بازار اللہ تاشیر فروش کی دکان پر بیٹھ جاتے۔ کبوتروں کی گفتگو ہوتی۔ ان کا ایک ساتھی چراغ ہار موئیم بجا تا، اس لیے ماسٹر کہلاتا۔ لاہور چلا آیا تھا۔ اس سے ملاقات ہوتی۔ ہار موئیم سنتے۔ چراغ ہی مولوی محبوب عالم سے تعارف کا ذریعہ بنا۔ ۲۷۔ میرزا بدر الدین سیالکوٹ کے ایک معزز خاندان کے فرد محمد اقبال ہی کے ایما سے لندن گئے، پیر سڑی کی۔ محمد اقبال کی بڑی عزت کرتے۔ میر نیرنگ جب سیالکوٹ گئے اور محمد اقبال کے یہاں ٹھہرے تو ان کے ایک عزیز جھنڈے خال سے بھی ملاقات ہوئی۔ میر صاحب نے کہا ایسا بلند بالا اور خوش قامت نوجوان اور نام جھنڈے خال۔ محمد اقبال نے کہا آج سے ہم، انھیں علمدار خال کہیں گے۔ میر صاحب نے جھنڈے خال کی بڑی تعریف کی ہے۔ ۲۸۔ جھنڈے

خاں کیک چشم تھے۔ ان کے ایک دوست تھے حافظ شفیع بینائی سے محروم دونوں اکھٹے سیر کو نکلتے۔ ایک روز کچھ لڑکوں نے آتے دیکھا تو کہنے لگے، یارو دیکھو تو آدمی دو مگر آنکھ ایک۔ جمہڈے خاں بہت محفوظ ہوئے۔ ہر ایک کو مزے لے کر لطیفہ نشانے۔ محمد اقبال کے ایک اور دوست تھے چاچا خوشاں۔ اسکا چومن ہائی اسکول میں ان کے ہم جماعت۔ محمد اقبال چاچا خوشاں کے ہاں جاتے۔ دونوں دوست مکان سے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ جاتے۔ باہم کرتے، شترنخ کھلیتے۔ چاچا خوشاں نے محمد اقبال سے اپنی دوستی کا حال بیان کیا ہے۔ پیرانہ سالی میں بال سفید ہو چکے تھے کہنے لگے اقبال جب بھی لاہور سے آتا مجھے ضرور ملتا۔ محمد اقبال ایک بار سالکوٹ، ان سے ملنے گئے۔ چاچا خوشاں گھر پر نہیں تھے۔ باہر چبوترے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے گزرے ہوئے دونوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ چاچا خوشاں نے ان سے دوستی کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ بچپن کی لڑائیاں، صلح اور پھر لڑائی۔ چغاں کا میلہ تھا خوشاں لاہور آیا۔ شالamar کی سیر کی۔ واپسی میں شاید محمد اقبال سے ملنے کا خیال تھا۔ بھائی دروازے کے باہر سوڑاپی رہا تھا کہ دیکھتا ہے دفتاً ایک تانگہ رکا۔ آواز آئی خوشاں تم یہاں کہاں۔ محمد اقبال تانگے سے اترے۔ خوشاں کو گھر لے گئے۔ راستے باتوں میں کٹ گیا۔ خوشاں نے کہا یار تو اب بڑا آدمی بن گیا ہے۔ محمد اقبال نے کہا ٹھیک کہتے ہو لیکن بچپن کے دوستوں کی دوستی اور خلوص شاید دوبار میسر نہ آ سکے!<sup>۱۲۹</sup> سید محمد تقی، سید بیشیر حیدر اور شیخ گلاب دین لاہور آگئے تھے۔ ان سے تاجین حیات تعلقات میں فرق نہ آیا۔ جیسے سالکوٹ میں بچپن کے دوستوں مولوی ابراہیم اور آغا محمد باقر سے۔

## ۹۔ شاعر اقبال

محمد اقبال کو فظرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔ وہ جو کہتے ہیں: "الشعراء تلا میذ الرحمن، شاعری دہب ہے، اکتساب نہیں ہے۔ فظرت نے محمد اقبال سے خود ہی شعر کھلوایا۔ بچپن ہی سے کلام موزوں زبان سے نکل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کلام موزوں زبان سے نکل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کلام موزوں شعر کے سانچے میں ڈھل گیا۔ بچپن ہی میں بازار سے منظوم قصے خریدلاتے۔ آواز نہایت سریلی تھی لحن بڑا دلکش قصے نشید کرتے۔ خود محفوظ ہوتے سننے والوں کو محفوظ کرتے۔ یوں موسیقی سے شغف ہوتا گیا۔ شعر کہنے لگے۔ شروع شروع میں جو کچھ کہا دوستوں تک محدود رکھتے ہوں گے۔ ابھی اسکول ہی میں تھے کہ میر حسن سے شعر گوئی کا ذکر آ گیا۔ انھوں نے خوب خوب

ہمت بڑھائی۔ شعر کہنے کی تاکید کی۔ حالانکہ آغاز تھا۔ لیکن میر حسن نے جس طرح یہ اندازہ کر لیا تھا کہ یہ پچھے مسجد میں نہیں مدرسے میں پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے بعینہ یہ بھی کہ ایک روز اس کی شاعری کا غلغله چار دنگ عالم میں پھیل جائے گا۔ میر حسن نے گویا ان کی طبع موزوں، ان کی شاعری کے حکیمانہ رنگ کو ان کے ابتدائی اشعار ہی میں دیکھ لیا تھا حالانکہ ان اشعار میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن میر حسن کی نگاہ جو ہر شناس تھی۔ انہوں نے گویا اس شاعری کی ابتداء، ہی میں اس کی انتہا کو دیکھ لیا۔ محمد اقبال کے ایک ہم سبق کو بھی شاعری کا شوق چرا یا۔ محمد اقبال کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ میر حسن سے تلمذ تھا ہی ایک روز موقعہ پا کر میر حسن سے ڈرتے ڈرتے عرض کیا میں بھی شعر کہتا ہوں۔ اجازت ہو کچھ اشعار ہو گئے ہیں۔ میر حسن نے اشعار سنے۔ خاموش رہے۔ اس کے بعد چھٹری اٹھا کر خوب خوب مرمت کی۔ کہنے لگے خبردار جو آئندہ تم نے شعر کہنے کی جرأت کی۔ یہ تھی میر حسن کی نگاہ جو ہر شناس۔ محمد اقبال شعر کہتے میر حسن اصلاح دیتے۔ چنانچہ اسکو ہی میں محمد اقبال نے ان کی موجودگی میں ایک نظم پڑھی۔ نومبری ہی میں ان کی شاعری کا چرچا عام ہو گیا۔ سیالکوٹ میں ایک بزم مشاعرہ قائم تھی۔ اس میں کلام سناتے۔ مقامی شعراء بالخصوص میر ام بخش جلوہ سے کھپٹکے بند تھے نوک جھونک رہتی۔ میر حسن کا ذوق شعر نہایت بلند تھا۔ ان سے شعرو شاعری کی نزاکتوں، عروض اور قوانی کی خوبیوں، کلام کے محاسن، ان کے معافیں، غرض کہ ہر اس بات کا سبق سیکھا جس کا تعلق اس فن کے لوازم سے ہے۔ عبدالرحمن شاطر مدراسی کو لکھتے ہیں۔ ”اعجاز عشق“، حضرت مولوی میر حسن پروفیسر عربی، اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ کے نام ارسال کیجیے۔ یہ بڑے بزرگ عالم اور شعر فہم ہیں۔ میں نے انھیں سے اکتساب فیض کیا ہے۔<sup>۳۲</sup> دراصل محمد اقبال کے ذوق و تختن کی تربیت میر حسن ہی کی توجہ سے ہوئی۔

”شاہ جی کا کیا کہنا ہے۔ ان کی ہربات شعر ہوتی ہے“، اسکے باس ہمہ میر حسن کا خیال تھا کہ تقاضائے وقت، علی ہذا تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ شعرو شاعری میں محمد اقبال کا رشتہ تلمذ کسی استاد سے قائم ہو جائے۔ نگاہ انتخاب بجا طور پر فتح الملک بہادر داغ دہلوی پر پڑی کہ وہی اس زمانے میں شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے اور انھیں کی زبان سند تسلیم کی جاتی تھی۔ محمد اقبال نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ”لیکن یہ سلسلہ تلمذ دیریتک قائم نہ رہا۔ داغ نے بہت جلد کہہ دیا کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے“،<sup>۳۳</sup> البتہ اس کی یاد بقول شیخ عبدالقدار دونوں

طرف باقی رہ گئی۔ محمد اقبال نے داغ ہی کی زندگی میں قبول عام کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ داغ مرحوم اقبال پر فخر کرتے۔ ”مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخر یہ کلمات ان کی زبان سے سنے“۔<sup>۳۲</sup> محمد اقبال کے دل میں بھی داغ کی بڑی قدر تھی۔ ان کی شاگردی پر ناز کرتے اشعار میں بھی اظہار عقیدت ہوتا۔ سیالکوٹ ہی کے زمانے کی ایک غزل ہے۔<sup>۳۳</sup>

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں  
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں  
گرم ہوتا ہے کبھی ہم پہ جو وہ بت اقبال  
حضرت داغ کے اشعار سننا دیتے ہیں  
ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں:

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے  
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی  
انھوں نے بار بار داغ کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔<sup>۳۴</sup> لاہور آئے تو داغ کے شاگرد احسن  
مارہروی بھی لاہور میں مقیم تھے۔ ان سے روابط بڑھے۔ احسن مارہروی لاہور سے چلے گئے تو  
ایک خط میں فرمائش کی استاد داغ کی تصویر بھیجیں۔<sup>۳۵</sup> قیاس یہ کہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۵ء کے  
درمیان جناب داغ کسی وقت لاہور آئے۔ محمد اقبال ان سے ملنے ہوں گے۔  
۱۹۰۵ء میں داغ کے انتقال پر جو دردناک مرثیہ لکھا وہ اس عقیدت کا جو انھیں داغ سے  
تھی ناقابل انکار ثبوت ہے۔ مگر پھر صرف یہی نہیں، یہ مرثیہ داغ کی شاعری پر ایک جامع اور  
مانع تبصرہ بھی ہے۔ ان کی عظمت کا مخلصانہ اعتراف۔<sup>۳۶</sup> محمد اقبال نے داغ کی تاریخ وفات  
بھی کہی ہے۔ نواب میرزاداغ، ۱۳۲۲ھ۔

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محمد اقبال موسیقی کے دلدادہ تھے۔ ۱۹۰۳ء  
میں فوق نے یاد رفتگان کے نام سے صوفیا کے حالات میں ایک کتاب لکھی جس تھی سماع کے  
جو از و عدم جواز کی۔ فوق نے سماع کے جواز کی اساس اقبال کے اس شعر پر کھی:

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال  
راگ ہے دین مرا راگ ہے ایمان مرا

محمد اقبال نے جواباً بخط لکھا اس میں اس شعر کی طرف تو کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ فوق کو ان کی منت کی دادی ہے کہ انہوں نے اہل اللہ کے حالات جمع کیے۔ لکھتے ہیں ”میں خود بھی ان کی ملاش میں ہوں“۔<sup>۳۸</sup> بہر حال فوق کی یاد رفتگان سے ہمیں محمد اقبال کا ایک شعر مل گیا۔ موسیقی سے ان کی لگن کی تصدیق ہو گئی۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے اس فن کی باقاعدہ تحریک کی یا نہیں کی۔ اگر کی تو شویقہ اور وہ بھی ایک حد تک۔ یوں شاید اس میں کچھ سمجھ بھی پیدا کر لی ہو جس سے معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ موسیقی سے لگن میں کیا مشکل تھا کہ اس فن میں مہارت حاصل کر لیتے۔ وہ بہر حال موسیقی کے دلداد تھے اور ایک روایت ہے کہ بھی کبھی ستار کی مشق بھی کرتے، بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اس ستار کی مضراب بھی تک محفوظ ہے، حتیٰ کہ اس سلسلے میں کئی لٹائن بھی ایجاد ہوئے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ فقیر سید ختم الدین ستار بجا تے ہیں تو جسٹس آغا حیدر کے توسط سے فقیر صاحب سے ستار پر خوب خوب راگ سنتے: درباری، مالکوں، ایمن۔<sup>۳۹</sup> اور یوں شاید ان کا آہنگ بھی سیکھ لیا ہو۔ بات یہ ہے کہ موسیقی سے انھیں بچپن ہی سے دلی لگاؤ تھا۔ گھر میں منظوم قصے گا کر سنا تے۔ شعرو شاعری کی محفلوں میں بھی اپنا کلام خوش الحانی سے نشید کرتے، درست کتابوں میں کہیں کہیں سرگم کے بول میں لکھے ہیں۔ ساز بڑے شوق سے سنتے۔ خود اگرچہ کوئی ساز نہیں رکھا۔ البتہ موسیقی پر اکثر ایک ماہر فن کی طرح گفتگو کرتے۔ کہتے یہ جو ہماری اور مغربی موسیقی میں ترجم اور ہم آہنگ کا فرق ہے مسلمان موسیقی و ان اسے بڑی آسانی سے دور کر سکتے ہیں۔ دونوں کا اتصال ممکن ہے۔ اسلامی موسیقی میں موسیقی، موسیقی و ان اور موسیقار، تالیف اور آہنگ کا نمایاں امتیاز موجود ہے۔ مغربی موسیقی سے زبردست اثرات قبول کیے۔ سارٹن اور فارمر اس پر بہت کچھ لکھے ہیں۔<sup>۴۰</sup> لاہور آئے تو گانے کی محفلیں جنے لگیں۔ خاص خاص دوستوں کے حلے میں خود بھی اپنا کلام ہلکے ہلکے سروں میں گا کر سنا تے۔ ساز تو نہیں ہوتا لیکن کیا فن کی پابندیوں کے ساتھ یہ معلوم نہیں۔ میکلوڈ روڈ والی کوئی میں مشہور موسیقار رفیق غزنوی سے کئی بار پیام مشرق کی غزلیں سنیں۔ سہ پہر کا وقت ہوتا رفیق غزنوی ہمارے پاس آتے۔ ہم ان کی خدمت میں پہنچتے۔ ہار مونیم ساتھ ہوتا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے محفل گرم رہتی۔ یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے ان کی بعض غزلوں کے گراموفون ریکارڈ بھی رفیق غزنوی ہی کی آواز میں ہیں۔ آخری علاالت کے ایام میں بھی ایک شام مرحوم سجاد سرور نیازی جو خود بھی ان کی خدمت میں حضوری کے لیے بیتاب تھے، ہمارے ساتھ جاوید منزل

گئے۔ سجاد سرور کہنے لگے میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ موسيقی سے آپ کا دل بھلاؤ۔ اجازت ملی تو ایک کے بعد دوسرا اگ چھیرا۔ سجاد سرور کی میٹھی میٹھی دھنیں، ہلکا ہلکا ساز، بال جبریل کی غریبی اور وہ شام۔ کیسی کیف پرور ساعتیں تھیں۔ سجاد سرور ایک مرتبہ دم لینے کے لیے رکے تو اشارہ ہوا فلاں موقع پر گلے کو جو پیٹا دیا تھا ٹھیک نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کیسے؟ کہنے لگے میری آواز تو بیٹھ گئی ہے کیا بتاؤں کیسے۔<sup>۲۷۱</sup>

محمد اقبال کا ابتدائی کلام محفوظ نہیں۔ جتنا کچھ دستیاب ہوا باعتبار سنین اس کی ترتیب بھی ممکن نہیں کہ ہم کہہ سکیں اس میں ۱۸۹۵ء تک سیالکوٹ کا حصہ اتنا ہے، ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک لاہور کا اتنا۔ لیکن دو باتیں ہیں جو واضح طور پر سامنے آ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ آغاز خن، یعنی ۱۸۹۵ء سے قبل کے سیالکوٹ ہی میں ان کے کلام میں پختگی آچکی تھی اور عنوان کہہ رہے تھے کہ اس کا مستقبل عظیم ہے۔ جب ہی تو داغ نے بہت جلد کہہ دیا تھا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ پھر اسی زمانے لیعنی ۱۸۹۳ء میں ان کی ایک غزل رسالہ زبان دہلی میں شائع ہوئی۔ دوسری ۱۸۹۳ء میں بعنوان شیخ محمد اقبال صاحب اقبال شاگرد بلبل ہند داغ دہلوی۔ زبان حضرت راجح دہلوی کی ادارت میں بطور ضمیمه پڑھ بے مثال شائع ہوا۔<sup>۲۷۲</sup>

ایک تو ہی غزل ہے جس کی ردیف قافیہ ہے دعا دیتے ہیں سنادیتے ہیں اور جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا تھا۔ دوسری غزل ہے۔

کیا مزا بلبل کو آیا شکوہ بیداد کا  
ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ اڑ کے جو گھر صیاد کا  
بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم  
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال تیری یاد کا

اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کا شمار اسی زمانے میں زمرة شعراء میں ہونے لگا تھا۔ پھر اس زمانے میں سیالکوٹ سے بھی کچھ اخبار شائع ہوتے۔ عجب نہیں ان میں علی ہذا پیام یار لکھنؤ میں جو سیالکوٹ میں گھر گھر پڑھا جاتا۔ ان کا کلام شائع ہوتا۔

ثانیاً یہ کہ شاعری کے اس دور میں ان کا رنگ تھن اگرچہ وہی تھا جو عام طور پر اردو غزل کا ہے۔ لیکن شوخی اور رندي، حسن و عشق اور ہجرو وصال کے عام مضامین کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں کچھ حکیمانہ خیالات بھی ملتے ہیں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے۔ زندگی کے احوال و واردات پر

بھی نظر ہے۔ ذہن اسلام کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ غزل کے عام اور متبذل رنگ کا اندازہ ان اشعار سے کیجیے:

ہے وہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی  
کس طرح کے مال ہوتے ہیں

شکایت کو میں دوڑوں اور تم جانے نہ دو مجھ کو  
مزہ آئے جو ہو یہ ہاتھا پائی روزِ محشر بھی

رسماً یہ شعر:

کوچہ عشق کے یہ راہ نما بنتے ہیں  
اللہ اللہ کوئی دیکھے تو خضر کی صورت

رسی تصوف:

انا لحق کہہ کے بیتابانہ سولی پر لٹک جانا  
نزالی ایسے دیوانے کی مستانے کی باتیں ہیں

مضمون آفرینی:

تو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت  
میں نہاں تجھ سے ترے موئے کمر کی صورت

زخمِ جگر جو تھے شپ فرقت میں ہم سخن  
چپکے سے چاندنی پس دیوار آ گئی

رنگِ تعزز:

نسیمِ صح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے  
کسی حسین کا جھاڑا ہوا غبار ہوں میں

شوخی:

جس کو شہرت بھی ترسی ہے وہ رسوا اور ہے

ہوش بھی جس پر تڑپ اٹھے وہ سودا اور ہے  
وہ صفتِ محشر میں کہتے ہیں مجھے پچان کر  
تم وہی اقبال ہو لو میں نے جانا اور ہے

فکر:

اے حباب بحر اے پروردہ آغوشِ مونج  
کچھ پتا چلتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے  
بترنج رنگ بدلتا ہے۔

قفس میں اے ہم صیر اگلی شکایتیں کیا حکایتیں کیا  
خرزاں کا دورہ ہے گلستان میں نہ تورہا ہے نہ ہم رہے ہیں

تجھ میں باقی ہے اگر کچھ اثر سوزِ خلیل  
نارِ امروز سے کر گلشنِ فردا پیدا  
اور پھر ذہنِ اسلام کا رخ کرتا ہے:  
رنگِ اواڈی ہیں رنگیں ہو کے اے ذوقِ طلب  
کوئی کہتا تھا کہ لطفِ مخلوقنا اور ہے

اڑ کے اے اقبال سوئے بزمِ پیرب جائے گا  
روح کا طائرِ عرب کی شمع کا پروانہ ہے  
گوابدائی اور واضحِ شکل میں

ثالثاً محمد اقبال کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ شعر پر شعر اور غزل پر غزل ہوتی چلی جاتی۔  
ایک ہی ردیفِ قافیے میں چار چار غزلیں کہی ہیں۔ گویا ٹھوائے فی کل واد یہیمون ذہن ان ایک  
نہیں کئی سمتوں کا رخ کر رہا ہے۔ یا یوں کہیے جذبات و کیفیات، خیالات اور تصورات خام  
پیداوار کے ایک انبار کی طرح جمع ہو رہے ہیں جو اس دور میں تو کچھ کچھ لیکن جلد ہی ایک متاع  
گران ما یہ کی شکل اختیار کر لیں گے بایں ہمہ اس دور کے کلام سے بھی جتنا کچھ دستیاب ہو سکا  
معلوم ہوتا ہے کہ اردو غزل کے عام رنگ سے بترنج ہٹ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اہل نظر کو اسی

زمانے سے احساس تھا کہ ان کے اشہب قلم کا رخ کسی اور ہی بلند اور برتر میدان کی طرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس دور میں کیا انھوں نے فارسی میں بھی شعر کہا۔ سواسِ ضمن میں شیخ عبدالقدیر کا یہ کہنا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھ شعر کے فارسی میں کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی، محل نظر ہے۔ یہ خود خود شعر کا ہو جانا اور بالا رادہ فارسی میں شعر کہنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ عربی اور فارسی سے محمد اقبال کو دلی لگاؤ تھا۔ فارسی اور عربی ادب ان کے دل و دماغ میں رچ گیا تھا۔ پھر یہ کہ فارسی میں انھوں نے بہت جلد مہارت پیدا کر لی تھی۔ فارسی شعراء کے دو اویں اور ان کے اسالیب تھن صبح شام ان کے سامنے رہتے۔ فارسی سے ان کی طبعی مناسبت تھی اور پھر جب ذوق شعر خدا داد تھا، فارسی اور عربی کا ادبی اور ثقافتی ورشہ دل میں گھر کر چکا تھا۔ مذاقِ سلیم کے لیے بھی ارد و اور فارسی میں دوہی قدم کا فاصلہ ہے، بلکہ اس سے بھی تو فارسی میں بھی شعر ہو جاتے ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی باقاعدہ ابتداء اسرار خودی سے ہوئی۔ لیکن اس سے بہت پہلے وہ فارسی میں کچھ نہ کچھ کہر ہے تھے۔ ذرا اس قطعے پر غور کیجئے جو انھوں نے فتنی سراج الدین کو ان کی بھیجی ہوئی انگوٹھیوں کے شکرانے میں ۱۹۰۳ء میں لکھا ”یام از شمیر مرا بفرست چارانگشتی“، سولہ اشعار کے اس قطعے میں انھوں نے کیسے کیسے مضامین پیدا کیے ہیں۔ ۱۹۰۵ء تک وہ فارسی میں بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام میں اسلامیہ کا جس سے خطاب ہی کو دیکھ لجیے۔ کلام میں کیسی روائی ہے۔ یہ سب کچھ دفعتاً تو نہیں ہو گیا۔ جس طرح ان کی اردو شاعری کی ابتداء سیالکوٹ ہی میں نہایت خوبی سے ہو چکی تھی۔ اس کا بہتر تنگ ارتقاء دوسری بات ہے۔ بعینہ فارسی میں بھی شعر کہنے کا آغاز سیالکوٹ ہی میں ہو گیا ہوا گا۔ ۱۹۰۷ء میں مشکل البتہ یہ ہے کہ ان کا ابتدائی کلام تلف ہو چکا ہے۔ بہت کم محفوظ ہے۔ زماناً اس کی تعین بھی ممکن نہیں۔ پھر بھی آغاز شعر گوئی سے ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۰ء تک جب ان کی شاعری اس مرحلے میں داخل ہو گئی جس کو ان کے ابتدائی کلام کی تمہید تصور کرنا چاہیے ان کی غزلوں اور قطعات میں کئی ایک فارسی اشعار ملتے ہیں۔ ان کے فکر و فرہنگ اور شاعری کی دنیا دفعتاً تو نہیں بدی۔ اس کے عنوان شروع ہی سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اس میں ایک تسلسل ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ فارسی میں بھی شعر گوئی آپ ہی آپ ہو رہی تھی، ارادۃ نہ سہی ارجالاً۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام میں البتہ کئی ایک فارسی اشعار ملتے ہیں۔ کچھ نظمیں ہیں کچھ متفرق قطعات جن کا زمانہ متعین نہیں ہو سکتا۔ ذرا یہ تضمین یا تقطیعہ ملاحظہ ہو۔ زمانہ معلوم

نہیں:

صحنِ گلشن سے ہوں گو میں آشیاں برباد دور  
لالہ و گل سے نہیں میرا دل ناشاد دور  
شبینے راکزِ محیط پکرائ افتادہ دور  
در کنارِ لالہ و آغوشِ گل آرام نیست ۲۳۲

ایسے ہی کچھ اور مثالیں بھی ہوں گی۔ سیاکلوٹ میں اگر آپ ہی آپ فارسی اشعار ہو جاتے تو وہ انھیں کوئی اہمیت نہ تھے۔ انھیں ابھی خیال ہی نہیں تھا کہ ان کے دل میں جس قسم کے خیالات ابھر رہے ہیں۔ جذبات کا جوانداز ہے۔ اردو کے تنگناے غزل میں اتنی وسعت نہیں کہ بقدر شوق اس کا متحمل ہو سکے۔ وہ اس میں ایسے فکر و وجدان کا اظہار کر سکیں۔ اس کے لیے انھیں بلا خر فارسی ہی کہ ”درخور فطرت اندیشہ“ ہے، کارخ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ شاعری کے ابتدائی دور میں بھی ان کے کلام میں فارسی کا عملِ خل بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ یوں بھی شعر کہتے تو ان کا ذہن فارسی شاعری کے اساتذہ کی طرف منتقل ہو جاتا۔ خاتمی کا مطالعہ انھوں نے کس گھری نظر سے کیا تھا اس کا اندماز ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء کی ایک غزل سے کیجیے جو فی البدیہ ہی گئی:

لاکھ سرتاجِ سخنِ ناظمِ شروال ہو گا  
پر مرے سامنے اک طفیلِ دبتاں ہو گا

در اصل ان کی فلسفیانہ طبیعت کو جس پیکر کی تلاش تھی، فارسی ہی میں مل سکتا تھا۔ فارسی ہی سے ان کی طبعی مناسبت نے مرزاغالب کی طرح انھیں مجبور کر دیا کہ فارسی زبان کی تشبیہوں اور استعاروں، عربی اور فارسی کی تلمیحات سے کام لیں۔ ایسی ترکیبیں اور اصطلاح وضع کریں جن کے بغیر ناممکن تھا وہ اردو میں اپنے احوال و واردات کی ترجمانی کر سکتے۔ ان کے افکار دماغ اور جذبات قلب کو ایک نئے پیکر کی تلاش تھی۔ یہ نیا پیکر فارسی ہی کی بدولت میسر آیا۔ جس سے رفتہ رفتہ اردو شاعری کو ایک ایسی زبان عطا ہوئی جو بیک وقت فلسفیانہ بھی تھی اور شاعرانہ تھی۔ جس کی لطافت اور شیرینی، جس کے حسن بیان اور ندرت اسلوب پر نہ صرف اردو بلکہ ادبِ عالم کو ناز رہے گا اور جس کے لیے شکوہ، شمع و شاعر، خضر راه، طلوعِ اسلام بال جبریل کی غزلوں، مسجد قرطباً اور ذوق و شوق ایسی نظموں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہو گا۔

لیکن ابھی ایک اور بات ہے جس کا محمد اقبال کے فن اور فلسفہ کے مطالعہ میں بالخصوص لحاظ

رکھنا پڑے گا اور جس کا تعلق پھران کے ابتدائی کلام سے ہے، بشرطیکہ ہم اس باب میں بھی ان کی ابتدائی شاعری کی طرح سنین کی پابندی کا سختی سے لحاظ نہ رکھیں۔ ۱۸۹۵ء سے دو چار سال اور آگے بڑھ جائیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس دور میں بھی وہ فلسفیانہ تصورات جن کی باقاعدہ تشکیل بہت آگے چل کر ہوئی ان کے دل و دماغ کو چھپیر ہے تھے۔ ہمیں معلوم ہے خودی ان کا بنیادی تصور ہے۔ ان کے فلسفہ کا ایک ہی محور جس نے رفتہ رفتہ پوری زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تا آنکہ ذاتِ انسانی سے لے کر انسان، کائنات، مذہب، اخلاق، سیاست، معاش، ادب فن غرضیکہ تہذیب و تمدن کی جو بھی غایت ہے، جیسے بھی کوئی حقیقت ان کے سامنے آئی اس کا فیصلہ خودی کے حوالے سے ہونے لگا۔ وہی ایک معیار ہے محمد اقبال کے نزدیک خوب و ناخوب، غلط اور صواب کا۔ وہی ایک کسوٹی جس پر وہ ہر خیال اور ہر عمل کو پرکھتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۹۷ء میں محمد اقبال نے فی البدیہ ایک غزل کی۔ عید کا دن تھا اور دوستوں کی محفل شیخ عبدال قادر نے کہا محمد اقبال اور خان احمد حسین خاں موجود ہیں، فی البدیہ ایک ایک غزل کہیں، لطف رہے گا۔ محمد اقبال نے غزل کی۔ مطلع اوپر آچکا ہے۔ لیکن اس کا یہ شعر بالخصوص توجہ طلب ہے:<sup>۳۵</sup>

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے

موت جب آئے گی اس کو تو وہ خندان ہو گا

اور جس کا ایک طرح سے فارسی میں لفظی ترجمہ آگے چل کر ارمغان حجاز میں ہوا:

نشان مردِ مومن با تو گوئیم

چو مرگ آید تبسم برلپ اوست

علی ہذا یہ شعر:

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایمان

جنتی ہو گا فرشتوں میں نمایاں ہو گا

یعنی خودی کا تصور ابتداء ہی سے ان کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ یہ غزل ۹۶ یا ۹۷ء کی ہے۔ اب خیالات اور جذبات کا معاملہ یہ ہے کہ ذہن انسانی میں ان کی پرورش تو ہوتی رہتی ہے، باقاعدہ اظہار کے لیے البتہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خودی کا تصور ۹۶ یا ۹۷ء ہی میں محمد اقبال کے ذہن میں موجود تھا قطع نظر اس سے کہ کس رنگ میں۔

شہاب علی قلندر کا مطالعہ انھوں نے سیالکوٹ ہی میں کر لیا ہوگا اور اسی زمانے میں حضرت  
قلندر کا یہ شعر بھی ان کی نظر سے گزر ہو گا:

### کشفِ دانی چیست عالی ہمتی

مردِ رہ بخود بجزِ زورِ خودی

یعنی اس زمانے سے بہت پہلے جب ان کے والد ماجد فرمائش کر رہے تھے کہ حضرت  
قلندر کی مشنوی کے طرز پر ایک مشنوی لکھیں۔ خاتمی ایسے مشکل پسند اور فلسفہ مزاج شاعر کی طرح  
فارسی کے اساتذہ سخن کا مطالعہ وہ بہت پہلے کر چکے تھے۔ لہذا ۹۲۱ یا ۹۷۱ میں ان کا کہنا 'لاکھ سر  
تاجِ سخن ناظم شروان ہو گا، اس امر کی دلیل ہے کہ انھیں فارسی زبان پر کس قدر عبور حاصل تھا۔  
معلوم ہوتا ہے ان کے والد ماجد کو حضرت قلندر سے خاص عقیدت تھی۔ کیا عجب ہے وہ محمد اقبال  
سے ان کی مشنوی سنتے ہوں۔ البتہ قبل غور امر یہ ہے کہ حضرت قلندر کی مشنوی میں لفظ خودی کا  
استعمال ایک استثنی ہے صوفیا کے نزدیک اس کے مفہوم سے یکسر مختلف۔ مثال کے طور پر محسن  
تاشر کے اس شعر میں:

غريق قلزم وحدت دم از خودي نزند

بود محال کشيدن ميان آب نفس

میں نے ان اشعار کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس لیے کہ محمد اقبال کی اساس فکر صحت سے  
متعین ہو جائے۔ لیکن مفترض بہر حال کہہ سکتا ہے کہ اگر محمد اقبال حضرت قلندر کا مطالعہ کر چکے  
تھے تو بجائے محسن تاشر کے خودی کی تشریح حضرت قلندر کے حوالے سے کیوں نہیں کی؟ اس کا  
جواب یہ ہے کہ جسمی تصوف میں یہ خودی کے بارے میں طے ہو چکا تھا کہ واردات اتحاد میں اس  
کی نفعی ہو جاتی ہے یہ بات محسن تاشر ہی کے حوالے سے سمجھ میں آسکتی تھی۔

میں ان اشعار کی طرف اس لیے اشارہ کر رہا ہوں کہ محمد اقبال کی شاعری اور افکار کے  
بارے میں اکشنٹی سے طرح طرح کے نظر یہ قائم کر لیے جاتے ہیں یوں خیال ہوتا ہے جیسے  
ان کے خیالات میں دفعتاً تبدیلی رونما ہوئی یا دفعتاً کسی خاص زمانے میں کچھ خاص اثرات ان  
پر مرتب ہوئے۔ گویا ان کے خیالات میں تسلسل نہیں تھا، نہ بتارتیح ان کا ارتقا ہوا۔ برعکس اس  
کے ان میں ایک فصل ہے۔ اس لیے کہ محمد اقبال شاعر تھے۔ طبیعت حساس تھی ذہن فلسفہ پسند۔

دفعتاً کوئی اثر قبول کر لیتا۔ دفعتاً اس کا رد عمل ہو جاتا۔ ان کے افکار و خیالات، الہذا شاعری کے بھی الگ دور ہیں۔ رقم الحروف کے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت جس نتیج پر ہوئی۔ جس طرح ان کے ذہن کی بتندرنج نشوونما ہوئی اس کی ایک اساس قائم ہو چکی تھی۔ اگر ہم ان باتوں پر نظر کھیل تو ان کی اساس فکر نہایت صحت سے متعین ہو جائے گی۔

## ۱۰۔ ازدواج

۱۸۹۳ء میں محمد اقبال امتحان کے امتحان میں بیٹھے۔ امتحان کے لیے گجرات جانا پڑا۔ سیالکوٹ امتحان کا مرکز نہیں تھا۔ گجرات میں بھی سیالکوٹ کی طرح بہت سے کشمیری خاندان آباد تھے۔ ان میں ڈاکٹر شیخ عطاء محمد کا خاندان بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب محدث شاہابا فاس میں رہتے۔ شہر میں اس خاندان کی بڑی عزت تھی۔ شیخ صاحب نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ملازم ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں پر جا پہنچے۔ جدہ اور کامران میں سرکار برطانیہ کی طرف سے نائب قചل رہ چکے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا خطاب پایا۔ ۱۸۷۹ء میں واکسرے کے اعزازی سر جن مقرر ہوئے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔ ان کی بڑی صاحبزادی جن سے محمد اقبال کی شادی ہوئی شاید جدہ یا کامران ہی میں پیدا ہوئیں، وہیں پرورش پائی۔ عربی بولتی اور سمجھتی تھیں۔ شیخ صاحب بڑے دین دار، بڑے عبادت گزار اور نیک انسان تھے حافظ قرآن بھی تھے۔ ۱۸۹۱ء میں کامران سے والپس آئے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں سول سر جن تعینات رہے۔ ان کا شمار میڈیکل اسکول، اب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے اوپرین سند یانٹ طلباء میں ہوتا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ی عمر ۶۳ سال وفات پائی۔

شیخ صاحب کی صاحبزادی کا رشتہ محمد اقبال سے کیسے ہوا یہ ٹھیک معلوم نہیں۔ اگر شیخ صاحب نے ۱۸۹۸ء کے بعد سیالکوٹ میں بھی ملازمت کا کچھ وقت گزارا تو یقینی بات ہے کہ میر حسن کے علم و فضل کی شہرت انھیں میر حسن کی خدمت میں لے گئی ہو گی۔<sup>۱۳۶</sup> ان سے نیاز منداہ روابط ہوں گے۔ یوں شیخ نور محمد صاحب سے بھی ملاقات کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ان سے روابط بڑھے تو میر حسن کے توسط سے رشتہ طے پا گیا، یا ان بزرگوں نے خود ہی بات چیت شروع کر دی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو جیسا کہ شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے ایک صاحب جو سیالکوٹ میں ملازم تھے اور جن کے دونوں خاندانوں سے مراسم تھے انھوں نے اس رشتے کی

تحریک کی۔ سیالکوٹ اور گجرات کے کشمیری خاندانوں سے مراسم تھے انہوں نے اس رشتے کی تحریک کی۔ سیالکوٹ اور گجرات کے کشمیری خاندانوں میں یوں بھی رشتے ناتے کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۸۹۳ء میں یا اس سے کچھ پہلے محمد اقبال کی نسبت شیخ صاحب کی بڑی صاحزادی سے ٹھہر گئی اور اسی سال محمد اقبال کی بارات سیالکوٹ سے گجرات پہنچی۔ طرفین کے اعزاز اور دوستوں نے شرکت کی۔ عقد نکاح کی تاریخ ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء ہے۔ حکیم کرم دین محمد اقبال کی بڑی ہمیشہ کے خسر، سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان کے بزرگ حاجی نور محمد حسن کے بھتیجے میرفضل دین کی شادی شیخ نور محمد کی بھتیجی سے ہوئی اور چند ایک اور احباب کے علاوہ میر حسن بارات میں شامل تھے۔ شادی کی رسم و حکوم و حرام سے منائی گئی۔ گانے کی مغل جنی۔ بزرگوں نے ایک بند کمرے میں اساتذہ اور خواجہ حافظ کا کلام سننا۔ انٹنس میں محمد اقبال کی کامیابی کی خبر بھی دوران تقریب ہی میں گجرات پہنچی۔ بارات ایک رات گجرات ٹھہری۔ دوسرے روز محمد اقبال دہن کو لے کر سیالکوٹ آگئے۔ اعزاز اور قرباً نے خوش آمدید کہا۔ مبارک بادوی۔ محترمہ کرم بی بی بیان کرتی ہیں۔ دو ایک روز بڑی رونق رہی۔ ہم بار بار دہن دیکھنے جاتیں۔ ۱۸۹۸ء میں آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ پھر معراج بیگم محمد اقبال کو اس بچی سے بڑی محبت تھی۔ معراج بیگم اے ارک توبر ۱۹۱۵ء کم عمری میں فوت ہو گئیں۔

**۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۵ء تک محمد اقبال سیالکوٹ ہی میں رہے۔ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک دوران ملازمت میں جب بھائی دروازہ میں قیام تھا والدہ آفتاب اقبال ان کے ساتھ لا ہو نہیں آئیں۔ سیالکوٹ ہی میں رہیں یا پھر گجرات اور گجرات سے سیالکوٹ آنا جانا رہتا۔ محمد اقبال بھی لا ہو رہے اکثر سیالکوٹ جاتے بلکہ گجرات بھی۔ اسی زمانے کی ایک غزل ہے:**

ہو گیا اقبال قیدی مغلی گجرات کا

کام کرتے ہیں یہاں انسان بھی صیاد کا

معلوم ہوتا ہے یہوی سے کشیدگی کی ابتداء انہی دنوں میں ہو گئی تھی۔ یورپ سے واپسی کے بعد اگرچہ وہ احیاناً لا ہو رہا ہے۔ محمد اقبال ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں، مگر ایک دوسرے سے کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آگئی۔ یہ زمانہ محمد اقبال کے لیے بڑے اضطراب کا تھا۔ بغیر طلاق کے چارہ کار نہ رہا۔ لیکن والدہ آفتاب

کی عزت نفس نے گوارانہ کیا۔ محمد اقبال کفالت کے ذمہ دار ہھرے۔ فرمایا شرعاً میرے سامنے دو، ہی راستے تھے طلاق یا کفاف کی ذمہ داری۔ والدہ آفتاب طلاق پر راضی نہ ہوئیں۔ میں نے بخوبی کفاف کی ذمہ داری قبول کر لی۔ چنانچہ ایک مقررہ رقم ہر ہیئت پنج دیتے۔ حتیٰ کہ آخری علاالت کے دوران میں بھی یہ رقم باقاعدہ روانہ کی جاتی۔ پھر جب علاالت نے طول کھینچا اور مالی دشواریاں بڑھیں تو اس میں تخفیف کرنا پڑی، لیکن رقم کی ترسیل میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری منی آرڈر میرے ہاتھوں سے ہوا۔ میں نے <sup>لائی</sup> تسلیم ارشاد کر دی۔<sup>۳۹</sup>

محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں طرح طرح کی افسانہ طرازیاں کی گئیں، جو سب کی سب غلط ہیں۔ بے شک یہ شادی ناکام رہی لیکن اس کی وجہ ایک ہی تھی اور وہ طبائع کی عدم مناسبت علیٰ ہذا خاندانی حالات میں تقاضا۔ میں سمجھتا ہوں رشتہ عجلت میں ہوا۔ طرفین نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ بناہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدہ آفتاب کا اندازِ طبیعت دوسرے اقبال کی پروٹش، حالات بگڑتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سید حسین شاہ کی کوششیں بھی کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل آئے، ناکام رہیں۔ محمد اقبال پونکہ اس معاملے میں حق بجانب تھے، لہذا شاہ صاحب اور ان کے دوستوں نے ان کی انصاف پسندی کو دیکھتے ہوتے پھر بھی اس میں دخل نہیں دیا۔ انھیں احساس تھا کہ محمد اقبال کی وسعت قلب اور خیر اندیشی کے باوجود ان کی باتوں کو ٹھکرایا جا رہا ہے۔ یہاں گوار صورت حال بالآخر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ سوانح نگار کی ذمہ داری اس باب میں اگرچہ اس سے زیادہ نہیں کہ اس شادی نے جو بھی صورت احتیار کی اس کی ناکامی کے حقیقی اسباب، علیٰ ہذا اس باب میں طرفین کی جو روش رہی، بقدر ضرورت ٹھیک ٹھیک بیان کر دے۔ شادی ایک نجی معاملہ ہے۔ کئی شادیاں ناکام رہتی ہیں جن میں میاں بیوی اور ان کے اعزاء اور قربا چھوٹی بڑی کئی ایک نا انصافیوں اور غلطیوں کے مرکب ہو جاتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ اس قسم کے نجی بلکہ انتہائی نجی معاملات میں بے جا تھس، قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے احتراز ہی واجب ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض طبائع کسی ذاتی خلافت یا نفیاتی محکم کے زیر اثر اس میں طرح طرح سے میں متخ نکلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ملامت کرتے اور سنی سنائی باتوں کی بنا پر بڑے غلط متنج قائم کر لیتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی<sup>۴۰</sup> ”جس طرح شرفاء کے محلے میں بعض او باش ہوا کرتے ہیں، جن کا کام تاکنا جھانکنا ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح کچھ ادبی او باش

ہوتے ہیں جن کی ساری دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی خالص شخصی زندگی کا کھوج لگایا جائے اور اسے مزے لے لے کر نمک مرچ لگا کر بیان کیا جائے۔ ”محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں بھی اکثر ایسی باتیں کہی گئیں جو سرتاسر بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کی ذاتی معلومات کا تعلق ہے اسے یہ کہنے میں باک نہیں کہ عہد آنہ ہی، بہ سب نامناسب مزاج اور افتاد طبیعت گجرات نے اس معاملے میں جو روشن اختیار کی سرتاسر غلط تھی۔ آفتاب اقبال بھی بھٹک گئے۔ باپ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ الزام تراشیوں سے کام لیا گیا۔ بہر حال یہ امر قبل ذکر ہے اور یوں بہت سی غلط فہمیوں اور بے سرو پاروایات کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ محمد اقبال کے برادر نبیقی کپتان شیخ غلام محمد کے صاحبزادے شیخ محمد مسعود سے، جن کا افسوس ہے جوانی ہی میں انتقال ہو گیا، راقم الحروف کے ذاتی تعلقات تھے۔ شیخ محمد مسعود محمد اقبال کی گود میں کھیلے۔ علی بخش ان کا بڑا خیال رکھتا۔ مسعود مرحوم اور ان کے اعزاز نے کبھی ان کے خلاف زبان شکایت نہیں کھوئی۔ راقم الحروف کا ان سے شب و روز کا ملنا تھا۔ انھوں نے اپنے پھوپھا کا ذکر ہمیشہ عزت اور احترام سے کیا۔ کریں خواجہ عبدالرشید بھی کہ ان کے قرابت داروں میں ہیں، لکھ چکے ہیں کہ محمد اقبال والدہ آفتاب کا بڑا خیال رکھتے۔ ان کی عزت کرتے۔ اہل ڈاکٹر محمد باقر والدہ آفتاب کے قریبی عزیز بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔ والدہ آفتاب کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ہبہ نامہ اور وصیت پر بھی محض اعتراض کی خاطر اعتراض کیا گیا۔ ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہیں ہے، نہ ان سے کسی کی حق تلفی مقصود۔ اعتراض یہ ہے کہ وصیت میں آفتاب اقبال کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ محمد اقبال نے نظر بر حالات جو کچھ کیا تھیک کیا۔ موصی کو یوں بھی اختیار ہے جس کے حق میں چاہے وصیت کرے، بشرطیکہ اس طرح کوئی نا انصافی نہ ہو۔ چنانچہ آفتاب اقبال کی کسی پہلو سے حق تلفی نہیں ہوئی۔ وہ خود ہی باپ سے کٹ چکے تھے۔ یہی معاملہ ہبہ نامے کا ہے جس کا ذکر آگے پل کر پھر آئے گا۔

آفتاب اقبال کراچی میں مقیم بڑے اطمینان اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہر شریں۔ انگلستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پائی۔

## ۱۱۔ سیالکوٹ سے لاہور

۱۸۹۵ء میں محمد اقبال سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تین چار

برس کی عمر تھی جب انھیں مسجد میں بھایا گیا تو ۱۹۸۱ء یا ۳۹۸۱ء سے ۱۸۹۵ء تک بارہ تیرہ برس میں ان کی تعلیم و تربیت جس خوبی سے ہوئی۔ میر حسن نے ان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا اندازہ جس صحت سے کیا، ان کی وہنی اور اخلاقی نشوونما کا سلسلہ جس خوبی سے جاری رہا، ایک ایسا کٹھن اور مشکل کام تھا جس میں میر حسن کی بصیرت اور میر حسن کی محنت نے ایک ایسی عبقریت کو، جسے اگر کوئی رہنماء تھا نہ ملتا تو شاید اس کا رخ صحت سے متعین نہ ہو سکتا، صحیح راستے پر لگا دیا۔ میر حسن کے ہاتھوں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طوفان خیز دریا کے بہاؤ کو جو نہ معلوم جوش میں آ کر اطراف و جواب میں کس طرف نکل جاتا، کوئی اندیشہ ناک صورت اختیار کر لیتا، قابو میں لا کر اس سمت میں موڑ دیا جس سے اس کی طوفانی کیفیت تو جاتی رہی، لیکن اس کے زور، تیزی اور تندری میں کوئی فرق نہ آیا۔ محمد اقبال آگے چل کر جو کچھ بنے، شعر و فلسفہ میں جن بلند یوں پر پہنچے، ان کی خداداد قابلیتوں کا اظہار جس خوبی سے ہوا یہ ان کے نبوغ اور فطانت کا کوئی اتفاقی اور غیر متوقع نتیجہ نہیں تھا۔ نہ دفعتاً ان کے دل و دماغ کا رنگ بدلا، نہ دفعتاً ان کے خیالات نے کروٹ لی۔ نہ عہد بے عہد نقطہ نظر بدلتا چلا گیا۔ نہ دفعتاً ایک عظیم شاعر اور مفکر کی حیثیت سے چھا گئے۔ جیسے زمین سے دفعۃ کوئی مادہ پھوٹ پڑے، ایسا ہر گز نہیں ہوا۔ برکس اس کے محمد اقبال نے جب ہوش سنجala، مسجد میں بیٹھے، میر حسن کی شاگردی اختیار کی، بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا، کھلیل کود اور سیر و فرج کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کرتے رہے، ۱۸۹۵ء تک یہ سب مرحل ایک طبعی اور تدریجی امر کی طرح کامیابی سے طے ہوتے رہے جن میں جیسے کہ باپ کی تمبا اور میر حسن کا خیال تھا ان کے ذہن کی نشوونما حسب توقع جاری رہی۔ نظر میں وسعت پیدا ہوتی گئی، فکر میں گہرائی، احساس میں تو انائی۔ ذوق و تھن خداداد تھا، علم و حکمت سے دلی شغف، شب روز اس میں انہاک۔ مسائل کا فہم، حقائق کا تجسس۔ اس پر ان کا ایمان و یقین، اسلام کی محبت، تاریخ سے شغف، تہذیب و تمدن کا روز افزول مطالعہ، امت اور اس کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی مکومی اور زیوں حالی کا احساس، ایک ایک بات ان کے دل میں اتر رہی تھی۔ پھر یہ شریعت کا پاس، یہ طریقت سے لگا دے، یہ عشق رسول، یہ تآدب بہ آداب محمدیہ، یہ توحید و رسالت سے تمک، محمد اقبال کی سیرت و کردار۔ محمد اقبال کی دعوت اور پیغام کے وہ سب عناصر جن کی نشوونما سے محمد اقبال بالآخر

اقبال بنے، ترجمان حقیقت کھلائے، قوم نے ان کو حکیمِ الامت، داناۓ راز، شاعرِ مشرق کن کن ناموں سے یاد نہیں کیا، یہ سب ان کے دل و دماغ کی تشقیل میں حصہ لے رہے تھے۔ سیالکوٹ میں محمد اقبال کو مکتب کی کرامت حاصل تھی فیضانِ نظر بھی۔

لیکن یہ جو کچھ تھا ایک تمہید، ایک اساس اور ایک ابتداء جس میں شروع ہی سے انہا کا رنگ جھلک رہا تھا۔ کبھی امید افزاء تھی یہ تمہید اور کیسی محکم یہ اساس، جیسے میر حسن کی نگاہیں ان کے مستقبل کو دیکھ رہی ہوں۔ یہ سیالکوٹ میں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت کا وہ دور ہے جس میں ان کے دل و دماغ کی تربیت ہوئی۔ سیرت و کردار اور ایمان و بیقین کی پروش کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شخصیت جنم لے رہی تھی۔ لیکن افسوس ہے محمد اقبال کی زندگی کے اس تشقیلی دور کی اہمیت کو بہت کم سمجھا گیا۔ کچھ بسبب بے توہینی کچھ معلومات کی کمی اور کچھ اس وجہ سے کہ محمد اقبال جو کچھ بنے، ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز جس خوبی سے ہوا، اس کے مدرج جس کامیابی سے طے ہوئے، بعینہ الگستان روائی سے پہلے سیالکوٹ اور لاہور میں ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کی جو صورت تھی، شاعری جو رنگ اختیار کر رہی تھی، یورپ سے واپس آ کر انہوں نے اپنی دعوت اور پیغام کو جس خوبی سے پیش کیا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جن پر نفیتی اعتبار سے کبھی غور ہی نہیں کیا گیا۔ محمد اقبال کی زندگی کے اس تشقیلی دور کو باعتبار ان کی تعلیم و تربیت اور ذات سمعی و دواعش کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ جو کچھ کہا گیا کبھی ایک کبھی دوسرے نقطے نظر سے، کبھی ایک رائے قائم ہوئی، کبھی دوسری۔ حالانکہ سیالکوٹ ہو یا لاہور ان کے ذہن نے جو رخ اختیار کیا اس میں ایک تسلسل ہے، ایک باقاعدگی، ایک رابط، جس میں ان کے خیالات اور تصورات کی کڑیاں ایک دوسرے سے نہایت خوبی سے مل جاتی ہیں۔ یہ حقیقت سامنے رہے تو محمد اقبال کی شخصیت، محمد اقبال کے افکار، محمد اقبال کی شاعری حتیٰ کہ یہ شاعری جس پیغام کا ذریعہ ہی، اسلام کی ترجمانی انہوں نے جو موقف اختیار کیا، اس کے اخلاقی، روحاںی، سیاسی، اجتماعی نصب اعین کو ماضی، حال اور مستقبل کی رعایت سے جس طرح اجرا کیا۔ اس کا رشتہ انسان، عالم انسانی، عصر حاضر، اس کے مسائل اور حقائق سے جس خوبی سے جوڑا، اسلامیان ہند کے مستقبل ہی نہیں، عالم اسلام کی نشأۃ الثانیّۃ کے لیے جو راستہ تجویز کیا اس کا ایک ایک پہلو بذریعہ اور پر ترتیب ہمارے سامنے ہوگا، اس میں کوئی تضاد ہوگا، نہ تخلاف، نہ اسلام سے باہر کسی دوسرے سرچشمے سے اثر پذیری، نہ حوادث زمانہ اور انقلابات سے کہ عالم انسانی کا گزر جس اضطراب اور بے چینی سے

ہو رہا تھا۔ فردا ورمعاشرے میں جو بنیادی تغیرات رونما تھے، دنیا بانخصوص دنیاۓ مغرب انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں جس طرح سوچ رہی تھی، معاشرہ جس طرح زیر دز بر ہوا، بساط سیاست ڈگر گوں اس کا کوئی وقت رہا۔ ہاں تحقیق و مطالعہ ہے۔ کدو کاوش ہے، جتو ہے مشرق و مغرب پر نظر ہے۔ ماضی اور حال کو دیکھ رہے ہیں۔ سوچتے ہیں میں مستقبل ہمیں کس طرف لیے جا رہا ہے اور اس سوچ میں ان کا اپنا ایک نقطہ نظر جس میں دوسروں سے اختلاف بھی ہے، اتفاق بھی۔ ہمدردی بھی ہے رواداری بھی۔ لیکن زلہ ربانی نہیں ہے نہ خوش چینی۔ نہ جذبات و احساسات کا بے قابو اظہار، نہ افکار و تصورات کی، ہنگامی جولا نیاں۔ بر عکس اس کے ان میں ایک ہم آہنگی ہے۔ ایک اعتدال اور توازن، ربط اور تسلیم۔ محمد اقبال کی نظر شروع ہی سے انسان اور انسانیت پر تھی اور یہ ان کی اسلامی تربیت کا قدرتی نتیجہ۔ شروع ہی سے نوع انسانی کی محبت سے سرشار، اس کے اتحاد اور ایک جانی کے آرزومند جس میں انہوں نے کسی نسلی اور وطنی تفریق کو جگہ دی نہ جغرافیائی اور انسانی تھببات، نہ مذہب اور ملت کا امتیاز ان کے لیے سد راہ بنا، نہ اقوام و امم کی زندگی۔ ان کی طبیعت اور مزاج، طور طریق اور رسم و راہ کا اختلاف کوئی مسئلہ کہ اسے دیکھ کر اپنا موقف بدل دیں۔ لہذا یہ انسان اور انسانیت کا مستقبل ہو، یا اس کی غایت مقصد کے بارے جو نصب الاعین قائم کیا اس میں سرفراز نہ آیا۔ وہ اس نزع و جدال، اس افتراق و شقاق، تعصّب اور تنگ نظری، اس غصب و تغلب اور جنگ و پیکار کو دیکھ رہے تھے جس کا مشاہدہ ہم تاریخ میں کرتے ہیں۔ جس کے ہولناک مناظر انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن اس کے باوجود کبھی زندگی سے بدل ہوتے، نہ مایوس، وہ جانتے تھے ان آلام و مصائب کے باوجود فطرت کا خفیٰ ہاتھ سب کو ایک کر رہا ہے۔ سب کی منزل ایک ہے۔ سب اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تفریقات اور امتیازات مٹ رہے ہیں، وہ زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں جو نوع انسانی نے بسبب جہالت اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں۔ محمد اقبال کو خوب احساس تھا کہ تاریخ کا عمل بڑا سست اور صبر آزماء ہے، انسان کا رشتہ تقدیر خود اس کے ہاتھ میں۔ ایمان و یقین، ہمت اور حوصلہ، محنت اور کوشش، امید و اعتماد اس کی شرط ضروری۔ محمد اقبال کا گزر جن احوال و واردات سے ہوا، شب و روز جس طرح غور و فکر سے کام لیا، ایک سے ایک کھن مرحلہ طے کیا اس میں اسلام ہی نے ان کی رہنمائی کی۔ اسلام ہی وہ عروۃ الAQی مجاہدین کے سہارے وہ کامیابی سے آگے بڑھے۔ محمد اقبال کی زندگی کا اس نجح پر مطالعہ کہ اس کے ادوار یکے بعد

دیگرے ہمارے سامنے ہوں، مثلاً بھی اس کا تشكیلی دور جیسا تفصیل طلب اور اہم ہے اگرچہ اس کی طرف سوانح نگار اشارہ ہی کر سکتا ہے قطع نظر ہرگز نہیں کر سکتا۔

لہذا سوانح نگار اشارہ ہی کہے گا کہ محمد اقبال کی زندگی میں سیالکوٹ کا تعلیمی دور ایک ابتداء اور ایک تمہید تو تھا مگر ایک اساس بھی۔ ایک چراغ جو ماں باپ کی دل سوزی اور میر حسن کے ہاتھوں روشن ہوا۔ ایک تیج جو بویا گیا۔ اس تیج کی آبیاری جس خوبی سے ہوئی، یہ تیج رفتہ رفتہ بڑھنے اور پھیلنے لگا۔ ایک عظیم اور تناور شجر کی طرح فضایں بلند ہوا، اس پر چھا گیا۔ اس سے طرح طرح کی شاخیں پھوٹیں، اس میں رنگارنگ کے پھول کھلے، تا آنکہ اس نے سارے کے سارے گلستان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس میں طرح طرح سے بہار آئی۔ طرح طرح سے اس کی شان و شوکت، حسن و لکشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ تھکے ماندے اس کے سامنے میں بیٹھے۔ راہ گیروں نے اس سے منزل کا راستہ پایا۔ بڑے بڑے طوفانوں اور بڑی بڑی تیز و تند ہواوں نے اسے تیخ و ہن سے ہلانا چاہا۔ بڑی بڑی آندھیاں اٹھیں، سیلاں آئے لیکن اس کی جڑیں جس زمین میں پوسٹ تھیں، گھہداشت جس خوبی سے ہوئی تھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ملا۔ روز بروز مضبوط، مضبوط سے مضبوط اور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ جیسے کلمہ حق، بمصداق اصلہ ثابت و فرع ہافی السما۔

یوں وہ دیا بھی جو ماں باپ کی توجہ اور استاد کے ہاتھوں روشن ہوا اس کی روشنی لختہ بڑھتی اور تیز ہوتی چلی گئی۔ نہ ہوا میں اسے گل کر سکیں، نہ حریفانہ پھونکیں بجھا سکیں، نہ کسی غیر کا دامن، حالانکہ دامن بہت تھے۔ بلکہ اس کے اس کی روشنی پھیلیق ہی چلی گئی، تا آنکہ فضا اس سے منور ہو گئی۔ افق بچمگا اٹھے۔ ظلمت چھٹ گئی، امید و اعتماد اور ایمان و یقین کی قند میں روشن ہو گئی۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا آپ ہی آپ نہیں ہو گیا۔ اس کا سبب تھا میر حسن کا رہنمہ ہاتھ، میاں جی کی گھہداشت۔ محمد اقبال کی خدادادقا بلقیں، دل و دماغ کا جو ہر، ان کی جودت طبع، ذہن رسما، شوہی اندیشہ، فکر و وجہان، ذوق و شوق، بصیرت اور فراست، ایمان اور یقین۔ یہ ایک طویل سفر تھا جسے محمد اقبال نے بخوبی و بہت اور عزم و استقامت سے طے کیا اس راستے میں کسی موڑ آئے، کئی تیچ و خم، کئی مشکلیں، کئی صعوبتیں، کئی رکاوٹیں محمد اقبال کے لیے بھی کئی لغزشیں تھیں۔ کئی ترغیبات، کئی تحریکات، آتے جاتے، گزرتے ہوئے خیال، ثبت، منفی، کئی انداز جنوں۔ اس سفر میں تشكیل بھی تھا، تذبذب بھی۔ ظن و قیاس، بے یقینی، بے دلی، اندیشے، وسوسے، او بام اور

اضطراب بھی۔ بے چینی کی راتیں، پریشانی اور بے اطمینانی کے دن۔ دیدہ ترکی بے خوابیوں کے ساتھ ساتھ دل کی پوشیدہ بیتاپیاں، نالہ نیم شب کا نیاز، خلوت و انجمان کا گدراز، انگلیں، آرزوئیں امیدیں، جنتجوئیں۔ گمانوں کے لشکر، یقین کا ثبات<sup>۱۵۱</sup> یہ سب اس سفر، اس دشوار گزار راستے کے ایک نہیں کئی مراحل تھے جو محمد اقبال نے ایمان و یقین کے سہارے طے کیے۔ اس میں ایاب و ذہاب بھی تھا، ٹھہرنا اور کتنا بھی۔ محمد اقبال اس سفر میں باحتیاط آگے بڑھے تو وہ ابتداء، وہ تمہید اور وہ اساس جو سیالکوٹ میں قائم ہوئی انھیں منزل بہرzel آگے لے گئی۔ تا آنکہ انھوں نے گوہر مقصود پالیا۔ استاد کی محنت ٹھکانے لگی۔ باپ کی آرزوئیں برآئیں۔

بایں ہمه محمد اقبال کی زندگی کے اس تشکیلی دور سے بہت کم اعتنا کیا گیا۔ حالانکہ اہل نظر خوب جانتے ہیں یہی دور ہے جس میں انسان کو جو کچھ بننا ہوتا ہے اس کی اساس مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے، بلکہ اس کے کچھ کچھ آثار بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ اس کے دل و دماغ کا رخ کس طرف ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے سیالکوٹ میں ان کی تعلیمی زندگی کے دوران میں کئی ایک شواہد مل جاتے ہیں اور جو شاید سطور بالا میں ایک حد تک قارئین کے سامنے ہوں گے۔ مثلاً ان کا یہ اعتراف ”میں ہوں میر حسن کی تصنیف“، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروعی کا یہ کہنا بڑا معنی خیز ہے: بے شک وہ سونا تھے لیکن اس سونے کو تاب کس نے دی، سونا کس کان سے اکلا؟<sup>۱۵۲</sup> یہ اس دور سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے کہ محمد اقبال کے ڈھنی ارتقا، محمد اقبال کے فکر و نظر، محمد اقبال کے درستی، اسلام اور اسلامی تعلیمات کی ترجمانی، حتیٰ کہ ہندی اسلامی سیاست میں انھوں نے جو موقف اختیار کیا اس کی توجیہ میں ایک نہیں متعدد نظر یہ قائم کیے گئے۔ جیسے ان کی طبیعت میں دفعتاً، کوئی انقلاب آیا، دفعتاً کوئی رعمل ہوا، دفعتاً کوئی اثر قبول کر لیا۔ سوال کیا جاتا ہے کیا وہ علوم دین سے واقف تھے؟ انھوں نے کسی مرد کامل کے ہاتھ پر بیعت کی؟ وہ صوفی تھے، فلسفی تھے، شاعر تھے، ملائیں تھے تو کیا تھے؟ رند تھے، قلندر تھے، ان کا مسلک کیا تھا؟ ان میں وسعت نظر تھی یا تعصباً اور تنگ نظری؟ وہ انسان دوست تھے۔ آفاقیت پسند تھے، انسانیت کے طرف دار یا ایک محدود اور علیحدگی پسند قومیت کے علمبردار؟ کیا ان میں یہ جرأۃ تھی کہ عصر حاضر کے انسان نے جس طرح سیاسی، معاشری دستبر اور شہنشاہیت، استعمار، سرمایہ داری اور جاگیر داری کے بت توڑے اور توڑ رہا ہے اس کا ساتھ دیں یا یاضی کے سایوں اور تاریکیوں میں گم رجعت پسندی کی دعوت دے

رہے تھے؟ خردمن تھے، وجدان کو عقل پر ترجیح دیتے یا عقل کی بہم گیری کے قائل؟ ان میں دینی بصیرت پیدا ہوئی تو کب؟ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سمجھے تو کب؟ یہ بات کب ان کی سمجھ میں آئی کہ نوع انسان کا مستقبل بذرخشنده ہے۔ کب انسان کی عظمت اور مرتبہ و مقام کا احساس پیدا ہوا۔ کب نوع انسانی کی محبت نے انھیں اپنی طرف کھینچا؟ پھر یہ اسلام سے شیفگی، یہ توحید و رسالت میں ایمان و یقین، یہ عشق رسول، یہ دردگزار، یہ امت کے لیے دل سوزی، یہ عالم اسلام کی آزادی، یہ اس کی نشأۃ الشانیہ مرتبط کی آرزو، یہ اقامت دین پر اصرار، یہ سب کب اور کیسے ہوا؟ یوں اس بحث میں جو غلط سلطنت مکمل مرتبط کیے جاتے ہیں، ان کے اشعار، تحریروں اور تقریروں سے جو معنی نکالے جاتے ہیں ہرگز نہیں نکلتے اور وجہ اس کی یہی اس دور سے بے اعتنائی جس کی طرف راقم الحروف نے جہاں تک ممکن تھا مختصر اشارے کر دیے ہیں اور، کرتا رہے گا۔

محمد اقبال بلاشبہ ایک نابغہ تھے میر حسن بھی نابغ۔ آرنلڈ اور میک ٹیگر بیٹ کے بونغ میں بھی کلام نہیں۔ لیکن بونغ جب ہی بونغ ہے کہ اس میں اتنج ہو، جدت ہو، طباعی ہو، اچھتا دفکر ہو۔ وقت نظر، یعنی اس کا اپنا ایک رنگ ہو۔ بونغ ایک کاؤش ہے، ایک اکشاف، الکشاف۔ کسی دوسرے کا عکس یا صدائے بازگشت نہیں۔ محمد اقبال اگر میر حسن کے آگے زبان نہ کھولتے، آرنلڈ کی شاگردی پر فخر کرتے، میک ٹیگر کے قائل تو میر حسن بھی محمد اقبال کے دل و دماغ کی خوبیوں کے معرف، آرنلڈ کہتے میں محمد اقبال سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ میک ٹیگر سے دوستی تھی، ایک کے بعد دوسرے مسئلے پر گفتگو ہوتی۔ خوش کہ محمد اقبال کا ان سے رشتہ تلمذ ہوا۔

پھر ایک خیال ہے جو رہ کے دل میں آتا ہے۔ نہیں کہنا چاہتا مگر کہنے سے رک نہیں سکتا اور وہ یہ کہ محمد اقبال کے ذہنی ارتقا کی ابتداء اس زمانے میں ہوئی جب برطانوی حکومت کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا لیکن ادھراس کی تیکمیل ہوئی اور ادھرس کار برطانیہ کا زوال شروع ہو گیا جس کی انھوں نے پیش گوئی بھی کر دی۔ ۱۹۴۷ء فرمایا：“زوال پذیر حکومتیں چھوٹی چھوٹی مصلحتوں پر عدل و انصاف کو قربان کر دیتی ہیں۔”

محمد اقبال سیالکوٹ سے لاہور آئے تو اگرچہ ایک نو عمر طالب علم کی حیثیت سے مگر بدیں صورت کہ جہاں سیالکوٹ میں ادبی اور مذہبی انجمنوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ لاہور میں بھی آتے ہی ان کا سکھ ملک خشن میں بیٹھ گیا۔ ان کی علمی قابلیت کا اعتراف ہونے لگا۔

لاہور نے انھیں بڑے ذوق و شوق سے خوش آمدید کہا۔ لاہور کی مغلوں، لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں کی رونق دو بالا ہو گئی۔ ارباب نظر نے انھیں سر اور آنکھوں پر بٹھایا۔ ان کی مدرسہ منزالت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تا آنکہ مولانا عبداللہ عبادی کے جذبہ محبت اور قدردانی نے ان سے کہلوا ہی دیا:

تجھ پر اے لاہور<sup>۱۵۵</sup> نازل ہوں خدا کی رحمتیں

اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے

ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ

تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

یہ ۱۹۳۸ء کے ابتدائی ایام تھے۔ میں حسب معمول چاشت کے قریب حاضر خدمت ہوا۔

شیخ گلاب دین ان کے قدیم دوست اور ہم طلن عیادت کے لیے آئے بیٹھے باقیں کر رہے تھے۔ شیخ صاحب گئے تو فرمایا: ”شاہ صاحب کی بصیرت کے کیا کہنے ان کی رائے کیسی صائب اور نظر کیسی تھی۔“<sup>۱۵۶</sup> شیخ صاحب نے وکالت کی سندی تو کہنے لگے شیخ صاحب لاہور چلے

جائیے، آپ کا مستقبل لاہور سے وابستہ ہے، سیالکوٹ چھوڑ دیجیے۔ شیخ صاحب لاہور آگئے۔ شاہ صاحب نے سچ کہا تھا۔ کس خوبی سے کامیاب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا۔ عزت، دولت، شہرت۔ شاید یہ کہتے وہ خود بھی سوچ رہے ہوں کہ انھیں بھی بالآخر لاہور آنا پڑا۔ لاہور

آئے اور لاہور ہی کو بالآخر یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کا مستقر بنے۔ لاہور سے باہر رہنا انھیں ناگوار تھا۔ دو چار دن گزرتے تو اداس ہو جاتے۔ میں نے عرض کیا لاہور کی خاک میں بڑی

کشش ہے۔ سب لاہور کی طرف کھنچ چلے آتے ہیں۔ لیکن سیالکوٹ کی اور ہی بات ہے۔ سیالکوٹ کی آب و ہوا سے لاہور کو کیا نسبت۔ مسکرا کر فرمایا: ”ٹھیک کہتے ہو۔ کیا اچھا ہوتا اگر

لاہور سیالکوٹ ہوتا۔ سیالکوٹ لاہور“<sup>۱۵۷</sup>

## حوالہ

- ۱ Lebenslauf ۱۹۰۷ء میں۔
- ۲ روزگار فقیر ج ۱، جس ۲۲۹، لیکن یہ تاریخ قطعی نہیں ہے۔ دیکھیے پروفیسر محمد عثمان کی یادداشتیں علامہ اقبال کی ولادت پر مباحثت (زیریغ)۔ خالد ظیہر صوفی، اقبال درون خانہ۔
- ۳ ڈپٹی وزیر علی بیکر امی کے بیان، جن کو سرکار انگریزی اودھ سے سیاکلوٹ لائی، امور ضلع کا انتظام و انصرام بڑی حد تک انھیں کے سپرد تھا۔ سلالیٰ کی شگر میشین سب سے پہلے انھیں کی فرمائش پر سیاکلوٹ آئی اور شیخ نور محمد کے پروردگری گئی۔ لہذا لوگ انھیں نور محمد کا والے بھی کہتے۔ شگر سلالیٰ میشین کل ہی تو ہے۔
- ۴ والد محترم گھر آرہے تھے۔ دیکھا ایک کتاب بھوک سے بے حال ہو رہا ہے۔ رومال میں تھوڑی سی مٹھائی تھی، اس کے آگے رکھ دی۔ رومال ترک کے پانی بھی پلا پایا۔ اس رات خواب میں دیکھا گھر میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں۔ صح اٹھے تو اس یقین کے ساتھ کہ ان کے دن پھر نے والے ہیں۔ پھر بھائی صاحب بھی نوکر ہو گئے۔ سید نذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، جس ۱۹۷، مخلصاً۔ اقبال اکادمی کراچی ۳، ۱۹۶۷ء۔
- ۵ والد محترم نے خواب میں دیکھا، ایک کبوتر بہت اونچا اڑ رہا ہے دفعتاً ان کی جھوٹی میں آگرا۔ یہ خواب میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔ وہ اسے ایک اشارہ نہیں سمجھے۔ سید نذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، جس ۹۵۔
- ۶ سید نذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، ج ۲، زیریغ۔
- ۷ خواجہ محمد عظیم شاہ دیدہ مری، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں گزرے ہیں۔ تاریخ کشمیر کا دوسرا نام ہے۔
- ۸ تاریخ اعظمی، واقعات کشمیر، سنہ تصنیف ۱۷۵۵ء۔
- ۹ اڈوں تحریل کا گام میں ہے، ضلع اسلام آباد (انت ناگ)
- ۱۰ حضرت علامہ کاظم شیخ عطا محمد کے نام، مورخہ ۱۹۲۵ء، دیکھیے صحیفہ مجلہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ شمارہ ۱۶۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ ”اقبال کے اجداد کا سلسہ عالیہ“ ازڈاکٹر محمد باقر، صفحات ۳ و ۴ مع نقل کا لा�صل۔
- ۱۱ ایضاً، شمارہ ۲۵، ۱۹۷۳ء تاریخ وفات ۱۳۵۱ء، عارف باللہ نصر الدین۔
- ۱۲ ولادت ۱۳۲۸ء۔ وفات ۱۳۳۹ء، تاریخ وفات شمس العارفین۔ ریشی سے مراد ہے رشی، (سنکریت رکھی) تارک الدین۔ زاہد و عابد۔ صحیفہ، شمارہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ وہی مضمون۔
- ۱۳ عمر ھا گل رخت بر بست و کشاد

- خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد
- ۱۳۔ عہد حکومت ۱۹۲۰ء اتنا ۱۷۰۰ء۔ یہ سنین اس لیے اہم ہیں کہ ہم انھیں کے حوالے سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حکیم الامت کے آباء و اجداد نے اسلام قبول کیا تو کس زمانے میں۔
- ۱۴۔ صحیفہ مجلہ مجلس ترقی ادب، لاہور، فوق کے نام حکیم الامت کے خط کا اقتباس۔
- ۱۵۔ سین عربی ابجد کا اواں حرف۔
- ۱۶۔ Root مادہ۔
- ۱۷۔ مکتوب مذکور فوق کے نام ص۔ ۲۔ یہ ص ۲ میں ابو محمد حاجی حجی الدین مسکین کی کتاب تحائف الابرار فی ذکر اولیاء اخیار (تاریخ کبیر کشمیر) کا اقتباس۔
- ۱۸۔ عجیب بات ہے کہ پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا پرو خاندان ہے تو سرتچ بہادر سپرو کاجن کے علاوہ کسی پرو خاندان کا سراغ نہیں ملا۔ مسئلہ تھا شیخ اعجاز احمد کی شادی کا کوشش تھی کہ ان کی شادی پرو دوں کے بیہاں ہو۔ دیکھیے اقبال، مجلہ بزم اقبال (انگریزی اشاعت)، اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۲۵۔
- ۱۹۔ فوق اور ان کے تنقیح میں حضرت علامہ کے مکتوب، دیدہ مری اور مسکین کے بیانات اور سلطان زین العابدین کے سنین حکومت سے واقفیت کے باوجود اس غلطی کا اعادہ ہوتا رہا۔ دیکھیے فوق کا مضمون 'ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی محضروں اخ حیات، نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں۔
- ۲۰۔ ضلع سیالکوٹ میں۔
- ۲۱۔ سیدنذر یونیورسٹی، اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۱۶۹۔
- ۲۲۔ ایضاً، ص ۹۲۔
- ۲۳۔ ابو عبد اللہ مولانا غلام حسن، وطن ساہیوال۔ فاروقی شیخ نواب صدیق حسن خاں اور پھر مولوی مرتفعی صاحب سے تلمذ رہا۔ عالم و فاضل، بڑے بزرگ، صاحب کشف۔ مسجد صرافی میں درس دیتے، عقیدت مند اور طلباء حاضر خدمت رہتے۔ مولوی ابراہیم انھیں کے شاگرد رشید تھے۔ میر حسن سے نہایت گہرے روابط تھے۔ تصنیفات متعدد۔ اسلامی معاشرے کے انحطاط کا اس امر سے اندازہ بکھجے کہ اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرسی کی، سیرت و کردار کا یہ عالم کہ مولوی ظفر اقبال دوپہر میں ان سے سبق لیتے۔ ایک روز حاضر خدمت ہوئے تو سور ہے تھے۔ مولوی صاحب کے پاؤں دابنے لگے۔ دوسرے روز مولانا نے پوچھا کل کیوں نہیں آئے کہا آپ آرام فرمار ہے تھے۔ کہنے لگے اچھا! اور پھر اس واقعے سے ایسے متاثر ہوئے کہ دوپہر میں کہی آرام نہ کیا۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو فوت ہوئے۔
- ۲۴۔ سیدنذر یونیورسٹی، اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۹۲۔
- کیا اس کے یہ معنی ہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے، کہ انھیں مولانا غلام حسن کے بیہاں دینیات کی تعلیم کے لیے بھیجنے کی روایت غلط ہے۔ وہ مجید یعنی عمر شاہ کے کتب سے سید ہے میر حسن کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ ان کے والد ماجد کی البتہ یہ خواہش تھی کہ انھیں صرف دینی تعلیم دلوائیں۔ انھوں

نے شاہ صاحب سے جو گویا نہیں اسکول کی تعلیم کے لیے تیار کر رہے تھے، درخواست کی انہیں دینی علوم پڑھائیں، اسکول کی تعلیم نہ دیں۔ جس پر شاہ صاحب نے کہا یہ پچھے مسجد میں نہیں اسکول میں پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے شیخ نور محمد کا خیال ہو کہ اگر شاہ صاحب ان کی درخواست نہ مانیں تو یہی کو مولانا غلام حسن کے درس میں بھیج دیں۔ دونوں صورتوں میں بالآخر وہی ہوا جو شاہ صاحب چاہتے تھے۔

- ۲۵ اپنا، ص ۹۲۔

- ۲۶ یہ مدرسہ کلیسا نے سکٹ لینڈ (Church of Scotland) نے ۱۸۵۹ء میں قائم کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا مدرسہ ۱۸۵۵ء میں قائم ہو چکا تھا۔ امریکن مشن ہائی اسکول کے نام سے United Presbyterian Church of America کی طرف سے۔ سیالکوٹ میں مسیحی بہشیرین کی سرگرمیاں پنجاب میں سرکار انگریزی کے تسلط کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھیں۔

27- Career.

- ۲۷ اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۹۲۔

- ۲۸ ورنیکولار Vernacular یعنی مل - اس زمانے میں تعلیم کی درجہ بندی اس طرح کی گئی تھی: تین سال پر انگری اول، دو سال پر انگری دوم، تین سال مل، دو سال انٹرنس، دو سال ایف۔ اے، دو سال بی۔ اے، ایک یادو سال ایم۔ اے کے لیے۔

- ۲۹ موجودہ عمارت ۱۹۰۹ء میں تعمیر ہوئی کانچ روڈ پر Murray College

31- Faculty.

- ۳۰ سید نذر نیازی: اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۹۲، اقبال اکیڈمی کراچی۔

- ۳۱ اس ملاقات میں ڈاکٹر وحید قریشی راقم الحروف کے شریک سفر تھے۔ مرحومہ کے ارشادات قلمبند کرتے رہے۔ تقریب اس ملاقات کی یہ تھی کہ حکیم الامت کی تاریخ خلافت معلوم کی جائے۔ بزم اقبال کی طرف سے شمول پروفیسر محمد عثمان ممتاز اعزازی بزم اقبال ہم بطور ایک وفد سیالکوٹ پہنچے۔

- ۳۲ ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

شعر خود خواہش آس کرد کہ گردد فن ما

- ۳۳ بقول ڈاکٹر جشید علی رائٹر، حضرت علامہ کے ہم سبق، رشتہ میں خالہ زاد بھائی۔ لیکن ان کے علم و فضل اور کمال شاعری کے ممکن۔ اے پی ایچ۔ ڈی، پروفیسر مرے کانچ، سیالکوٹ، انگریزی میں شعر کہتے۔ کلام چھپ چکا ہے۔

راٹھور مرحوم سے ۱۹۵۲ء میں ملاقات ہوئی۔ مہر مرحوم اور ڈاکٹر عبداللہ چفتائی ساتھ تھے۔ بزم اقبال کی طرف سے ایک وفد کی صورت میں ہم سیالکوٹ پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے سوانح لکھنی ہے تو میر حسن کی لکھیے۔ اقبال میں کیا رکھا ہے وہ ان کے نفس ناطقہ ہی تو تھے اور کیا تھے۔ مہر صاحب تو اس کے بعد میر حسن ہی کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ بات بات پر کہتے اللہ اکبر! میں نے عرض کیا جو آپ فرماتے ہیں اقبال ان کے نفس ناطقہ تھے، تو ان کی سوانح حیات پر قلم اٹھانا اور کہی ضروری ہو جاتا

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

ہے۔ راٹھور صاحب کے بیانات ڈاکٹر عبداللہ چنتائی نے مہر مرحوم کے زیر ہدایات قلمبند کیے جو بزم کے دفتر میں موجود ہیں۔ راٹھور مرحوم کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشیں میرے دوست کلیم اختر صاحب کے پاس محفوظ ہیں جو خود انہوں نے ان سے ملاقات کے بعد مرتب کیں۔ رقم الحروف نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ ان یادداشتوں کو دیکھ کر ایک ہی بات ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ کہ الفضل ما شہدات به الاعداد۔

- 36- My education began with the study of Arabic and Persian. A few year after I joined one of the local schools. *Development of Metaphysics in Persia.*

- ۳۷- سیدنذر یزی نیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۹۲۔

- ۳۸- ایضاً، ج ۲، زیر طبع۔

- ۳۹- خالد نظیر صوفی، اقبال دورن خانہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۷۔

- ۴۰- اسرار خودی:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است  
طرز گفتار دری شیریں تر است

- ۴۱- یوں بھی ایک ایسے ادب کی تشكیل میں جس سے زندگی کو تحریک ہوان کا ذہن عربی ادب کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ لہذا طبعی امر تھا کہ فارسی ہو یا اردو ان کے کلام میں اسلامی ادبیات کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے حیات افروز اثرات کامل غلبہ بڑھتا چلا جائے۔ اسرار خودی میں جب حافظ کی تقدیسے ایک غلط تاثر قائم ہوا تو اس کے ازالے کے لیے درحقیقت شعرو ادبیات اسلامیہ کے عنوان سے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے اے میان کیسہ ات نقہ خن میں صاف کہا:

فکر صالح در ادب می بایت  
رہجت سوئ عرب می بایت

- ۴۲- اسرار خودی:

فارسی از رفتہ اندیشه ام

در خورد با فطرت اندیشه ام

- ۴۳- سیدنذر یزی نیازی: اقبال کے حضور، ج ۲، زیر طبع۔

- ۴۴- ایضاً۔

- ۴۵- انوار اقبال، اقبال اکادمی کراچی، ص ۷۸۔

- ۴۶- سیدنذر یزی نیازی، اقبال کے حضور، ج ۲، زیر طبع۔

- ۴۷- سیالکوٹ میں ان دونوں چار مدرسے تھے: مولانا غلام حسن، مولانا مرتضی اور مولانا مہمل کا مدرسہ۔ چوتھا میر حسن کا۔ پہلے تین مدرسوں میں صرف علوم دین کی تعلیم ہوتی، میر حسن کے مدرسے میں علوم دینی اور

دنیوی دونوں کی۔  
۴۸ - ایچی، ۹۳: ۱۰۔

- ۴۹ - رموز بیخودی: حسن سیرت ملیہ از تادب با آداب محمدیہ است۔  
۵۰ - سید نذر نیازی، اقبال کرے حضور، ج، اص ۲۰، ۲۱ تا ۲۰، ملصا۔  
بال جبریل کے شعر۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب  
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف  
سے اسی واقعے کی یادتازہ ہو جاتی ہے۔

- ۵۱ - سید سلیمان ندوی نے سفر افغانستان میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے نیز دیکھیے: شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ (مکاتیب اقبال)، حصہ دوم، ص ۱۲۰۔ برداشت عظیم بیگم۔ دیکھیے اقبال از عظیم بیگم۔  
۵۲ - سیالکوٹ سے براہ راست کوئی یہیں میل دور گجرات کے پاس۔  
۵۳ - قاضی صاحب موصوف عصر حاضر کے ایک عظیم صوفی بزرگ تھے۔ نواب مشوق یار جنگ بہادر نے جو  
قاضی صاحب کے حلقة ارادت میں شامل تھے، ان کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ نواب فخر یار جنگ  
بہادر اور شیخ الملک حکیم محمد اجمل خان کو بھی ان سے دلی ارادت تھی۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۹۱۹ء میں  
ہوا۔ ان کے زیر اثر سلسلہ قادر یہ دور دور تک پھیل گیا۔  
۵۴ - ماہنامہ ضیائے حرم، اشاعت اپریل ۱۹۷۵ء، سید نور اللہ شاہ قادری کا مضمون بعنوان سلسلہ قادر یہ  
میں علامہ کی بیعت۔ نیز اقبال، اکتوبر ۱۹۵۳ء، اقبال کے بعض حالات۔  
۵۵ - شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، حصہ اول، مکتب، ص ۳۵۔  
۵۶ - جاوید نامہ:

تا غزالی درس اللہ ہو گرفت  
ذکر و فکر از دودمان او گرفت  
۵۷ - شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۶۳۔

- ۵۸ - سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ دوم، ص ۱۳۱۔  
۵۹ - اور جس کا ذکر انہوں نے عظیم بیگم کے نام اپنے خط اور ویسے بھی گفتگوؤں میں کیا ہے۔  
۶۰ - اسرار خودی:

آن نوا پرداز گلزار کہن	گفت ما را از گل رعنا خن
حضرت فلاندر فرماتے ہیں:	
مرجا اے بلبل بارغ خن	از گل رعنا گو با ما خن
۶۱ - بانگ درا؛ والدہ مرحومہ کی یاد میں:	

- زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم  
صحبت مادر میں طفیل سادہ رہ جاتے ہیں ہم  
۲۲۔ صحیفہ، مجلہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ شمارہ ۱۳، ۶۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء۔  
۲۳۔ ايضاً۔  
۲۴۔

مادرِ مخدومہ اقبال رفت  
سوئے جنت زین جہان بے ثبات  
گفت اکبر با دل پر درد و غم  
”رحلتِ مخدومہ“ تاریخ وفات  
۲۵۔ کلیات اکبر، رباعیات و قطعات، حصہ اول، مرتبہ بھیا احسان الحق، بزم اکبر کراچی، ص ۳۸۹۔  
۲۶۔ بانگ درا: والدہ مرحومہ کی یادیں:  
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پبلو مرا  
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا  
۲۷۔ بانگ درا: انجائے مسافر۔  
۲۸۔ سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ دوم، ص ۱۲۲۔  
۲۹۔ مجھے لکھتے ہیں کہ روز گار فقیر میں میری روایات کے علاوہ باقی بیانات کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔  
۳۰۔ ايضاً، ص ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۳، ۱۸۴۔

There is truth in it take refuge in art.

- ۳۱۔ راقم الحروف کے نام، کراچی ۱۹۷۷ء۔  
۳۲۔ وعبد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا۔ الفرقان، ۲۳: ۲۵۔  
۳۳۔ تا تا کہ حسب ضرورت وقت دیکھیں۔ B. Time Piece  
۳۴۔ البقرة: ۱۸۲۔  
۳۵۔ سید نذر نیازی، اقبال کے حضور، سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ اول، ص ۲۰۔  
۳۶۔ یادداشیں بسلسلہ سفریا لکوٹ، بزم اقبال میں محفوظ ہیں۔  
۳۷۔ سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ اول، ص ۵۔  
۳۸۔ بانگ درا: دیباچ، ص ۰، آنحضر غلام علی۔ لیکن شیخ عبدالقار اس بات کو کھول کر بیان نہیں کر سکے۔  
۳۹۔ نیرنگ خیال: اقبال نمبر، نمبر - اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ شیخ آفتاب احمد کا ضمون: علامہ سراج اقبال کے استاد، ص ۸۲۶۲۲۔  
۴۰۔ بقول شاعر:

دریں ادب اگر بود زمزمه محبت  
جمعہ بکتب آورد طفل گریز پائے را  
۸۱۔ نیرنگ خیال: اقبال نمبر، ۱۹۳۲ء، ڈاکٹر ملک راج انند کے انگریزی مضمون اقبال کی شاعری کا اردو ترجمہ، ص ۷۷۔

۸۲۔ محمود نظامی، ملفوظات، ص ۱۵۲۔ پروفیسر عبدالواحد کا مضمون۔

۸۳۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، مکتوب ۳۵۵ بنا معاشرت رحمانی، ص ۳۲۶۔

۸۴۔ بانگ درا؟ انجائے مسافر:

وہ شمع پارگہ خاندان مرتضوی  
رہے گا مثل حرم جس کا آستان مجھ کو

۸۵۔ اقبال کے حضور، نج، زیر طبع۔

دیکھیے بانگ درا کی نظر موانئ غم اور زیور عجم۔

غم دو قم است اے برادر گوش کن  
شعلہ ما را چراغ ہوش کن  
یک غم است آن غم کی آدم را خورد  
آن غم دیگر کہ ہر غم را خورد  
آن غم دیگر کہ ما را ہدم است  
جان ما از صحبت او بے غم است

۸۶۔ سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، زیر طبع۔

۸۷۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، مکتوب بنا مصدق حسین۔ ۱۹۲۷ء، ص ۱۰۰، ترجمہ حسن الدین نے کیا۔  
عنوان ہے فلسفہ عجم۔

۸۸۔ سید وحید الدین، روزگار فقیر، حصہ دوم، ص ۲۰۹۔

۸۹۔ ایضاً، حصہ اول، ص ۲۳-۲۴ اور ۱۰۹۔

۹۰۔ بقول ڈاکٹر جشید علی راشور، یادداشتیں۔

۹۱۔ نیرنگ خیال، اقبال نمبر، نومبر۔ ۱۹۳۳ء، ص ۷۵۔

۹۲۔ سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، جلد ا، ص ۲۵।

۹۳۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے:

مرا پھر دنائے روشن شہاب  
دو اندر ز فرمود پر روئے آب  
کیے این کہ بر خویش خود بیں مباش  
وگر آں کہ بر غیر بد بیں مباش

- ۹۳- سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ دوم، جس ۱۹۵۵ء۔
- ۹۴- ایضاً، حصہ اول، جس ۳۸ء۔
- ۹۵- سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، جس ۹۲ء۔
- 97- Sagalaia Sakala.
- 98- Menander (malinda) Euthydamon.
- 99- Mihragala.
- 100- *Sialkot District Gazetteer*, 1967.
- ۱۰۱- جس کے بعد سیالکوٹ کی تباہی اور بر بادی میں اضافہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ مغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا۔ صرف موری دروازے کا نام باقی رہ گیا۔ جہاں کیر کے تیر کر دہ شیش محل کی تو یاد بھی باقی نہیں۔
- ۱۰۲- مقتوب میر حسن محمد دین فوق کے نام، نقوش، مکاتیب نمبر، جس ۱۹۶۰ء۔
- 103- Boundary Commission.
- ۱۰۳- امام علی حق کا مزار امام صاحب کہلاتا ہے۔ منڈی میں اسکاچ مشن ہائی اسکول اور اس کے یونیورسٹی میں امریکن مشن ہائی اسکول اور تحریصیل کی عمارت تعمیر ہوئی۔ پاس ہی پانی کا تالاب تحمل عبدالحکیم کا تعمیر کردہ۔
- ۱۰۴- بشمول چھاؤنی کی کوئی پچاپاں ہزار. *Sialkot District Gazetteer*, 1967.
- ۱۰۵- سیالکوٹ اور اس کے اطراف میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں ۱۸۵۷ء سے پہلے یعنی پنجاب پر برطانوی قبضے کے ساتھ ہی شروع ہو گئیں۔ ۱۸۵۵ء ہی سے۔
- ۱۰۶- یہ بجائے خود ایک اہم موضوع ہے۔ میر حسن فوق کو لکھ چکے تھے کہ سکھ گردی میں سیالکوٹ پر کیے تباہی آئی۔ کتب خانے نذر آش کر دیے گئے۔ علماء نے آس پاس کی بستیوں میں پناہ لی۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد بھی علم و فضل سے محروم ہوتی چلی گئی کچھ بچی کچھ کتابیں یاد گارہ گئیں سید نور محمد قادری جن کا خاندان گلی چوڑی گراں ہی کے قریب آباد اپنے جدا مجدد سید چنان شاہ کے بعد سیالکوٹ سے نکل گیا۔ راقم الحروف کو ان کا نیاز حاصل ہے۔ انھوں نے بکمال شفقت اس زمانے کے اہل قلم کے حالات پر گفتگو کی ان کی تحریریں اور مسودات دکھائے جن میں مولانا محمد حسن فیضی جھنون نے عربی میں ایک قصیدہ لکھا۔ سید ظہور اللہ شاہ اور مولوی عبدالکریم اشرافی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
- ۱۰۷- سوانح علامہ عبدالکریم سیالکوٹی از فوق، محمد اقبال کا تبصرہ، ج ۳، دسمبر ۱۹۲۲ء۔ دیکھیے مقالات اقبال از سید عبدالواحد معین، ج ۱، ۲۰۱-۲۱۱ء۔
- ۱۰۸- یاشاید ہیں۔
- ۱۰۹- بانگ درا۔
- ۱۱۰- یادِ عبد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے  
میرا مانسی میرے استقبال کی تغیر ہے
- ۱۱۱- سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، جس ۲۵-۲۲ء۔
- ۱۱۲- ایضاً۔

- ۱۱۳۔ سید وحید الدین، روز گار فقیر، ج، اس ۱۲۷۔  
 ۱۱۴۔ ایضاً، ج، ۲، ص ۱۵۷۔  
 ۱۱۵۔ بانگ درا: سر سید کی لوح تربت۔  
 ۱۱۶۔ بقول لمیم حیر، نفیات میں۔  
 ۱۱۷۔ بانگ درا: عہد طفیل۔

تھے دیار تو زمین و آسمان میرے لیے  
 وعیت آغوش مادر اک جہاں میرے لیے  
 آنکھ وقف دید تھی لب مائل گفتار تھا  
 دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

۱۱۸۔ بال جبریل:

زمتنی ہوا میں گرچہ تھی ششیر کی تیزی  
 نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

۱۱۹۔ کلیم اختر، یادداشتیں۔

۱۲۰۔ رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشته، سید محمد ذکی کا بیان اقبال کا بیچپن، ص ۲۲۶ اور ص ۲۶۷، ملخصاً۔

۱۲۱۔ سید نذر نیازی، اقبال کے حضور، ج، اس ۱۲۸۔

۱۲۲۔ پوری نظم کے لیے، دیکھیے ان کا کوئی مجموعہ کلام۔

۱۲۳۔ مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں، بزم اقبال لاہور۔

۱۲۴۔ نیاز الدین خاں کے صاحبزادے۔ راقم الحروف کے ہم جماعت۔ نقیش الدین خاں کی یادداشتیں  
 بعنوان گرامی، نیاز، اقبال، تاحال طباعت نہیں ہوئی۔ مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔

۱۲۵۔ گونئے فاوست Faust کی تمهیدی کی۔

۱۲۶۔ رحیم بخش شاہین، Mementos of Iqbal، ص ۲۷۷، لفہنیت کرنی کے اے رشید کا مضمون Newlight از Gabriel's Wingsaz on the Early Life of Iqbal

۱۲۷۔ اقبال ریویو، مجہ اقبال اکیڈمی، کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء۔

۱۲۸۔ اقبال، مجلہ بزم اقبال، لاہور۔ میر نیرنگ کا مضمون اقبال کے بعض حالات۔

۱۲۹۔ شاہین، اوراق گم گشته، ص ۲۷۰۔

۱۳۰۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ دوم، مکتب ۱۲۱، ہور خ ۲۲، اگست ۱۹۰۸ء۔

۱۳۱۔ سید وحید الدین، روز گار فقیر۔

۱۳۲۔ بانگ درا: دیباچا ز شیخ عبدالقادر۔

۱۳۳۔ ایضاً۔

۱۳۴۔ دیکھیے روز گار فقیر، حصہ نظم۔

- ۱۳۵ - نیم و تنشہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازان  
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغِ سخنداں پر
- ۱۳۶ - شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول۔
- ۱۳۷ - تھی حقیقت سے نہ غلت فکر کی پرواز میں  
آنکھ طاڑ کی نشمنی پر رہی پرواز میں
- ۱۳۸ - سید نذری نیازی، بہارِ داغ، دیباچہ۔
- ۱۳۹ - اقبال، مجلہِ بزمِ اقبال، شمارہ ۱۹۶۰ء، عبداللہ قریشی کا مضمون؟ اقبال اور فوپن۔
- ۱۴۰ - سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ اول، ص ۱۰۰۔
- ۱۴۱ - جارج سارٹن (George Sarton)، مقدمہ تاریخ سائنس اور تاریخ سائنس میں، فارمر (Henry Farmer) کی کتاب اور مضامین عربی موسیقی کے اثرات مغربی موسیقی پر، نیز دیکھیے میراث اسلام (Legacy of Islam)۔
- ۱۴۲ - سید نذری نیازی، اقبال کے حضور، ج ۲، زیرِ طبع۔
- ۱۴۳ - دیکھیے کتب خانہ جامعہ پنجاب۔ کیفیٰ کلیکشن مجلدات رسالہ زبان ۱۸۹۳ اور ۱۸۹۴ء یہ رائخ عبدالرحمن رائخ ہیں۔ رائخ عظیم آبادی نہیں ہیں۔
- ۱۴۴ - صحیفہ، مجلس ترقی ادب لاہور، شمارہ ۳۱۹۷ء میں میرزا محمد منور کا مضمون؟ اقبال کی شاعری۔
- ۱۴۵ - سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ دوم۔
- ۱۴۶ - اقبال، مجلہِ بزمِ اقبال لاہور، محمد عبداللہ قریشی کا مضمون لاہور کے مشاعرے، ص ۲۸-۳۹۔
- ۱۴۷ - رجیم بخش شاہیں، Iqbal Mementos، ۱۹۷۶ء راقم الحروف کے نام۔
- ۱۴۸ - سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ دوم۔
- ۱۴۹ - سید نذری نیازی، اقبال کے حضور میں، ج ۲، زیرِ طبع۔
- ۱۵۰ - ماہنامہ اسلامی تعلیم، آل پاکستان ایجو یشنل کانفرنس، اشاعت ۱۹۷۷ء، لاہور۔
- ۱۵۱ - رجیم بخش شاہیں، Iqbal Mementos، ص ۲۸۔
- ۱۵۲ - یال جبریل، ساقی نامہ۔
- ۱۵۳ - شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، دیباچہ۔
- ۱۵۴ - سید نذری نیازی، اقبال کے حضور، ج ۱۔
- ۱۵۵ - مصرع اولی میں لاہور کی جگہ پنجاب ہے۔
- ۱۵۶ - مولانا میر حسن کی۔
- ۱۵۷ - سید نذری نیازی، اقبال کے حضور، ج ۲، زیرِ طبع۔

## فصل دوم

لاہور

تاریخ ۱۹۰۵ء

### ا۔ گورنمنٹ کالج

۱۸۹۵ء میں جب محمد اقبال ایک نو عمر طالب علم کی حیثیت سے لاہور آئے تو حصول علم کے اس مرحلے کی اساس جس کا آغاز گورنمنٹ کالج سے ہوا نہایت خوبی سے قائم ہو چکی تھی۔ جدید تعلیم کے اس نئے مرکز میں محمد اقبال کی مثال ایک مسافر کی تھی جو اپنے دل و دماغ کی خداداد صلاحیتوں اور ایمان و یقین کی دولت کو زادراہ کی طرح ساتھ لیے علم و عمل کی اس دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ جس کے مظاہر بے شمار ہیں، مراحل گونا گون، مدرجات العداد۔ جس میں طلب علم کے فکر و فہم کی تربیت ہوتی۔ سیرت و کردار کے نشوونما کے ساتھ ساتھ احساس ذات اُبھرتا ہے۔ شخصیت کی پروپریتی ہونے لگتی ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زندگی نام ہے فرائض کے تسلسل کا۔ وہ ایک ذمہ داری ہے، ایک تیاری کسی نصب اعین سے وابستگی اور اس کے حصول کی آرزومندی میں اپنے مرتبہ و مقام کی تعین کے لیے۔ محمد اقبال نے اس دنیا میں قدم رکھا تو حصول علم کے ساتھ ساتھ تینگی ذات کی جدوجہد میں اب ایک نیامیدان ان کے سامنے تھا..... لاہور، لاہور عہد مغلیہ کا نوحہ خواں، سکنگر دی کی اندوہناک مثال۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے مثنت ہوئے نقوش اور آثار اور باقیات، ایک دور عروج و کامرانی کی روایتوں اور پچی کچھی نشانیوں کی یاد گار۔ محمد اقبال لاہور آئے، گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ کوآڑیگل میں رہنے کو جلد ملی جہاں کمرہ میں ان کے نام کی تختی گلی ہے۔ مضامین میں انگریزی تو لازمی مضمون تھا، عربی اور فلسفہ اختیاری۔ معلوم نہیں محمد اقبال نے کالج کی حدود میں قدم رکھا تو ان کے احساسات کیا تھے؟ گورنمنٹ کالج کی کلیسا نما عمارت، اس کے اوپر اونچے درود بیوار، طویل برآمدے، مغربی طرز تعمیر، دو منزلیں، محراب بالائے محراب اور ان کے وسط میں کلنس کی طرح نکلتا ہوا ایک بلند و بالا برج ساعت، مغربی علم و فضل اور مغربی تہذیب و تمدن کی برتری کا مظہر۔ بربادی اقتدار اور

برطانوی شان و شوکت کا مستقل اعلان۔ لیکن محمد اقبال کی نگاہیں کالج کے دردیوار اور خشت و سنگ پر نہیں تھیں۔ ان کی نگاہیں ان اساتذہ کو دیکھ رہی تھیں جن کے زیر تربیت اُخیں علم کے اگلے مراحل طے کرنا تھے۔ گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادب، مغربی علوم اور مغربی فلسفہ کی تھیں۔ اُن کے ان کے لیے دانش حاضر کی را اپنے کھول دیں۔ وہ دلی شوق اور انہاک سے ان را ہوں پر چل پڑے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ اس دانش کو ”حجابِ اکبر“ سے تغیر کرتے۔ ابھی تو علم کی تھی یونیورسٹی کی باقاعدہ ابتداء ہو رہی تھی۔ ابھی تو اس تصادم کے جو قدیم اور جدید یا اسلام اور عصر حاضر میں رونما ہے، خدوخال ہی اُبھر رہے تھے، گوکی قدر غیر قطعی اور غیر واضح شکل میں۔ ابھی شاید اس کشاکش کا آغاز نہیں ہوا تھا جس کے باعث اُخیں آگے چل کر، جب ”شراب علم کی لذت“ اُخیں کشاکش یورپ لے گئی، ایک شاید ہتھی اضطراب سے گزRNA پڑا۔ ابھی شاید اُخیں خود بھی احساس نہیں تھا کہ جس تعلیم کی آرزو اُخیں سیالکوٹ سے لا ہو رہے آتی ہے ایک دن ان کے لیے کیسے مسائل اور مشکلات پیدا کر دے گی۔ سردست ان کی ایک ہی خواہش تھی اور وہ یہ کہ اس کے حصول میں تیزی سے آگے بڑھیں۔ اس کی تکمیل میں کوئی فروگذاشت باقی نہ رہے۔

۷۱۸۹۷ء میں محمد اقبال بی۔ اے کے امتحان میں بدرجہ دوم کامیاب ہوئے۔ جمال الدین اور خلیفہ محمد حسین تمحظی حاصل کیے۔ عربی میں سب سے زیادہ نمبر پائے۔ جن طلباء کی زبان انگریزی تھی ان میں اول آئے۔ ۱۸۹۸ء میں شاید، ایم۔ اے کا امتحان نہیں دیا اور دیا تو ناکام

رہے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کیا۔ تیسرا درجے میں کامیاب ہوئے۔ خان بہادر ناک بخش تمغہ حاصل کیا۔ فلسفہ میں اس سال وہی ایک امیدوار تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں محمد اقبال کے زمانہ قیام کی مدت چار سال سے زیادہ نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ان چار سالوں میں ان کے اساتذہ اور ہم جماعتوں میں ان کی قابلیت کا سلسلہ بیٹھ گیا۔ امتحانات کے نتائج سے اگرچہ بظاہر اس کی تائید نہیں ہوتی، الا یہ کہ تمغہ حاصل کرتے رہے۔ مگر پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایم۔ اے کرتے ہی ان کی خدمات اور یعنیفل کالج کے لیے حاصل کر لی گئیں۔ گورنمنٹ کالج میں ان دونوں انگریز اساتذہ کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا عبداللہ ٹوکنی ایسے اہل علم موجود تھے۔ پھر ”استاذی قبلہ“ لالہ جیارام، علم اقتصاد کی تصنیف میں ان کے مشیر۔ وہ بھی دوسرے اساتذہ کی طرح ان کی

ذہنی صلاحیتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ پروفیسر آر علڈ البتہ ابھی لاہور نہیں آئے تھے۔ میر حسن کے بعد ان کے دوسرے استاد!

محمد اقبال کو کالج ہی کے زمانے میں بعض ایسے دوست میرزاۓ جن سے ان کے تعلقات عمر بھر قائم رہے۔ مثلاً میاں فضل حسین اور میر نیرنگ۔ میر صاحب ان سے دو سال پچھے تھے۔ مرزا اعجاز حسین ایک سال آگے۔ میر نیرنگ نے شاعری کی۔ مرزا اعجاز حسین نے بھی، مگر بہت کم۔ فضل حسین سے ان کے روابط بڑے گھرے تھے۔ فلسفہ غم ایسی نظم ان کے والد ماجد ہی کی وفات پر لکھی گئی۔ لیکن سیاسی اختلافات کے باعث جن کا آغاز ۲۰۹۱ء میں ہوا۔ تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی چلی گئی تا آنکہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے، صرف صاحب سلامت رہ گئی، حالانکہ ایک زمانے میں انہیں حمایت اسلام ہی نہیں مسلمانوں کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں میں باہم مل کر حصہ لیتے صلاح و مشورہ ہوتا۔

دارالاقامے میں بھی محمد اقبال کے کمرے میں بڑی چہل پہل رہتی۔ شعرو شاعری کی محفل جمعتی۔ لیکن محمد اقبال ایک فلسفہ مزاج اور سنجیدہ طبیعت نوجوان تھے۔ شعرو شاعری کی ان محفوظ میں ذوق صحیح کی پروشن کے ساتھ ساتھ علمی مسائل زیر بحث آتے۔

میر نیرنگ لکھتے ہیں: محمد اقبال کے مزاج میں قطبیت تھی۔ اپنے کمرے میں فرش پر بیٹھے رہتے۔ حقہ ہدم و ہم نفس، برہمنہ سر، بنیان در بر، گھنٹوں تک تہ بند، سرد یوں میں مکبل اوڑھ لیتے تھے۔ ہر قسم کی گپ اڑاتے، طبیعت میں ظرافت تھی، سچبی زبردست کرتے۔ محمد اقبال زمانہ طالب علمی ہی میں کالج پر چھا گئے۔ ہم سبق ان کی قدر کرتے، اساتذہ کو ان کی لیاقت اور قابلیت کا اعتراف تھا۔ لیکن محمد اقبال کی طبیعت میں انکسار تھا، تکلف نہ تصنیع، تعالیٰ نہ تقاضا۔ نہ بھی احساس برتری کے فریب میں آئے۔ اس زمانے ہی میں نہیں، عمر بھر۔

گورنمنٹ کالج میں محمد اقبال کا قیام کم و بیش چار برس طالب علم اور پائچ چھ برس استاد کی حیثیت سے رہا۔ یورپ سے واپس آئے تو پھر اس کے اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک ڈھائی تین برس انگریزی اور فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء کے بعد کسی نہ کسی تقریب میں شرکت کا اتفاق ہو جاتا۔

۱۹۲۲ء میں نسر کا خطاب ملاتوبریٹ سوسائٹی کی طرف سے کلیم اللہ خاں سیکریٹری سوسائٹی، منور ناتھ سیٹھ اسٹٹنٹ سیکریٹری سوسائٹی اور ایم۔ اے کے طلباء نے ان کے اعزاز

میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ جووری کے آخری ایام تھے جب طلباء کا ایک وفد میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محمد اقبال برآمدے میں شلوار ٹپیش پہننے ایک شال اوڑھے بیٹھے تھے۔ طلباء نے پروفیسر چیئر جی کا دعوت نامہ پیش کیا۔ محمد اقبال نے سوسائٹی کی دعوت قبول کر لی۔ یوم مقررہ پر ان طلباء کے ساتھ جو سوسائٹی کی طرف سے پیشوائی کے لیے آئے تھے۔ میکلوڈ روڈ سے پیدادہ پاکانج روائے ہوئے اور پیدادہ پاہی ان کے ساتھ واپس آئے جو ایک گونہ تعجب کی بات ہے اس لیے کہ محمد اقبال، بہت کم پیدل چلتے۔ گورنمنٹ کالج میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے خاصا دور تھا۔ میکلوڈ روڈ میں جو نشتبیں ہوئیں کالج میں یہ تقریب جس عقیدت اور احترام سے منای گئی۔ محفل جیسی پررونق اور پرمرست تھی، محفل ہی میں کیا کالج آتے جاتے بھی وہ طلباء سے کچھ ایسے تپاک اور بے تکلفی سے ملے جیسے اب بھی ان کی صفت میں شامل ہیں۔ طلباء میں طالب علم، اساتذہ میں اسٹارڈ۔ تقریب کالج کے صحن میں ہوئی، تصویریں کھنچیں۔ پرنسپل ہیکی، پروفیسر چیئر جی، پروفیسر احمد حسین، ایم۔ اے اور بی۔ اے کے طلباء کے علاوہ کچھ اور اصحاب مثلاً میجر شفیع فضل الحق اور انور سکندر خاں بھی تصویر کشی میں شامل تھے۔ خیر مقدم میں تقریریں ہوئی۔ قاضی اسلم نے تقریر کی۔ کاظم حسین نے، آگے چل کر پروفیسر میکلین انجینئرنگ کالج، اقبال کی غزل:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نزالے ہیں  
یہ عاشق کوئی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

بڑی خوشحالی سے پڑھی۔ محمد اقبال بھی بہت محظوظ ہوئے۔ محمد اقبال تقریر کے لیے اٹھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے سوچ رہے ہیں کہ موضوع کیا ہو۔ کوئی خالصاً نہ ہی اور سیاسی موضوع چھیڑنا تو خلاف مصلحت تھا، بالآخر انہوں نے آئین انسان کے نظریہ اضافت پر تقریر کی۔ جس کا مفاد قاضی صاحب نے جہاں تک ممکن تھا اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں، باوجود کیہ تقریر کا موضوع فلسفہ اور سائنس تھا محمد اقبال اسلام کا ذکر کرنے سے نہ رک سکے گو بڑے مختاط طریق میں۔ انہوں نے کہا: اس نظریے کے تحت صوفیاء کے احوال و اورادات اور عصر حاضر کے طبعی اور ریاضیاتی نظریوں میں اتصال ممکن ہے۔ یہ بھی کہ اس کی رو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ انسان کا ہے، ایک ذات باری تعالیٰ کا۔ پھر کہا: علم الہی لامتناہی ہے۔ لا محدود، بے ابعاد، یعنی اس میں ماضی ہے نہ حال، نہ مستقبل۔ نہ کوئی ازل نہ آخر۔ ہمیں اس

بارے میں بڑی اختیاط سے کام لینا چاہیے۔<sup>۷</sup>

تقریر ختم ہوئی تو جب بھی محسوس ہوتا تھا جیسے محمد اقبال کسی گھری سوچ میں ہیں نظمیں پڑھی گئیں۔ قاضی صاحب کو افسوس ہے کاظم حسین جوانی ہی میں فوت ہو گئے، قیام پاکستان سے پہلے۔ قاضی صاحب نے کپور سنگھ کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے پنجابی ماہنامہ سارانگ نکالا اور اس میں محمد اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا۔<sup>۸</sup> کپور سنگھ بھی اس وقت فلفہ میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ آئی سی ایس ہو گئے۔ لیکن تقسیم ملک پر ملازمت چھوڑ دی۔ سیاسی زندگی اختیار کر لی۔

بایس ہمه گورنمنٹ کالج میں زمانہ طالب علمی کا ذکر محمد اقبال نے کبھی اس ذوق و شوق سے نہیں کیا جیسے طلباء اپنے زمانہ تعلیم یا ”مادر علمی“،<sup>۹</sup> میں گزرے ہوئے دونوں کا اکثر کیا کرتے ہیں، حالانکہ گورنمنٹ کالج کی طالب علمی انگریزی حکومت کے زمانے میں تو کیا قیام پاکستان پر بھی فخر و اعزاز پر محمول کی جاتی تھی۔ محمد اقبال علی گڑھ نہیں گئے۔ لیکن ان کا دل علی گڑھ میں تھا۔ قوم کے مستقبل میں نوجوانوں کے اندر ایک خالصاً اسلامی ذہن کی پروش میں ان کی نگاہیں ہمیشہ علی گڑھ پر رہیں۔ گورنمنٹ کالج سے انھیں کوئی دل بنتی نہیں تھی۔ جو بھی دل بنتی تھی علی گڑھ سے تھی۔ فرماتے علی گڑھ مسلمانوں کی روح ملی کا مظہر ہے۔<sup>۱۰</sup>

## ۲۔ آر علڈ

لیکن ایک پہلو سے وہ گورنمنٹ کالج کو کبھی نہیں بھولے اور یہ تھا آر علڈ سے ان کا تلمذ۔ ان کا جب بھی ذکر کرتے بڑی محبت اور احترام سے کرتے۔ آر علڈ<sup>۱۱</sup> ایک نعمت تھی جو گورنمنٹ کالج میں انھیں میسر آئی۔ چنانچہ میر حسن کے بعد کسی دوسرے استاد نے ان کے ذوق علم کی پروش کی تو آر علڈ نے۔ آر علڈ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ کبیر حج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ آئے۔ سرسید کے بڑے قدر دان تھے۔ انھی سے متاثر ہو کر اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام تصنیف کی۔ ہندوستانی اسلامی لباس پہنتے۔ جس میں ان کی تصویر بھی موجود ہے۔ کالج میں انھیں مولانا آر علڈ کہا جاتا۔ لاہور میں بھی لوگ انھیں ولی کہتے۔ حالی کہتے ہیں:

مسیحی پوشاکیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی

مسیحی کو مسلمانی قبا زیب بدن دیکھیں

آرلنڈ نماز کے وقت مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو جاتے۔ رمضان میں افطاری کی دعویٰ کرتے۔ ٹریسیلوں نے ان کے اعزاز میں آرلنڈ ہاؤس تعمیر کیا۔ ۱۸۹۲ء میں آرلنڈ شادی کر کے آئے تو ناظر نے خیر مقدم کرتے ہوئے ایک نظم پڑھی۔

آرلنڈ اب آگئے لندن سے ہندوستان میں  
اک فرشتہ ساتھ لائے صورتِ انسان میں  
یونین ۳۱ کا اجلاس ہوا تو ناظر نے کہا:

جلوہ فرما اک طرف ہے آرلنڈ  
صدرِ اخوان الصفا شیخِ زمان  
الفتِ اسلام اس کے دل میں ہے  
اور مسلمانی قبا زیب بدن

آرلنڈ اسلامی علوم و معارف کے قدردان تھے۔ صفتِ اول کے مستشرق، عالمِ اسلام کے ہمدرد، مسلمانوں کے خیر خواہ، بے تعصُّب، رودار۔ علی گڑھ ہی میں مولا ناشبلی نہماںی سے ان کے تعلقات قائم ہوئے۔ شبلی کے مذاق علم میں بھی آرلنڈ کی بدولت پختگی پیدا ہوئی۔ انجمن حمایتِ اسلام اور لاہور کے علمی ادبی حلقوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے۔ ایرانی بالخصوص اسلامی اور مغلیہ مصغرات ۳۱ سے انھیں نے یورپ کو روشناس کرایا۔ آرلنڈ کی زندگی پاکیزہ تھی۔ بیگم آرلنڈ بھی ویسی ہی تیک سیرت۔ آرلنڈ کے شاگردوں نے ان کی عظیم شخصیت سے بڑا اثر قبول کیا۔ وہ بڑے منکسر المزاج اور شکافتہ طبعِ انسان تھے۔ جو ہر قابل کو پہچانتے۔ اس کی قدر کرتے، اسے نشوونما دیتے۔ لاہور انھیں کیسے بھول سکتا ہے۔

۱۸۹۷ء کو جب آرلنڈ لاہور آئے، فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے اور محمد اقبال بحیثیت طالب علم فلسفہ ان کے درس میں بیٹھے تو شاگرد اور استاد روز بروز ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ان میں دوستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے قائل، ایک دوسرے کے مفترض۔ ایک ذرودہ مینانے علم ۱۵ دوسرا اس کی شمع کا پروانہ جس کے ذوق تحقیق اور تحسیس کا یہ عالم کہ اس اتنہ کو کہنا پڑا محمد اقبال ایسا شاگرد استاد کو محقق بنا دیتا ہے، محقق کو محقق تر۔ آرلنڈ کہتے ہیں اگرچہ اقبال میرا شاگرد ہے لیکن میں اس کی تحریروں سے بہت کچھ

سیکھتا ہوں۔ میں ان کا پروفیسر تھا..... پڑھاتے پڑھاتے خود سیکھتا چلا گیا۔<sup>۱۵</sup> آرنلڈ نے محمد اقبال کے لیے مغربی فلسفہ، مغربی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے خزانے کھول دیے۔ وہ مغرب سے شناسا ہوئے تو آرنلڈ کی بدولت۔ یوں میر حسن کے زیر تربیت اگر محمد اقبال نے مشرق بالخصوص اسلامی مشرق اور اسلام کی روح، ضمیر اور مزاج کو سمجھا تو آرنلڈ کے زیر تعلیم مغرب کے دل و دماغ کو۔ محمد اقبال کو آرنلڈ کی ذات میں ایک نہایت شفیق اور مہربان استاد ہی نہیں ملا، آرنلڈ ان کے بزرگ اور دوست بھی تھے۔ یہ آرنلڈ ہی کی توجہ اور کاوش تھی جس نے محمد اقبال کو دانش حاضر کی زیارت کو اور گہرائیوں سے آگاہ کیا۔ ادھر شاگرد کی استاد سے عقیدت کا یہ عالم کر ۲۶ فروری ۱۹۰۳ء کو جب آرنلڈ کو انگلستان طلب کر لیا گیا، انڈیا آفس لامپریری کے مہتمم مقرر ہوئے، تو نالہ فرقا کے عنوان سے محمد اقبال نے جو نظم لکھی اس میں عین اس وقت جب ان کا ذرہ دل خور شید آشنا، ٹوٹا ہوا آئینہ عالم نہما، خل آرزو ہرا ہونے کو اور وہ خود بھی نہ جانے کیا سے کیا ہونے والے تھے۔<sup>۱۶</sup> اس رشتہ تندز کے دفتار اقطاع پر دلی قلق کا اظہار کری چلی گئی۔ چنانچہ واپس چلے گئے۔ آرنلڈ گئے تو ان سے یک جائی کی آرزو شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اگلے ہی برس یعنی ستمبر ۱۹۰۵ء میں انھوں نے پنجاب کی زنجیر تور ڈالی اور انگلستان روانہ ہو گئے۔<sup>۱۷</sup>

آرنلڈ سے محمد اقبال کے تعلقات کی داستان طویل بھی ہے اور اہم بھی، لیکن افسوس ہے ہماری معلومات اس باب میں بغاوت محدود ہیں۔ بغیر اس کے کہ انگلستان میں ان سے ملاقاتوں کی طرف تھوڑے بہت اشارے مل جاتے ہیں۔ حالانکہ دوران تعلیم میں جب محمد اقبال کا قیام یورپ میں تھا، آرنلڈ سے طرح طرح کی گفتگو میں ہوتیں، طرح طرح کے مسائل زیر بحث آتے۔ یوں بھی آرنلڈ کو اسلام اور عالم اسلام سے جو تعلق تھا انھیں ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات پر مجبور کر دیتا۔ محمد اقبال کو دولت عثمانیہ ہی کا نہیں عرب و عجم کے سیاسی اجتماعی زوال کا بخوبی احساس تھا۔ بلاد اسلامیہ کے ڈنی اور ملی احوال و شہون سے ان کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ کم و بیش یہی کیفیت آرنلڈ ایسے دوسرے اہل علم مثلاً بلجٹ اور براؤن<sup>۱۸</sup> کی تھی، گوپنے اپنے نقطہ نظر سے اسلامی علوم و معارف اور تہذیب و تمدن کے مطالعے میں وہ اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے۔ ان کے سیاسی اجتماعی کوائف، مذہبی اور اخلاقی صورت حال پر قلم اٹھاتے، ارباب سیاست ان کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے، ان کے قائم کردہ نتائج پر غور کرتے۔ یوں ان

کے افکار و آراء کی قدر قیمت محض بھی اور علمی نہ رہتی۔ سیاسی اہمیت اختیار کر لیتی۔ دول مغرب کے دفاتر خارجہ میں ان کی تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاتا۔ اسلامی ممالک سے ان کے سیاسی اجتماعی روابط حتیٰ کہ جیسا موقع ہوتا اور بہ لحاظ اس کے جزو ش اختیار کی جاتی اس میں ان تحریروں کو بڑا دخل ہوتا۔ کیا اچھا ہوا کہ محمد اقبال اور آرلنڈ کی ملاقاتوں، گفتگوؤں اور خط و کتابت کے بارے میں مزید تحقیق و تفصیل سے کام لیا جائے۔ ہم اس باب میں تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں تو بلا اسلامیہ سے سلطنت برطانیہ کے تعلقات علی ہذا محمد اقبال کے افکار و خیالات کے بعض ایسے گوشے بھی جو ابھی تک پردہ اخفا میں میں واضح طور پر سامنے ہوں گے۔

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے ترجمے کا مسئلہ تھا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو میں دہلی سے لاہور پہنچا۔ گاڑی سے باہر پلیٹ فارم پر قدم رکھا تھا کہ نگاہیں اشیش کی دیواروں پر سوں ملٹری گزٹ کے پوسٹروں پر جم گئیں۔ پوسٹروں میں بڑے بڑے جملی حروف میں آرلنڈ کے انتقال کی خبر دیکھی تو ٹھنک کر رہ گیا۔ اشیش سے میکوڈ روڈ کا رُخ کیا، اس کوٹھی کا جواں وقت بھی خستہ ہاں تھی اب کھنڈر بن رہی ہے۔ علی بخش نے میرے آنے کی اطلاع کی۔ ناشتے کے بعد ترجمے کی بات شروع ہوئی۔ میں نے آرلنڈ کی وفات پر اظہار افسوس کیا۔ میرا خیال تھا انھیں اپنے شفیق اور محبوب استاد کے انتقال کا علم ہے۔ لیکن انھوں نے ابھی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اخبار دیکھتے بھی کم تھے۔ آرلنڈ کی وفات کا سنا تو دل تھام کر رہ گئے۔ چند لمحے ماتھے پر ہاتھ رکھے، سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے جیسے وہ زمانہ آنکھوں میں پھر رہا ہے جب آرلنڈ لاہور آئے محمد اقبال نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ شاگرد اور استاد میں رشتہ تلمذ کے ساتھ ساتھ محبت اور عقیدت کے تعلقات قائم ہوئے۔ پھر لندن اور کیمبرج کی صحبتیں اور گفتگوؤں میں۔ ٹھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور ایک آہ بھر کہنے لگے: ”افسوس اقبال اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا۔“ ۱۷ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دریک یہ حالت رہی۔ طبیعت سنبھلی تو علی بخش سے کہا: ”کاغذ قلم لے آؤ، لیڈی آرلنڈ کی خدمت میں تعزیت کا خط لکھنا اور تاریخیجناء ہے۔“ ۱۸ یہ تھا محمد اقبال کی استاد سے محبت اور عقیدت کا علم۔ سہ پھر میں پھر باتوں باتوں میں آرلنڈ کا ذکر آگیا۔ میں نے عرض کیا آرلنڈ عالم اسلامیہ کے ہمدرد تھے، دعوت اسلام، ایسی کتاب لکھی۔ انھیں اسلام کی صداقت کا اعتراف تھا۔ مسلمان کیوں نہیں ہو گئے؟ ہنس کر، جیسے میری سادگی کا لطف اٹھا رہے ہوں، کہنے لگے: دنیا میں ایک چیز ہے وسیع المشربی، جس میں انسان اپنے

عقیدے، مسلک اور موقف پر قائم رہتے ہوئے بھی دوسرے مذاہب کی صداقت سے انکار نہیں کرتا۔ مجھے اس روشنگ کی اخلاقی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیونکہ اس کا ایک لازمی نتیجہ ہے تعصب اور تنگ نظری کا ازالہ، انسانوں کے باہم ترقیت ہونے کی ایک صورت۔ لیکن اس قسم کی وسیع امشربی کی روح خالصاً انفرادی ہوتی ہے۔ محدودے چند افراد سے آگے نہیں بڑھتی۔ عملاً افراد میں صلح و آشنا تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن سیاسی اجتماعی اعتبار سے اتحاد انسانی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ یہ قوموں کے نزاع و جدل اور دکھ درد کا کوئی مداوا ہے، نہ ایک عالمگیر معاشرے کی تعمیر کا ذریعہ۔ آرٹلڈ کی وسیع امشربی انھیں اسلام اور عالم اسلام کی ہمدردی پر مجبور کرتی، لیکن آرٹلڈ انگریز تھے، مذہب ایسا میں، الہزاریا است اور کلیسا کی تفریق کے قائل۔ سیاسی اعتبار سے ان کی وفاداری کا حق صرف انگلستان کو پہنچتا تھا۔ وہ چاہتے تھے انگلستان اور بلا و اسلامیہ میں دوستانہ روابط قائم ہوں۔ سیاسی تلخیوں کی یاد مٹ جائے۔ دلوں میں کدورت باقی نہ رہے۔ میں نے کہا بالفاظ دیگر مسلمان سلطنت برطانیہ کی غلامی پر راضی ہو جائیں۔ فرمایا یونہی سمجھ لو۔ میں نے عرض کیا اندر میں صورت اسلام اور عالم اسلام سے ان کی دلچسپی کی حقیقی علت کیا سیاسی نہیں تھی، سلطنت برطانیہ کے مفاد سے وابستہ، یہ دوسری بات ہے کہ وہ اسلام پر قلم اٹھاتے تو پیشتر اس کے حق ہی میں لکھتے۔ عالم اسلام کے سیاسی اجتماعی کوائف پر نظر رکھتے۔ کہنے لگے: جو چاہو کہہ لو! حقیقت بہر حال بھی ہے کہ وہ عیسائی تھے۔ دل سے اپنے ملک اور قوم کے بھی خواہ اور یہ وہ بات ہے جسے کوئی تظری انداز نہیں کر سکتا۔ فرمایا: براؤں بھی ایسے ہی شریف النفس انسان تھے۔ ایران کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا، لیکن وہی ریاست اور کلیسا کی تفریق، وہی وطنی اور نسلی قومیت کا فتنہ، سیاست اور اجتماع کی باطل اساس۔ اسلام پر بے جا اعتراضات۔ میں نے تاریخ ادبیات ایران پر تبصرہ نہیں کیا۔ میرا کہنا تھا اس تاریخ سے ایرانی قومیت کا احیا مقصود ہے اور ایرانی قومیت کا تصور امت کے سیاسی اور ملیت شخص کی لئی۔ بایس ہمہ محمد اقبال نے براؤں کی تاریخ وفات کی۔ یہ تھی ان کی وسیع امشربی، اسلامی رواداری۔

کہنا بہر حال یہ تھا کہ جس طرح محمد اقبال خوب سمجھتے تھے آرٹلڈ جو کچھ لکھتے اور سوچتے مخلصان، بے تعصی اور رواداری کے ساتھ، آرٹلڈ بھی محمد اقبال کے جذبہ دینی، ایمان و یقین اور عالم اسلام کے لیے محبت اور ہمدردی سے بے خبر نہیں تھے۔ پھر اگر دونوں کا خیال تھا کہ بہتر ہو گا دولت برطانیہ اور عالم اسلام میں تصادم کی نوبت نہ آئے تو اس میں خرابی کی کوئی بات نہیں۔ یہ

ہر اس شخص کی جگہ نواع انسانی کا خیر خواہ ہے خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، دلی آرزو ہوگی۔ آر علڈ کی وفات پر ایک میموریل فنڈ قائم کیا گیا اور چندے کی اپیل کی گئی تو اس میں محمد اقبال، عبدالقدار اور راس مسعود نے بھی حصہ لیا۔ ۱۹۷۲ء میں برمنگم ماونٹ پلیزنسٹ کمیونٹی سنٹر میں یوم اقبال منایا گیا تو آر علڈ کے نواسے ڈاکٹر لارنس بارفیلڈ استاد ارشیات برمنگھم یورنیورسٹی نے ایک مقالہ پڑھا اور علاوہ اس خط کے جو محمد اقبال نے لیڈی آر علڈ کی تعریت کرتے ہوئے لکھا تھا، علی گڑھ اور لاہور کے زمانے کی کئی ایک تصویریں بھی لکھائیں۔ علی ہذا ان الوداعی خطبات کی نقل بھی جو ۱۹۰۷ء میں لاہور سے روانگی کے وقت آر علڈ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ۳۳

ڈاکٹر لارنس بارفیلڈ، مس آر علڈ کے شوہر، محمد اقبال کا بڑی محبت اور عقیدت سے ذکر کرتے ہیں۔ ۳۴ مس آر علڈ نینسی ہیں جن کے بارے میں محمد اقبال نے لکھا تھا۔ خدا آپ کو اور نینسی کو توفیق دے کہ اس صدمے کو صبر سے برداشت کر سکیں۔

آر علڈ اور آر علڈ کی ذات سے محمد اقبال کو جو عقیدت تھی وہ تو خیر ایک استثنی ہے۔ گورنمنٹ کالج کے دوسرے اساتذہ کی بھی انھیں دل سے عزت تھی۔ لالہ جیارام تو اساتذہ قبلہ لالہ جیارام تھے۔ لالہ جیارام کو اردو اور فارسی ادب سے دلی شعف تھا، محمد اقبال سے بڑا گاؤ۔ ان کی ملکہ سخن کے قدر داں۔ گورنمنٹ کالج میں طلباء کے ذوق ادب کی پروش کے لیے ایک ادبی انجمن (اب مجلس اقبال) انھیں نے قائم کی۔ انھیں کی تحریک سے قرار پایا کہ ہر سال طلباء کالج میں جو بہترین اردو نظم لکھنے اسے انعام دیا جائے۔ ۳۵ مفتی محمد عبداللہ ٹوکنی عربی میں ان کے استاد، شعروشاوری کی محفلوں میں ان کے ہم جلیس، ان کے بزرگ ہر اعتبار سے واجب الاحترام، مگر اس کے باوجود بے شکل دوست بشرطیکہ لفظ دوستی میں تقاضت عمر کا لحاظ رکھ لیا جائے۔ ان کا ایک ملازم تھا ستار بجانے میں ماہر، محمد اقبال مفتی صاحب کے بیہاں جاتے ستار سننے۔ مفتی صاحب دبلے پتے انسان تھے، بات کرتے تو منہ پر موال رکھ لیتے علم و فضل کے پیکر۔ محمد اقبال کہتے یہ جان اور یہ علم، دریا کو زے میں بند ہے۔ مفتی صاحب کو عربی ادب، فقہ اور حدیث پر عبور حاصل تھا۔ کہتے لاہور میرا دوسرا وطن ہے لیکن ملازمت سے فارغ ہوئے تو ٹوکنک واپس چلے گئے۔ ان کے صاحزادے مفتی انوار الحسن جن کے توسط سے غالب کا نسخہ حمیدیہ مرتب ہوا اور جس پر انھوں نے ایک مقدمہ بھی لکھا بھوپال میں دیریکٹ نگران امور مذہبی پر رہے۔ انھیں بھی محمد اقبال سے دلی ارادت تھی۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ محمد اقبال مولانا

محمد حسین آزاد کی خدمت میں بھی کبھی حاضر ہوئے یا نہیں، غالباً نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ مولانا کی دیوالی اور وحشت کا تھا پھر ہمیں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن آزاد شاید اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ ہمارا ڈاکٹر تحریک پرانگوں نے مولانا حامل سے مل کر جس صنف نظم کی بنیاد ڈالی اسے اقبال ہی کے فکر و فون نے درجہ کمال تک پہنچایا۔ ممکن ہے مولانا عالم ہوش میں محمد اقبال کی نظموں سے لطف انداز ہوتے، ان کی تعریف کرتے ہوں۔

ڈبلیو نیل جن کا عالم الاقتصاد کی تصنیف میں بڑا دخل ہے ان کے پرنسپل اور انگریزی کے استاد تھے۔ محمد اقبال لاہور آئے تو نیل شاید تھوڑے ہی دنوں میں طویل رخصت پر چلے گئے۔ واپس آئے تو ڈاکٹر یکٹر مکھ مکھ تعلیمات مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر ڈانگر لئے ان کے جانشین تھے۔ ہرست<sup>۲۸</sup> تاریخ پڑھاتے۔ جی۔ بی۔ او شر<sup>۲۹</sup> فلسفہ کے استاد تھے لالہ جیارام تاریخ اور فلسفہ کے، ڈاکٹر اسٹریٹن مک پرنسپل اور یونیفنل کالج سے بھی محمد اقبال کے خصوصی روابط تھے۔ اسٹریٹن ۱۹۰۲ء میں کشمیر گئے تو گلمگ میں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ محمد اقبال کو دلی صدمہ ہوا۔ مزر اسٹریٹن سے تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وہ تھے تو کینیڈین اسے لیکن ہم انھیں امریکی ہی سمجھتے تھے۔ یہ انھیں کی شخصیت تھی جس کے زیر اثر ہمارے دلوں میں اہل امریکہ کی شرافت اور بے غرضی کا احساس پیدا ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے اکثر امریکن یونیورسٹیوں میں داخلہ کے خواہش مند ہیں۔ میراث اسٹریٹن میں کیجیے۔“<sup>۳۰</sup> چنانچہ ایک زمانے میں ان کا خیال تھا تعلیم کے لیے امریکہ کا رخ کریں لیکن یہ محض خیال ہی تھا۔ آر بلڈ کی محبت انھیں انگلستان چھپ رہی تھی۔

### ۳۔ پروفیسر اقبال

محمد اقبال نے ایم۔ اے کیا تو ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات میں عربی زبان میں غیر معمولی قابلیت کی بنا پر ان کا تقریب بحیثیت میکلود عربیک ریڈر<sup>۳۱</sup> اور یونیفنل کالج میں ہو گیا۔ تاریخ تقریب ۱۸۹۹ء میں تھا۔ ریڈر سے مراد ہے ریسرچ سکالر جس میں (۱) عربی کتب نصاب کی طباعت کی گمراہی (۲) عربی، انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ اور (۳) اور یونیفنل کالج میں درس و تدریس یہ سب باتیں ان کے فرائض میں شامل تھیں۔ نیز یہ کہ تاریخ، سیاست مدن، فلسفہ اور نفیسیات اور منطق میں بی۔ او۔ ایل کی پہلی اور دوسری جماعتوں، علی ہذا

انٹرمیڈیٹ سال اول اور سال دوم کو درس دیا کریں۔<sup>۲۵</sup> معلوم ہوتا ہے اس تقریر میں آر علڈ کی مساعی کو بڑا دخل تھا۔ وہ ڈاکٹر اشٹائین<sup>۲۶</sup> کے بعد نومبر ۱۸۹۹ء تک اور یمنٹل کالج کے عارضی پرنسپل رہے۔ علاوہ اس کے اور یمنٹل فیکٹری کے ڈین<sup>۲۷</sup> بھی تھے۔ ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر اشٹائین کے انقال پر پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹ اپریل ۱۹۰۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ان کی جگہ دولز<sup>۲۸</sup> نے لی۔

اور یمنٹل کالج میں محمد اقبال کا قیام ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء تک رہا لیکن وقوف کے ساتھ۔ یعنی ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء سے ۳۰ جون ۱۹۰۱ء، پھر ۲ جولائی ۱۹۰۲ء سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء پھر ۲ مارچ ۱۹۰۳ء سے ۲ جون ۱۹۰۳ء تک۔ اس کے بعد یہاں ان کے تصنیفی یا تدریسی کام کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ تا آنکہ ۱۹۰۲ء میں ان کا تعلق اور یمنٹل کالج سے منقطع ہو جاتا ہے۔ وقوف کی صورت اس لیے پیش آئی کہ ۱۹۰۱ء میں محمد اقبال نے کالج سے بلا تاخواہ رخصت لی، اسلامیہ کالج چلے گئے۔ دوسری مرتبہ یعنی ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج کے شعبہ انگریزی میں بطور ایڈیٹر یمنٹل پروفیسر<sup>۲۹</sup> کام کرنے لگے۔ چھ مہینے کے بعد ان کا تقریب بحیثیت اسٹٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج میں ہو گیا۔ انگریزی اور فلسفہ پڑھانے لگے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے تین سال کی بلا تاخواہ تعلیمی رخصت لی اور انگلستان چلے گئے۔ گورنمنٹ کالج سے ان کا دوبارہ تعلق انگلستان سے واپسی پر قائم ہوا۔

اسلامیہ کالج میں محمد اقبال کی مدت ملازمت صرف چھ مہینے تھی، ۷ جنوری ۱۹۰۱ء تا ۳۰ جون ۱۹۰۱ء۔ خلیفہ شجاع الدین کہتے ہیں: ”۱۸۹۹ء میں تھوڑے ہی دنوں بعد اقبال کے لیے انجمن سے واپسی کا ایک اور موقعہ نکل آیا۔ ۲۹ مئی شیخ عبدالقدار ان دنوں اخبار آبزرور میں کے ایڈیٹر تھے۔ اسلامیہ کالج میں ادبیات اور انگریزی پڑھاتے۔ انھیں چند روز کی رخصت لینا پڑی تو ان کی جگہ اقبال مرحوم یہ فرائض سراجام دینے لگے۔ میں ان دنوں ایف۔ اے کا طالب علم تھا۔ نصاب میں مبتلاشیان حق<sup>۳۰</sup> کے نام سے ایک کتاب شامل تھی..... عیسائی مصنف نے بعض اقوال کا موازنہ انھیں کی آیات سے کیا تھا۔ لیکن علامہ مرحوم نے کلام پاک کی..... آیات سے ان اقوال کی تشریح کی۔ موازنہ کے دوران میں آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بد رہا، ہتر، بد رہا افضل اور، ہر نوع اکمل ہیں۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری ہی نے آپ کے تحریکی کا سکھ بٹھا دیا۔<sup>۳۱</sup> یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا

خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ۱۹۱۸ء میں بھی محمد اقبال اسلامیہ کالج میں فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ حضرت اکبر اللہ آبادی کو لکھتے ہیں: ”اسلامیہ کالج لاہور کے ڈاکٹر ہیگ سٹ چچک کی پیاری سے انتقال کر گئے اور انہجن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کی ایم۔ اے کی جماعت مجھے لینی پڑی۔ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں..... یکچھر کیا ہوتا ہے انسان کی ذہنی ماہیسوں اور ناکامیوں کا افسانہ جسے عرف عام میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام کو میں ان کو آپ کا یہ شعر سنارہتا ہو:

میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی  
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کرنے سے مجھے مل گئی ہے نپ کر  
سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ  
بہر حال ان یکچھروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی فکر ڈالنے کا موقع عمل جاتا ہے۔

جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں اور یمنفل کالج اور گورنمنٹ کالج کی ملازمت کے باوجود کہ ان کے علمی مشاغل کے لیے کے نہایت موزوں تھی، ۱۹۰۱ء میں محمد اقبال نے استٹنٹ کمشنری ۲۷ کا امتحان دیا۔ شاید اس لیے کہ تحریک علی گڑھ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں کے حصول میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ ملک کے نظم و نسق میں ان کا عمل دخل بڑھے۔ ان نا انصافیوں کا ازالہ ہو سکے جو انھیں حکومت اور اہل طن کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ محمد اقبال امتحان میں کامیاب ہو گئے لیکن طبعی معاشرے میں ملازمت کے نا اہل قرار دیئے گئے۔ کہا گیا ان کی ایک آنکھ کی پیمائی کمزور ہے۔ ان کی ایک آنکھ کی پیمائی فی الواقع کمزور تھی لیکن اس حد تک نہیں کہ ملازمت کے نا اہل قرار دیئے جاتے۔ لہذا اسلامی اخباروں بالخصوص پیسہ اخبار اور پینچہ فولاد نے اس فیصلے پر زبردست احتجاج کیا۔ لیکن اسلامی صحفت کی آواز اس وقت نہایت کمزور تھی، کوئی متوجہ برآمد نہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے محمد اقبال نے بجوری حالات ملازمت کی طرف قدم بڑھایا، لیکن حق یہ ہے کہ ملازمت سے انھیں دلی نفرت تھی۔ ضمناً یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ سرکاری ملازمت کے لیے اس امتحان میں شمولیت کا علم ہمیں مولوی محبوب عالم کے احتجاج سے ہوا۔ وہ پیسہ اخبار میں برابر اس نا انصافی کی نہیں کرتے رہے۔

۱۸۷۰ء میں لاہور لا اسکول ۵۵ (اب یونیورسٹی لا اکاؤنٹ) قائم ہوا۔ گورنمنٹ کالج کے طلباً کو اجازت تحصیل کرائیم۔ اے کے ساتھ ساتھ قانون کا امتحان بھی دے سکیں۔ تعلیم کی تقسیم دو درجوں میں کی گئی تھی ۱۸۹۹ء میں محمد اقبال نے درجہ اول میں داخلہ لیا، امتحان میں بیٹھے یکن ناکام رہے اور لطف کی بات یہ کہ ناکام بھی ہوئے تو نصفہ ۶۳ کے پرچے میں۔ ایم۔ اے کے امتحان میں تیسرے درجے میں کامیابی کی وجہ بھی شایدی بھی تھی دو امتحانوں کی تیاری۔

جون ۱۹۰۰ء میں انھوں نے چیف کورٹ پنجاب سے ابتدائی امتحان قانون میں بیٹھے کی اجازت مانگی لیکن جسم سچیر جی نے بر بنائے قواعد انکار کر دیا۔ قواعد کا تقاضا تھا کہ لا اسکول میں داخلہ لیں، شریک درس ہوں، لیکن محمد اقبال ایسا نہ کر سکے۔

### ۳۔ علمی مشاغل

اور یعنی قل کالج میں درس و تدریس کے علاوہ محمد اقبال نے جو تحقیقی کام کیا اس میں ایک تو ان کا وہ مضمون ہے جو ۱۹۰۰ء میں انڈین انٹھی کیوری ۵۸ بینیٰ کے ۲۹ دیں شمارے میں شائع ہوا بعنوان اصول وہدت مطلقہ جیسا کہ جیلانی نے اس کی تشریح کی۔ ۵۹ جیلانی نے (جیلی زیادہ صحیح ہے) انسان کامل کے تصور سے بھی بحث کی ہے اور یہی دراصل محمد اقبال کی اس موضوع سے دلچسپی کا باعث بنا جیسا کہ آگے چل کر نیشنے سے اثر پذیری کے خلاف، نکسن کے خیالات کی تردید میں انھوں نے لکھا۔ پروفیسر نلسن نے بھی اپنی کتاب اسلامی تصوف کرے مطالعے ۵۰ میں جیلی پر قلم اٹھایا ہے۔ محمد اقبال نے علاوہ اس استہ اہ کی کتاب کا ملخص ترجمہ بھی کیا۔ اس نجی پروداکر کی کتاب سیاست مدن ۵۲ کا اول الذکر کا تعلق انگلستان کی دستوری تاریخ سے ہے۔ واکر کی کتاب بی۔ اے کے نصاب میں شامل تھی۔ پھر یہی زمانہ ہے جب وہ آر علڈ کی تحریک اور شیکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے معاشریات میں اپنی کتاب علم الاقتصاد تصنیف کر رہے تھے جیسا کہ کالج کی روئیداد ۱۹۰۲ء میں اشارہ کیا گیا ہے۔<sup>۵۳</sup>

جنوری ۱۹۰۲ء میں پروفیسر محمد اقبال نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے عنوان سے مخزن میں ایک مضمون لکھا اور وہ جوانگریزی میں مشل ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہے اس پر زور دیتے ہوئے کہا کہ قومی عروج کی جڑ چونکہ بچوں کی تعلیم ہے، لہذا طریق تعلیم علمی اصولوں پر منی ہو تو تھوڑے ہی

عرصے میں تمام تمدنی شکایات رفع ہو جائیں۔ صد ہا انسان جو بہائم کی سر زندگی بر کرتے، خود غرضی اور بے جا خودداری سے کام لیتے ہیں۔ اچھے انسان بن سکتے ہیں۔ اس موضوع پر جس کی اہمیت مسلم ہے، محمد اقبال نے بچوں کی طبیعت اور ان کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں ایک قسم کی اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے جس سے بقول ایک مغربی مصنف کے تعلیم میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پھر شاید اسی مصنف کے خیالات کو پیش نظر کھٹے ہوئے کہتے ہیں کہ بچوں کو چیزوں کو غور سے دیکھنے اور چھوٹے میں لطف آتا ہے۔ مگر ان کی توجہ ہر وقت بھی رہتی ہے۔ وہ صورت سے زیادہ اس کے رنگ کو دیکھتے ہیں۔ بڑوں کی نقل کرتے ہیں۔ ان کی قوت متحیله البتہ بڑی نہیں ہوتی ہے۔ ان سے انسانی ہمدردی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں جن سے ان کی اخلاقی تربیت میں بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ الفاظ کو فوراً یاد کر لیتے اور یوں مادری زبان بلا تکلف سیکھ لیتے ہیں۔ ان کی قوت تمیزہ البتہ کمزور ہوتی ہے۔ بچوں میں اعصابی قوت کی ایک زائد مقدار ہوتی ہے۔ اسے متعلم نہیں بلکہ ایک متحرک ہستی سمجھیے۔ ان کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ شور سے راگ سکھایا جا سکتا ہے۔ چیزیں ادھر ادھر پھیلکیں تو اینٹوں سے گھر بنا سکھائیے بچے نچلے نہیں رہ سکتے۔ بچوں میں قوت استدلال بڑی کمزور ہوتی ہے۔ فہمید بھی نہیں ہوتی۔ مجرد تصورات قائم نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہستی باری تعالیٰ کا تصور۔ انھیں کہانیاں سنائیے یوں ان کی قوت واہمہ کو نمودری سمجھیے۔ استاد خیال رکھے کہ بچے مدرکات، تصورات اور تصدیقات میں ترقی کرتے چلے جائیں۔ پھر لکھتے ہیں طریق تعلیم وہی کامل ہو گا جو نفس ناطقہ کے تمام قوی کے لیے یکساں پروش کا سامان مہیا کرے۔ ادراک، فکر، تحقیق، تاثر، مشیت غرضیکہ نفس ناطقہ کی ہر قوت حرکت میں آنی چاہیے، کیونکہ کامل طریق تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوری پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہیں۔ نفس ناطقہ قوی کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے۔ اس میں ہر قوت کی نشوونما دوسری قوت کی نشوونما پر محصر ہے۔ بچوں کی تعلیم سے محمد اقبال کی یہ لمحپی اس امر کا ثبوت ہے کہ انھیں قوم کی آئندہ نسلوں کی تربیت کا کس قدر خیال تھا۔ چنانچہ اس مضمون کے آخر میں خود ہی لکھتے ہیں: ”معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا انھیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت معلم کی کارگزاری ہے۔۔۔ بد قسمی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں جو

ہونی چاہیے۔ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور دینوں نیکیوں کی کلیدیں کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب کے لیے ضروری ہے کہ اپنے پیشے کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم کو اعلیٰ درجے کے اصولوں پر قائم کریں..... ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچا عاشق پیدا ہو جائے گا۔ جس کی سرگرمی میں وہ سیاسی اور تمدنی سرسبزی مخفی ہے جس سے قویں معراج کمال تک پہنچتی ہیں، ”غور فرمائیے محمد اقبال نے جن کو اس بات کا ذاتی تحریب تھا کہ معلم کی شان نے الحقيقة کیا ہے اور جس کے میر حسن کے درس میں وہ کئی ایک مظاہر دیکھے چکے تھے کس خوبی سے اس امر پر زور دیا ہے کہ تعلیم سے نفس انسانی کی تربیت بطور ایک وحدت کے ہونی چاہیے۔ وہ اس کا راستہ فرد اور قوم ہی سے نہیں جوڑتے۔ سیاست، معاش، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق اور معاشرت سے بھی۔ پھر یہ جو کچھ کہا ہے ایک ماہر تعلیم کی رعایت سے۔ تعلیم سے ان کی یہ دلچسپی ہمیشہ قائم رہی۔ تعلیم پر انہوں نے طرح طرح سے اظہار خیال کیا۔ تعلیم، معلمین، قدیم و جدید نظامات تعلیم سب پر نگاہ تنقید ڈالی۔ بڑے محکم اور صائب نظریات قائم کیے۔ وہ قوم کے بعض شناس تھے۔ خوب جانتے تھے فرد کی ذات کے کچھ معنی ہیں تو جب ہی کہ قوم سے وابستہ رہے۔ دراصل تعلیم سے ان کی یہ دلچسپی شروع ہی سے قائم ہو چکی تھی۔ خود ان کی تعلیم بھی اس نجھ پر ہوئی تھی جس پر انہوں نے بار بار زور دیا۔ تحریک علی گڑھ کا تقاضا بھی درحقیقت یہی تھا کہ نوجوانان اسلام کی دلی اور دماغی قوتیں بیدار ہوں۔ ان کا نقطہ نظر حقیقت پسندانہ ہو۔ علوم و فنون کی تحصیل میں اسلام کی صداقت اور حقانیت کا فہم پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد اقبال کی ہمیشہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کو جس تعلیم کی ضرورت ہے اس کا ر斧 صحت سے متعین ہوتا رہے۔

ایک دوسرے ضمنوں میں، جس کا عنوان ہے قوی زندگی، ۵۷ محمد اقبال نے ایک سچے ہندوستانی اور سچے مسلمان یا یوں کہیے ایک ہندی مسلمان کی حیثیت سے قوی زندگی پر قلم اٹھایا ہے۔ کہتے ہیں اب زمانہ توارکا نہیں ہے، قلم کا ہے۔ کسی زمانے میں قوموں کی قسمت کا فیصلہ توارکے سے ہوتا تھا، اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی لڑائی ہے۔ وہ دن گئے جب انسان چاند سورج کی پرستش کرتا تھا، مظاہر فطرت سے ڈرتا تھا۔ اب انسان قوائے فطرت پر تصرف حاصل کر چکا اور کر رہا ہے۔ علوم حیات نے طے کر دیا ہے کہ زندگی ایک لڑائی ہے۔ اس کی پیشی جد للھیات کی جنگ میں فیصلہ بقاۓ اصل ہی کے حق میں ہے۔ کتنی قویں اور تہذیبوں تھیں کہ مٹ گئیں۔ یہی کچھ اب ہورتا ہے۔ قویں جب ہی زندہ ہستی ہیں کہ افراد اپنے مفادات پر مفاد قوم

کو مقدم رکھیں۔ پھر یہ نیکی ہے جس میں ارتقائے انسانی کا راز مضر ہے اور جس کا سبق ہمیں مذہب نے دیا ہے۔ یوں محمد اقبال کا ذہن اسلام کی طرف منتقل ہوا، اسلام سے نبوت کی طرف تو انھوں نے لکھا نبوت کی حقیقت و قوت عقلی دلائل اور برائین پر منہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار اس لاثانی مشاہدے پر ہے جو نبی کے غیر معمولی قوی کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی بنا پر اس آواز میں وہ ربانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سامنے انسانی شوکت یعنی محض ہے۔ یہ ہے نبوت جس کا اصلی راستہ خیال کے لوگوں نے نہیں سمجھا۔ پھر کہتے ہیں: اہل یونان غلامی کو تمدن کا جزو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن نبی عرب نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی۔ غلاموں اور آقاوں کے حقوق مساوی قرار دیے۔ اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو دنیا اس وقت محسوس کر رہی ہے۔ عورتوں کو غلام تصور کیا جاتا تھا لیکن حکیم عرب نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں ایسی ہی آزادی کی تعلیم دی۔ اسلام میں انسانی مساوات کے عملی نمونوں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں چاہیے تاریخ سے سبق لیں۔ کتنی تو میں ہیں جو علمی اور تمدنی ترقی کی حسین وادی کے لیے قربان ہو گئیں۔ یونانی، رومی، مصری، افریقیہ کے کشور کشا ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ ان کی زبانیں ان کے فلسفے بے کار ہو کر رہ گئے۔ سیکڑوں دنیا میں پیدا ہوئے، آخر کار نیست و نابود ہو گئے۔ ایرانی اور وسط ایشیا کی قوموں کا حال مخدوش نظر آتا ہے۔ صرف چار قومیں باقی ہیں ہندو، چینی، یہودی اور پارسی۔ یہودی کی داستان ایک درس عبرت ہے۔ پارسیوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ یورپ کی بات اور ہے۔ یورپ دن رات ترقی کر رہا ہے۔ جاپانی کس تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اہل اٹلی بھی ان کی طرح زمانہ حال کی ترقی کا طحیح مفہوم سمجھ کر سیاسی تمدنی اصلاح میں کوشش ہیں۔ یہود کے پاس حکومت نہیں لیکن یہ قوم زندہ ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی مقر و پیش ہیں۔ پارسی بھی ہندوستان میں ساہو کاروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ مگر ہندوستان کا معاملہ کس قدر افسوس ناک ہے۔ ہم ذرا ذرا سی چیز مثلاً دیا اسلامی کے لیے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ ہمارا تمام مال باہر جا رہا ہے۔ نہ صنعت و حرفت ہے نہ تجارت۔ اس صورت حالات کا انجام کیا ہوگا؟ وہ ملک جو مصالح خام<sup>۵۵</sup> کا ایک مخزن اور ذخیرہ ہے مصنوعات کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ کیوں نہ جاپانیوں کی طرح ہم بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں پھر کہتے ہیں: عقل خداداد بڑی چیز ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جس کی مدد سے ہم شرائط زندگی کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیسا بھی انقلاب ہواں کے اوازم پر غور کر سکتے ہیں۔

تو انہیں قدرت کو معلوم کرتے، ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ترقی کا رخ معین کر لیتے ہیں۔ آبادی کی افزائش کے ساتھ زمین کی پیداوار اور قدرتی اسباب کم ہو رہے ہیں۔ یہ صورت اندیشہ ناک ہے۔ ہندوستانیوں سے ان کا ذہن مسلمانوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہیں شروع ہی سے اسلامی قومیت پر مریخ تھیں۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے۔ قوموں کے عروج و زوال کو سمجھتے۔ اٹلی اور جاپان کا ذکر کرتے ہوئے جب ہندوستان کی زیوبوں حاملی پر کڑھتے ہیں تو انہیں بھولتے کہ ہندوستان میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان کے بہت سے مسائل حل طلب ہیں، مثلاً پردوے کا معاملہ ہے۔ تعداد ازدواج کا، شادی کی رسماں ہیں، غیر ضروری مصارف ہیں، نام و نمود کی خواہش ہے۔ یہ سب باقیں اصلاح طلب ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے اخلاق کی درستی محنت اور دیانت قومی ترقی کی شرط اول ہے۔ عورتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ پردوے کے حل کا بھی کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں، نہ تعداد ازدواج کا۔ شادی اور نکاح کی رسماں کا ازالہ ضروری ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: فانکو ما طاب لکم<sup>۲۵</sup> اس ارشاد کی حکمت کو سمجھ لیں تو یہ خرابیاں با آسانی دور ہو سکتی ہیں۔ میاں بیوی میں نزاع رہے گا نہ عورتیں اپنی مظلومی کا روناروئیں گی۔ نہ مردوں کو ان سے کوئی شکایت ہوگی۔ گھر میں امن اور چین ہو گا صدیوں کے انحطاط نے طرح طرح کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں لیکن ہم نہیں سوچتے دین اسلام ہمیں دعوت فکر اور اچھتا دیتا ہے۔ ہم ان مشکلات پر غالب آسکتے ہیں۔ یہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان عقل اور علم سے آنکھیں بند کیے حیات مسح یا ناسخ و منسوخ کی بحثوں میں الجھے مسلمان کافروں کی فہرست میں روز افزودوں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ امراء کی عشرت پسندی ایک کے بعد دوسرا کے بعد تیسرا بیوی کی تلاش میں لگی رہتی ہیں۔ بازارِ حسن کے نازنیوں سے آنکھیں لڑائی جاتی ہیں۔ لکھنا، پڑھنا تو کہیں رہا عمر رفتہ کا اندوختہ بیہودہ رسماں کی نذر ہو رہا ہے، مقدمے بازیاں ہیں، جائیداد کے جھگڑے، لڑکیاں تعلیم سے عاری، نوجوان جاہل ہیں، محنت سے جی چراتے، صنعت و حرفت سے گھبراتے ہیں۔ دماغ شاہجهانی آدمیاں قلیل۔ کیسا نازک وقت ہے بایں ہمہ ہمارے فقہاء، علماء اور حکماء کی کاؤشوں میں ہمارے دکھ درد کا علاج موجود ہے۔ محمد اقبال کا دل درد قومی سے معمور ہے۔ لیکن وہ قوم کی زیوبوں حاملی کو دیکھتے ہوئے اس کا علاج یورپ میں نہیں اسلام میں ڈھونڈتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام ابوحنیفہؓ کی مثالیں

پیش کرتے ہیں۔ محمد اقبال کے ذہن میں گویا ۱۹۰۷ء تو کیا شروع ہی سے اسلامی قومیت کے احیاء اور تقویت کا خیال موجود تھا۔ وہ ایک خوش حال ہندوستان میں اہل طن کے پہلو بہ پہلو بحثیت ایک قوم مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے آرزو مند تھے۔ انھیں شکایت تھی کہ ہندوستان دوسری قوموں سے سبق کیوں نہیں لیتا۔ ہندوستان تجارت اور صنعت و حرفت پر توجہ کرے، معیشت کو ترقی دے، مالی حالت سدھ جائے علم و حکمت، تہذیب و تمدن، اخلاق اور شائستگی میں آگے بڑھے۔ انھیں طن کی زیوں حالی پر رخ ہوتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد طن فی الواقعہ زیوں حال تھا۔ ہندوؤں سے بڑھ کر مسلمان، غور فرمائیے یہ نبوت، یہ احتما، یہ تفہیق اور اسلامی معاشرہ کے مسائل مثلاً تعداد ازدواج، پرده، نکاح کی رسماں سے لے کر سیاسی معاشری اعتبار سے ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کی زیوں حالی ان سب باتوں میں کیا مستقبل کا اقبال جھلک نہیں رہا ہے؟ جب حقیقت یہ ہے تو بجائے مغرب کے کسی سرچشمے یا کسی خارجی طبقہ کی بجائے ہم محمد اقبال کو اس کے ماضی میں، جس کی نوعیت سرتاسر علمی اور اسلامی ہے، تلاش کیوں نہیں کرتے؟ محمد اقبال کے دل میں تاثرات کا بھوم ہے۔ کہتے ہیں میرے مافی افسوس کا اندازہ ان سطروں سے نہیں ہو سکتا۔ وہ اس بارے میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر یہ کہہ کر رک جاتے ہیں:

از اشک مپرسید کہ در دل چہ خروش است  
ایں قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد

## ۵۔ علم الاقتصاد

یہ امر کہ اردو زبان میں معاشیات میں سب سے پہلی کتاب محمد اقبال کے قلم سے نکلی بڑا اہم ہے۔ اس لحاظ سے نہیں کہ سر سید نے باریں میں سائینٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھتے ہوئے جدید علوم و فنون کو اردو میں ڈھانے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا، علم الاقتصاد کی تصنیف اس کی ایک اہم کڑی ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ محمد اقبال نے شعر اور فلسفہ سے فطری مناسبت اور اس میں شب و روز انہاک کے باوجود زندگی کے مادی اور معاشی حقوق کو جن کا رشتہ اخلاق اور مذہب کی طرح، فرد اور جماعت کی زندگی سے نہایت گہرا ہے نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا ذہن ہم گیر تھا، نگاہیں حقیقت بیں۔ علم الاقتصاد کا انداز بیان بڑا سمجھا ہوا، صاف اور سلیس ہے۔ زبان سرتاسر علمی۔ معاشیات میں اس وقت سے لے کر اب تک جو گراں قدر اضافے ہوئے،

انداز بحث اور نقطہ نظر جس طرح بدلا اور بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے علم الاقتصاد کی موجودہ اہمیت اگرچہ کہنے کو صرف تاریخی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود محمد اقبال کی صحت فکر اور مضمون پر گرفت کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاشیات کی حقیقی اہمیت اور نہیادی نوعیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے جن خیالات کا اٹھا کر کیا ان کی صحت آج بھی مسلم ہے، تو اس کی قدر و قیمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ محمد اقبال شاعر اور فلسفی تو تھے ہی، ایک حقیقت پسند انسان بھی۔ یہ نہیں کہ جذبات کی شدت یا خیالات اور تصورات کی ایک خالی دنیا میں گم رہیں۔ ان کی شاعری اور فلسفہ کی جڑیں زندگی میں پیوست ہیں اور یہ وہ بات ہے جسے ان کے ناقدین اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی حقیقت پسندی اور بالغ نظر کا زبردست ثبوت ہے کہ اس زمانے میں، جب لوگوں کو زیادہ تر دلچسپی م Jord تصورات اور نظری بحثوں سے تھی، محمد اقبال نے قوموں کی ہست و بود کے معاملے میں معاشیات کو فرماوش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشیات سے ان کی دلچسپی ہمیشہ قائم رہی۔ قیام انگلستان میں بھی انہوں نے اس کا مطالعہ جاری رکھا۔ علم الاقتصاد کے ناقدین کو تعجب ہے کہ بادی النظر میں گوایسا معلوم ہوتا ہے جیسے علم اقتصاد میں محمد اقبال نے مارشل اور تاسک<sup>۲۷</sup> کے نظریوں سے کام لیا ہے لیکن مارشل اور تاسک کی تقسیمات علم الاقتصاد کی تصنیف سے بہت موخر ہیں۔ بہر حال محمد اقبال نے اس حقیقت کے پیش نظر کہ کسب رزق بالفاظ دیگر معاشی جدوجہد ایک امر ناگزیر ہے، لہذا افراد کو جماعت سے جو رشتہ ہے بسبب اس کے یہ جدوجہد کسی نہ کسی معاشی نظام کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس امر پر زور دیا کہ جو بھی معاشی نظام ہو اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک انسانی فطرت کا کہ اگر اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کا رد عمل یقینی ہے۔ اس کے نتائج کسی نہ کسی پہلو سے، سیاسی ہوں یا اخلاقی یا کوئی اور، زندگی کے لیے ناگوار ہوں گے۔ یوں دوسری بات جو محمد اقبال نے کہی ہے یہ کہ فطرت کسی ایسے معاشی نظام کو قبول نہیں کرے گی جس سے اس کی نفعی ہو جائے جو ازاں نے نفیات ایک قدرتی امر ہے اور اول الذکر ہی کا ایک پہلو۔ محمد اقبال کہتے ہیں معاشیں کی نظر انسان کی دماغی ساخت پر ہوئی چاہیے۔ ان کا فرض ہے ان اسباب کی تحقیق کریں جن سے انسانی افعال متاثر ہوتے ہیں مثلاً قومی اور تمدنی رسومات، نیتی ضروریات، علی ہڈا وہ قوانین جن کا تعلق زمین سے ہے۔ ہمارا فرض ہے ایک نفیات دان کی طرح ان حالات اور واقعات پر نظر رکھیں جن سے فرد اور جماعت کی

زندگی مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اگر معاشریات کی بنا کسی ایسے نظریے پر ہے جس میں فطرت انسانی یا نفس انسانی کی کارفرمائی کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو ناممکن ہے اس سے خاطرخواہ تنائج مرتب ہوں۔ فرض کیجیے ہم کہتے ہیں انسان خود غرض ہے، یا یہ کہ انہا پسند ہے۔ حالانکہ اس میں دونوں حرکات کام کرتے ہیں۔ وہ ایثار پسند ہے نہ خود غرض۔ لیکن جس نظامِ معیشت میں اس حقیقت کا اعلہار نہیں رکھا گیا۔ انسان کے اخلاق و عادات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ مثلاً یہ نہیں سوچا گیا کہ ایک خورده فردش کے لیے اگرچہ ان قوانین سے انحراف ناممکن ہے جن سے کاروبار ایک باقاعدہ اور معین شکل اختیار کرتا ہے مگر اس کی اخلاقی حس کمزور ہے، ایثار پسندی ہے، ناصلوں پسندی، وہ خود غرض ہے تو ظاہر ہے اس سے کاروبار میں اختلال اور انتشار ہی پیدا ہو گا۔ یعنیہ اگر ہم نے یہ سمجھ لیا کہ زندگی تمام تر معاشریات ہے، ہم اس کے ہر پہلو کی توجیہ معاشریات کے حوالے سے کرتے ہیں تو یوں بھی معاشرے کے لیے بڑے فتح تنائج مرتب ہوں گے۔ مثلاً یہی کہ جس شخص کا مقصد محض کسب دولت ہے اسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ پھر کہتے ہیں مذہب بھی اگر محض ایک اخلاقی اور روحانی ضابط ہے تو اس سے ہماری سیرت و کردار کا مسئلہ تو حال ہو جائے گا، معاشری اور مادی ترقی کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ لہذا بحیثیت مجموعی، زندگی کا مسئلہ بھی لا تخل رہے گا۔ مذہب کے اس عام اور محدود تصور کے پیش نظر محمد اقبال کہتے ہیں: ”مذہب بھی تاریخ انسانی کے سیل روایا میں بے انتہا موثر ثابت ہوتا لیکن اکتساب رزق کا دھندا بھی ہر وقت انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ انسان کے ظاہری اور باطنی قوی کو چکپے چکپے اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ غربی قوائے انسانی پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بسا اوقات اس کی روح کے محلی آئینے کو اس قدر زنگ آ لوکر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا عدم وجود برا بر ہو جاتا ہے۔“<sup>۵۸</sup>

ام الخبائث ہے۔ غور فرمائیے محمد اقبال نے تاریخ کا سہارا لینے ہوئے معاشریات کا سلسلہ کس خوبی سے مذہب اور اخلاق سے جوڑا ہے۔ یا بہتر ہو گا یوں کہیے اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے کہ فطرت نے یہ رشتہ پہلے ہی سے جوڑ رکھا ہے اس امر پر زور دیا کہ زندگی ایک وحدت ہے جس کے ہر پہلو کو دوسرے سے وہی تعلق ہے جو جزو کوکل سے۔ یہ زندگی کی وحدت ہی تو ہے جس میں فرق آیا تو قوموں کی زندگی میں فتنہ و فساد کی راہیں کھل گئیں۔ دراصل قوموں کی زندگی میں صحبت اخلاق اور صحبت معاش دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ وہ مذہب کی پابندی کریں یا کسی نظام اجتماع کی دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی ضابطہ اخلاق کی تشكیل ضروری ہے۔ لیکن جس

طرح ایک صحت مندمعاشی نظام اخلاقی قدروں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ایسے ہی محض اخلاقی قدروں کے سہارے معاشری خرایوں کا انسداد ناممکن ہے۔ لہذا جب محمد اقبال مذہب کے میل روای کے ساتھ ساتھ اکتساب رزق کے دھنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اخلاق کو معیشت یا معاشرت کو اخلاق سے جو گہر اعلق ہے اسے نظر انداز نہ کیا جائے۔ یا پھر اخلاق اور معاشر کے عام اور راجح وقت مگر محدود تصور کی جائے ہم کسی ایسی بنیادی حقیقت پر نظر رکھیں جس کی بدولت ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر اصول علم عمل وضع ہو سکے جو معیشت اور اخلاق کے ساتھ ساتھ زندگی کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹ لے، اس کی وحدت قائم رکھے۔ اگر ایسا ہو تو زندگی کے جملہ تقاضے بدرجہ احسن پورے ہوتے رہیں گے۔ خواہ اس اصول علم عمل کو مذہب سے تعبیر کریں یا کسی اور نام سے۔ دولت مے مقصود ہر حال احتیاجات کی کفالت ہے۔ نظام تمدن وہی کامیاب ہے جس میں زندگی کے جملہ تقاضے ہم آہنگ ہوں۔ بجز اس کے قوموں کے سود و بہود کا اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ دراصل ہم سے جو لغزش ہوتی ہے یہ کہ زندگی کے سارے عمل کو بطور ایک کل کے نہیں دیکھتے۔ اس کی وحدت کے نہیں سے قاصر رہتے ہیں۔ اس پر جزو اجرا نظر رکھتے ہیں۔ لیکن محمد اقبال نے معاشر اور اخلاق کے بارے میں جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ محمد اقبال نے مذہب کا رشتہ معاشیات سے نہیں جوڑا اس لیے کہ وہ اصلاً ایک ہی حقیقت ہے جسے ہم کبھی ایک نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کبھی دوسرے سے۔ پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ان میں ایک رشتہ قائم ہے تو سہولت بیان کے لیے تاکہ اس رشتے کی شکست سے جو مناجح مترب ہوں ان کیوضاحت ہوتی رہے۔ ہم سمجھ لیں کوئی بنیادی حقیقت ہے جو یوں نظر انداز ہو رہی ہے۔ اندر میں صورت نوع انسانی کی معاشری جدو جهد کے مطالعے میں جب کچھ اصول اور قوانین وضع ہوتے ہیں ہم انھیں ایک نظام معلومات کی شکل دیتے ہیں معاشریات کو ایک علم سے تعبیر کرتے ہیں تو اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ معاشر ہو، یا اخلاق تہذیب و تمدن کی اس جدو جهد میں جو بدوانسانیت سے جاری ہے، ہماری نظر انسان پر ہونی چاہیے۔ انسان ہی اس کا مبتدا اور منتها ہے۔ محمد اقبال کا دل دردانسانیت سے معمول ہے۔ وہ نہیں چاہتے معاشریات کی بحث میں ہم انسان کو بھول جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب افلاس اور نادری پر ان کا دل کڑھتا ہے تو وہ اس کا مدوا کسی وقت تدبیر، یا ایغون کی گولی سے نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہیں دیکھ لیجئے زمانہ حال کی تعلیم

نے ارسٹو کے برخلاف انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا ہے۔ تفاوت مدارج قیامِ تمدن کی منافی ہے بلکہ طرح طرح کی خرایوں کا سرچشمہ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دھن سے آزاد ہو جائے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چکے چکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں؟ افلاس کا دل ہلا دینے والا نظارہ صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مت جائے؟ پھر اس کے جواب میں خود ہی کہتے اور ٹھیک کہتے ہیں کہ اس مسئلے کا حل صرف معاشیات میں نہیں ہے، اس میں اخلاق کو بھی گہرا دخل ہے۔ کیوں نہ معاشیات کی عمارت کسی ایسی اساس پر تعمیر کی جائے جس سے ان خرایوں کی جڑکنی رہے جو معاشی زندگی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور تمدنی زندگی میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔<sup>۵۹</sup> غور کیجیے معاشیات کے اس بنیادی اور ایک لحاظ سے واحد مسئلے کے حل میں جہاں محمد اقبال نے انسانی مساوات کے لیے معاشی مساوات پر زور دیا ہے وہاں انسان کی زبoul حالی پر انھیں کیسا دکھ ہوتا ہے۔ وہ جب فساد اخلاق اور فسادِ تمدن کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ اخلاق اور تمدن کا بجائے خود تقاضا ہے کہ ایک صحیح مند نظامِ معیشت قائم ہو۔ اس لیے کہ معیشت کے ساتھ کہ معاشی زبoul حالی، افلاس اور نادری میں نہ تو مصالح اخلاق کی حفاظت ممکن ہے، نہ مصالحِ تمدن کی شاید حضور سالمت آب ﷺ کا یہ ارشاد کاد الفقر ان یکون کفرانہ ان کے ذہن میں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر انھوں نے معاشیات کے باب میں جونقطہ نظر قائم کیا قرآن مجید ہی کی رہنمائی میں قائم کیا۔ یعنی اسلام کی بدولت نہ کہ کسی خارجی سرچشمے کے زیر اثر۔ بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک انسان محض حیوان ناطق یا حیوان سیاسی یا حیوان معاشی نہیں ہے، انسان ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر دولت ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ساتھ نہیں دیتی تو اس کا فائدہ؟ انسان کی زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ دولت، صحت تو اس مقاصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ مقصود بالذات نہیں۔

جہاں تک عملًا کسی منصوبہ بندی کا تعلق ہے۔ محمد اقبال نے بجا طور پر اس امر کی صراحت کی ہے کہ معاشی ترقی کا راز قومی تعلیم میں مضر ہے۔ تعلیم ہی سے دست کار کا ہزر اور فن، اس کی محنت اور کارکردگی اور ذہانت ترقی کرتی ہے۔ اس کے اخلاق سنورتے ہیں۔ ہم اس پر اعتماد کر

سکتے ہیں۔ سہولت کار کے لیے وہ فتنی نئی راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جس پر آج کل معاشرہ شمار و اعداد کے حوالے سے زور دے رہے ہیں۔ محمد اقبال کی نظر آبادی پر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: آبادی میں اضافے اور ضروریات زندگی میں کمی کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی منصوبہ بندی ناگزیر ہو گی۔ ایسی منصوبہ بندی جس کا تعلق آبادی کی روک تھام اور اشیاء ضرورت کی بڑھتی ہوئی مانگ سے ہوتا کہ ایک میں اضافے اور دوسرا میں کمی کے باعث معاشرہ فتنہ و فساد اور انتشار سے محفوظ رہے۔ وہ کہتے ہیں تحدید اولاد میں بھی مہماں اور اخلاقی کوئی عیب نہیں بشرطیکہ ہم اس بارے میں کسی طبق نجی پر قدم اٹھائیں۔ تعداد ازدواج کا بھی مناسب حل مل سکتا ہے۔ ان معاملات میں بھی ہمیں تعلیم کی ضرورت ہے۔ تعلیم ہی سے ہماری اخلاقی اور تمدنی حس کو تقویت پہنچتی ہے۔ اہل محنت کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس اضافے کی بدولت پیداوار بھی بڑھے گی۔ لاد اہل محنت سے انھیں دلی ہمدردی ہے۔ وہ ان کی زیوں حالی پر نالاں ہیں۔ چاہتے ہیں انھیں آسودگی اور خوش حالی نصیب ہو۔ معاشرہ انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے۔ ۱۔ مشیش الدین حسن کے ناول ”مزدور کی بیٹی“ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”مجھے یقین ہے اس کی اشتاعت سے عام لوگوں کو مزدوری کی موجودہ حالت سے ہمدردی پیدا ہو گی۔ میں نے اسے محض افسانہ نویسی کے نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھا۔ کئی مقامات پر میری آنکھیں پر آب ہو گئیں۔“ ۲۔ محنت کش طبقے سے ان کی دل سوزی کا اظہار آگے چل کر خضراب اور زبور عجم میں ہو گا: بار بار اور طرح طرح سے ان کی حمایت میں قلم اٹھائیں گے۔

منصوبہ بندی کے سلسلے میں انہوں نے شخصی اور ذاتی تاثرات کے بارے میں بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں ابتداء میں تو شخصی اور ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وسائل مشترک تھے آمدنی مشترک۔ اب کہ شخصی اور ذاتی ملکیت نے ایک اصول کی حیثیت اختیار کر لی ہے تو کم از کم اتنا ہونا چاہیے کہ فرد اور جماعت کی ضروریات اور فلاح و بہبود کے پیش نظر زمین میں شخصی ملکیت کا سوال نہ پیدا کیا جائے۔ زمین کی ملکیت مشترک ہو۔ زمین کے بارے میں آگے چل کر محمد اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ ۳۔ جہاں تک اہل محنت کا تعلق ہے ان کی رائے تھی کہ ان کی کوشش سے جو زائد دولت پیدا ہوتی ہے، اس پر اہل محنت ہی کا حق ہے۔ دولت پیدا بھی تو اہل محنت ہی کرتے ہیں۔ مہماں جن، یا کارخانہ دار، یا زمیندار نہیں کرتے۔ اقبال کا ذہن قدر رزانہ اہل محنت کے استھان اور پیداوار

میں منصوبہ بندی پر مرکز ہے۔ بے منصوبہ پیداوار ان کے نزدیک سرچشمہ فساد ہے۔ آگے چل کروہ ان خیالات کا اظہار زیادہ منضبط شکل میں کریں گے۔

علم الاقتصاد کی تصنیف میں محمد اقبال کی مسائل حیات سے گھری لجھی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حصول معاش کے لیے قوموں کی مسلسل کشاکش، فرد اور جماعت کے مادی اور معماشی تقاضوں کے ایفا، سیاسی اجتماعی احوال و شوون میں تغیر و تبدل سے معاشرے کے لیے جو نتائج مترب ہوتے ہیں ان کے فہم و ادراک میں بڑی ذرف نگاہی سے کام لیتے ہیں۔ یہ محمد اقبال کی حقیقت پسندی کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ ایسے عالمگیر اور محکم نظام معيشت کا تصور ہمیشہ ان کے ذہن میں جاگزین رہا جو مصاف زندگی میں فرد کو تعمیر ذات اور معاشرے کے بہبہ و جوہ نشوونما میں ایک فعال اور کامیاب عضر کا کام دے۔ چنانچہ علم الاقتصاد میں ان کا یہ احساس کہ افلas سب سے بڑی لعنت ہے جو انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی ہر کہیں نمایاں ہے۔ ہندوستان میں افلas عام ہے۔ معاشی زبوب حالی کا یہ عالم ہے کہ ہم خریدتے ہی خریدتے ہیں، بیچتے کچھ نہیں۔ جب تک کوئی قوم معاشیات سے واقفیت پیدا نہیں کرتی، یہ نہیں جانتی معاشی عوامل کیا ہوتے ہیں، ان کے اصول و قوانین کیا ہیں، ترقی نہیں کر سکتی۔ ہمیں چاہیے یورپ کی تجارت پر نظر رکھیں۔ آزاد تجارت معاشی دستبرد کا ذریعہ ہے ۱۵۔ اسے بھی ہندوستان کی معاشی زبوب حالی میں بڑا دخل ہے۔ پھر کہتے ہیں: مسلمان مفلس بھی ہیں اور جاہل بھی۔ مسلمان جب تک معاشی اعتبار سے مضبوط نہیں ہوں گے تہذیب اور تمدن میں پیچھے رہیں گے۔ سیاسی اعتبار سے پست۔ ہندو اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے سیدیشی تحریک شروع کی تو محمد اقبال نے اس کی حمایت میں لندن سے ایک خط لکھا۔ سوال یہ تھا کیا مسلمان اس تحریک میں حصہ لیں۔ اقبال نے کہا کیوں نہیں؟ سیاسی آزادی کے لیے معاشی حالات کی درستی ضروری ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے اس تحریک کو انگلستانی مصنوعات کے مقاطعے تک محدود رہ کھیں۔ قومی منافرت، کوئی اچھی شے نہیں۔ بہتر ہو گا اس تحریک کو حالات اور ضروریات کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح معاشی اصولوں پر جاری کیا جائے۔ ۱۶۔ یوں محمد اقبال نے مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ معاشی ترقی سیاسی ترقی کی شرط ضروری ہے۔ اخلاقی ترقی بھی بجز ایک مضبوط معيشت کے ممکن نہیں۔ انھیں چاہیے معيشت کے میدان میں محنت اور تمنی دی، دیانت اور حوصلے سے قدم رکھیں۔ معاشی اعتبار سے خود کفیل ہونے کی کوشش کریں۔ معاشی اعتبار سے وہی قوم ترقی کر سکتی اور دوسری قوموں کی

متاجی سے نجات حاصل کر سکتی ہے جو اپنی ضروریات کے لیے اپنے ملکی وسائل پر قباعت کرے، بلکہ جیسا کہ آگے چل کر انہوں نے اصول قائم کیا:

آنکہ از خاکِ تو روید مردِ حر  
آن فروش و آن پوش و آن بخور

علم الاقتصاد کے دیباچے میں محمد اقبال نے جن سرچشموں سے فائدہ اٹھایا ان کا اعتراض بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ وہ اپنے استاذہ کا ذکر بڑے ادب اور احترام سے کرتے ہیں۔ آرٹلڈ تو خیران کے مشفق، کرم و معظم اور محترم رہنمائی، وہ استاذی جناب قبلہ لالہ جیا رام اور اپنے دوست اور ہم جماعت میاں فضل حسین کے بھی معنوں ہیں جنہوں نے بعض مسائل میں انھیں قیمتی مشورے دیے اور جن کے مجموعہ کتب سے انہوں نے فائدہ بھی خوب خوب اٹھایا۔

ضمناً علم الاقتصاد کی بدولت انھیں علامہ شبی نعمانی سے بھی شرف نیاز حاصل ہو گیا اگرچہ غائبانہ، لیکن ظاہر ہے آرٹلڈ کے توسط سے۔ شبی ہی کی توجہ سے کتاب کے بعض حصوں اور زبان کے بارے میں قابل قدر اصلاحیں کی گئیں۔ محمد اقبال نے علم الاقتصاد کو بہ تشكیر ڈبلیویل ڈائرکٹر حکمہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں جو مصنف کے استاد بھی رہ چکے تھے، پیش کیا ہیل صاحب چاہتے تھے محمد اقبال ایک ایسی کتاب لکھیں۔

## ۶۔ مشاعرے

محمد اقبال کے دوست، ادب پسند اور خوب فہم ہم جماعت زمانہ طالب علمی ہی میں انھیں مشاعروں میں کھیچنے لے جاتے جہاں محمد اقبال اپنا کلام سناتے۔ دادخسین لیتے۔ شیخ عبدال قادر لکھتے ہیں: ”۱۹۰۱ء سے دو تین سال پہلے میں نے پہلی مرتبہ ایک مشاعرے میں دیکھا جہاں ان کے ہم جماعت انھیں کھیچنے لے آئے تھے اور انہوں نے گا کر ایک نظم پڑھی۔ چھوٹی سی غزل تھی، سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہیں تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرے میں انہوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔“ ۱۸۹۶ء میں ایسا ہی ایک مشاعرہ تھا جس میں انہوں نے وہ شعر پڑھا جس پر مرتضیٰ ارشد گورکانی نے انھیں گلے لگایا اور کہا اقبال یہ عراویر یہ

## شعر:

موتی سمجھ کے شان کریکی نے جن لیے  
قطرے جو تھے مرے عرقی افعال کے

یوں محمد اقبال کے ان سے نیازمند نہ تعلقات ہو گئے۔ زبان اور محاورے کے معاملے میں ان سے مشورہ لیتے۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت لاہور کے ادبی حلقوں میں پھیل گئی۔ ایک دوسری جگہ عبدالقدار لکھتے ہیں: اور یہ ۱۸۹۵ء کے آخر یا ۱۸۹۶ء کے شروع کی بات ہے کہ لاہور میں ایک بزم مشاعرہ بازار حکیماں میں حکیم امین الدین مرحوم کے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ ایک شب اس بزم میں ایک نوجوان طالب علم اپنے چند ہم عصروں کے ساتھ شریک ہوا۔ اس نے ایک سادہ ہی غزل پڑھی:

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن  
آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی  
اس سخنور ہی سی کی بے ساختگی اور پڑھنے کے بے ساختہ انداز سے سخن فہم سمجھ گئے کہ  
اُردو شاعری کے افق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا ہے۔ اس غزل میں ایک شعر اور تھا جس کی  
سمعین نے بہت داد دی اور تقاضا کیا کہ اقبال صاحب اگلے مشاعرے میں ضرور شامل ہوں۔  
وہ شعر یہ تھا:

خوب سوچھی ہے تِ دام پھڑک جاؤں گا  
میں چن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

یہ اگلا مشاعر ۱۸۹۶ء کا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

۱۸۷۴ء میں محمد حسین آزاد اور مولانا حامی نے کریل ہارانیدڈا ریکٹر سرشنیہ، تعلیم پنجاب کے ایما سے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ مقصد تھا مغرب کی تقلید میں جدید شاعری کی ترویج یا دوسرے لفظوں میں کہ حضرات شعراً غزل کی فرسودہ اور زندگی سے مٹی ہوئی روشن کو چھوڑ کر قومی اور اخلاقی مضامین پر قلم اٹھائیں۔ مناظر فطرت کی نقاشی کریں۔ یہ تقلید مغرب کا معاملہ یوں تو اچھا تھا کہ اُردو شاعری غزل کے نگ نا کے سے نکل کر زندگی کی وسیعتوں میں قدم رکھے مگر اس میں ایک سیاسی یا ثقافتی غرض بھی شامل تھی اور وہ یہ کہ شعراً کے دل و دماغ بدے، ماضی سے ان کا رشتہ کٹ جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کی ثقافتی موت واقع ہو جاتی۔ حامی اور آزاد نے

اگرچہ اپنے قومی شخص میں فرق نہ آنے دیا لیکن انہوں نے اس تحریک کے زیر اثر جو نظمیں لکھیں ان کے موضوع محض اخلاقی اور وقتی تھے۔ رہایہ امر کہ اُردو غزل کے ساتھ اور اُردو نظم کو بھی فروغ ہو، وطن سے محبت اور وابستگی اور مناظر فطرت سے لطف اندازی کے ساتھ ساتھ حقائق حیات کی تربجاتی ہوتی رہے، شاعری تہذیب و ثقافت کی زبان بن جائے، قومی بیداری اور دل و دماغ میں وسعت پیدا کرے محمد اقبال ہی کی نظموں سے تکمیل کو پہنچا۔ اس مشاعرے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد انجمن اتحاد کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم ہوئی۔ بازار حکیماں میں حکیم امین الدین بیرونی کے یہاں شعرو شاعری کی محفل گرم ہوتی۔ شعرا کا کلام ایک ادبی ماہ نامے شور محسن میں، جس کی ادارت خان احمد حسین خان کے ہاتھ میں تھی، شائع ہوتا۔ مولانا فیض الحسن سہارن پوری، میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ اور مرزا ارشد گورکانی اس مجلس کے روح روائی تھے۔ مولانا اور میر صاحب کی بدولت مشاعروں میں میر و مرزا کی سی چپش کارنگ پیدا ہو جاتا۔ بقول حکیم احمد شجاع ”جب تک یہ رنگ جاری رہا شور محسن قیامت برپا کرتا رہا۔“<sup>۲۰</sup>

حکیم احمد شجاع حکیم محمد شجاع الدین کے صاحبزادے مشہور ادیب اور ڈراما نگار نے ”لاہور کا چیلسی“ کے عنوان سے نقوش میں جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں بڑی تفصیل سے اندر وون بھائی دروازہ میں بازاروں، گلیوں اور محلوں کا نقشہ ساکھنچے ہوئے تباہی ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے آخر اور ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں یہ علاقہ، آئیے اسے بھائی دروازہ کہہ لیں، ارباب علم وہنا اور روسائے شہر کا مرتع و مسکن تھا۔ محمد اقبال محلہ جلوٹیاں میں رہتے۔ ان کے پاس ہی عبد القادر محلہ موتی بہ میں، شیش محل میں احمد حسین خان، کوچ پڑنگاں میں مولانا اصغر علی روچی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولوی عبد حکیم کلانوری بھی بھائی دروازے کے اندر ہی مقیم تھے مفتی عبداللہ ٹونگی بازار حکیماں میں۔ نائیوں کی گلی میں شیخ گلاب دین۔ نور محلہ میں سید محمد شاہ وکیل، شیش محل سے آگے رائے بہادر میلا رام کی عالی شان حولی تھی۔ میلا رام اور رام سرن داس ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے تیوار بھائی دروازے سے باہر لال کوچی میں مناتے، ہندو، مسلمان، سکھ رہ سارا جہا نہیں رہتا، دیا کوش کول، سندھنگ میٹھیہ اور سردار جگندر سنگھ کے علاوہ شعرا، ادیب اور نامور دکاء جمع ہوتے۔ بڑی رونق کی محفیں جتیں، علم و ادب کے جوہر کھلتے۔ موتی بہ کے قریب ہی خلیفہ نظام الدین کا قیام تھا۔ شیخ سدو کے پاس محلہ کاغذیاں میں میر ناظر

حسین کاظم کا۔ قریب ہی کوچ فقر غازی میں حسین بخش پہلوان کا جن سے ہر کوئی خوف کھاتا۔ مولوی احمد دین تھصیل بازار کی وان والی گلی میں رہتے، ان سے ذرا آگے بھاڑوں کی تھریاں، اسے میں خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش۔ مولوی محبوب عالم نے بھی گوجرانوالہ سے آ کر بھائی دروازے ہی میں پناہ لی۔ سر شہاب الدین بازار حج محمد لطیف میں رہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی دہلی سے آئے تو بھائی دروازے کے اندر ہی مقام ہو گئے۔ مرتضیٰ ارشد گورگانی البتہ بھائی دروازے سے بھی ہوتے ہوئے، جہاں سکھوں کے زمانے میں عمامہ دین سلطنت کی حویلیاں تھیں گر جو بعد میں طوائف خانہ بن گیا۔ پاس ہی مسجد نعمانی تھی۔ اس پر مولانا عبداللہ ٹونگی نے مرتضیٰ اغالب کی زبان میں کہا: ”مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے“۔ فقیر سید عزیز الدین بازار شیخوپوریاں کٹری میں رہتے۔ حکیم صاحب کہتے ہیں؛ اب تک صرف ان بزرگوں کا ذکر آیا ہے جو بازار حکیماں کی مغلبوں میں شریک ہوتے اور جن سے محمد اقبال کے قربتی روابط اور دوستانہ مراسم تھے۔ لیکن بازار حکیماں میں فقیر خانہ ہی کی بدولت جو دراصل لاہور کی علمی اور ادبی مغلبوں کا مرکز تھا، بھائی دروازے کی عظمت قائم تھی۔ فقیر خانہ یعنی بازار بھائی دروازے کے شہی حصے میں فقیر سید نور الدین اور فقیر سید عزیز الدین کی حویلیوں کے علاوہ اس خاندان کی، جنہوں نے اپنے بزرگوں کا نام روشن کیا اور جو سکھ عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز درباریوں میں شامل تھے بلکہ سکھ حکومت کی تقویت اور استحکام کا ذریعہ بنے، متعدد حویلیاں موجود ہیں۔ بازار حکیماں موتی ٹبہ سے لے کر تھصیل بازار تک چلا گیا ہے۔ اس کی بنیاحیم خاندان کے جدا مجدد حکیم عبداللہ انصاری نے رکھی۔ وہ قاضی القضاۃ ہند اور کشمیر کے صوبیدار بھی تھے، علاوہ ازیں بہت بڑے طبیب۔ یہ پنجاب میں مغل حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ حکیم صاحب کے مضمون سے صاف مترش ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی اردو ادب کے فروغ میں مخلصانہ حصہ لے رہے تھے۔ اردو گویا ہندوستان کی قوی زبان بن رہی تھی جس میں مخزن کا کردار اردو ادب کی تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم اور زرین باب ہے۔ حکیم صاحب نے بازار حکیماں کی مغلبوں اور محمد اقبال کے فقیر اور حکیم خاندان کے بزرگوں سے تعلقات اور ان کی مغلبوں میں شرکت کے حالات ایک گونہ تفصیل سے بیان کیے ہیں، بالخصوص فقیر بجم الدین، حکیم شہباز الدین، حکیم شجاع الدین محمد، حکیم احمد شجاع کے والد ماجد اور حکیم امین الدین پیر شرایث لاء سے۔ حکیم امین الدین کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ بازار حکیماں کی محفل اجڑگی۔ محمد اقبال انارکلی

سے میکلورڈ روڈ منتقل ہو گئے مگر جب اپنے احباب شیخ گلاب دین یا مولوی احمد دین کے ہاں جاتے اور ادھر سے گزر ہوتا تو پرانی صحبوں کی یادتازہ ہو جاتی۔

۱۸۹۶ء میں حکیم شجاع الدین محمد کا انتقال ہو گیا۔ وہ بڑے صاحبِ ذوق اور فلسفی مزان بزرگ تھے، ادیب اور طبیب بھی۔ ان کے بعد حکیم امین الدین پیر سٹرنے انجمن کو سنبھالا۔ انھیں بھی علم و فضل سے بہرہ وافر ملا تھا۔ مگر ان کی قانونی سرگرمیاں انھیں پشاور لے گئیں۔ مشاعرے بند ہو گئے اور مشاعروں کے ساتھ شورِ محشر بھی۔ حکیم شہباز الدین کا دیوان خانہ البتہ شاائقین علم و ادب کا مرکز و مرکز بنا رہا۔ حکیم صاحب سے مشاعروں کا اہتمام تو نہیں ہوا کہ، البتہ ان کے دیوان خانے میں ہر روز شعر و شاعری کی محفل جمی۔ بازارِ حکیماں کی یہی محفیلیں ہیں جن کی بنی پر یہ بازار بقول حکیم احمد شجاع لاہور کا چیلیس بن گیا۔ ایک چنانچہ یہی ”چیلیس“ ہے جس میں محمد اقبال کا ۱۸۹۵ء میں گزر ہوا اور جہاں رفتہ رفتہ ان حضرات سے جوان دنوں لاہور کا دل و دماغ تھے، ان کے روابطِ قائم ہوتے گئے۔ حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں: ۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو حکیم امین الدین پیر سٹرنے کے عالیشان مکان پر شام کے چھ بجے ایک مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ حکیم شجاع الدین مہتمم مشاعرہ تھے۔ شرکاء میں نواب غلام محبوب سجافی، ارشد گورگانی، محبوب عالم شارعی شہرت، مولوی احمد دین، لالہ دھنپت رائے، میر ناظر حسین، شیخ دانشمند سقراط، حکیم شہباز الدین، شہزادہ محمد علی، فقیر سید افخار الدین، خلیفہ نظام الدین حکیم امین الدین، احمد حسین خان، لالہ موہن لال نائب معتمد مشاعرہ، لالہ منوہر لال، سردار انڈا سنگھ، لالہ ولیانگ رائے کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ اسی مشاعرے میں محمد اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کا ذکر عبدالقدار نے کیا ہے:

آپ کہتے ہیں سخنور تو سخن ور ہی سہی

احمد شجاع لکھتے ہیں کہ یہ اس بڑے مشاعرہ کا دوسرا دور تھا جس میں اقبال نے اقبال نے اپنی وہ غزل پڑھی جس میں نیسم اور تشنہ کی طرح داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ یہ غزل شورِ محشر بابت دسمبر ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی جعنوان جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال تلمذ فتح الملک حضرت داغ دہلوی، یاد رکنا چاہیے۔ محمد اقبال اس زمانے میں بی۔ اے سال سوم کے طالب علم تھے اور اگر ۱۸۷۷ء سنه ولادت ہے تو ان کی عمر اس وقت ۷۸ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں رو سائے شہر بھی تھے۔ اربابِ علم وہنر، شاعر اور سخن ور بھی۔ کچھ ان کے بزرگ، کچھ ہم

عصر، کچھ ہم جلیس، ہدم اور قدر دان کچھ دوست، شب و روز کے رفیق۔ ۱۸۹۷ء میں نواب غلام محبوب سنجانی رئیس لاہور کی سرپرستی میں انجمن اتحاد کا پھر سے احیا ہوا۔ خان احمد حسین خان صب معمول مشاعروں کا اہتمام کرتے۔ نواب صاحب کے اصطبیل میں لوہاری یا بھائی دروازے کے باہر محفلِ جمی۔ نواب صاحب لیلائے سخن کے دیوانے تھے۔ خود بھی فارسی میں شعر کہتے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ انجمن دو حصوں میں بٹ گئی۔ انجمن اتحاد تو انجمن اتحاد ہی رہی دوسرا کا نام بزم قیصری ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں انجمن اتحاد پھر زندہ ہو گئی اور نواب صاحب کے ایما سے آرنڈل اس کے صدر منتخب ہوئے۔ احمد حسین خان بدستور سرگرمی سے کام کرنے لگے وہ گویا اس بزم کے معتمد اعزازی تھے۔ اب انجمن نے ایک ادبی یا "لٹریری سوسائٹی" کا رنگ اختیار کر لیا جس میں غلوں اور نظموں کے علاوہ علمی مضمایں بھی پڑھے جاتے۔ لاہور کے ممتاز اہل علم اور سربرا آورده حضرات شریک ہوتے۔ مثلاً مسٹر مدن لال بیرون سر شہاب الدین، سرشادی لال، احمد حسین خان کی ادارت میں جو اس مجلس کے معتمد اعزازی تھے۔ رسالہ سخن جاری کیا گیا۔ مرزا ارشد گورگانی اور میر ناظر حسین ناظر کے علاوہ فوق جالب، احسن مارہروی، آغا شاعر دہلوی، راج نارائن ارمان، وجہت حسن چھنچھانوی، میر نیرنگ، اللہ بخش رفیق، عبدالجید ازل، تارا چند تارا، بہاری لال شفیق، اکبر علی حامی شارعلی شہرت اور رافت یاراحت؟ کی بدولت اہل قلم اور اہل سخن کا ایک حلقة قائم ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے انھیں دونوں میں حضرت داغ لاہور آئے۔ تارا چند تارا حلوہ سوہن فروش سے ان کے خاص مراسم تھے۔ محمد اقبال ان سے ملے ہوں گے۔ تارا کے استاد رفیق تمبک کو نوشی کرتے، لیکن ذوق سخن نے سب کو ایک رشتے میں جکڑ رکھا تھا۔ محمد اقبال روز بروز اس حلقتے میں اپنے رہے، اپنا ایک جدا گانہ مقام پیدا کر رہے تھے۔

بازار حکیماں کی صحبتوں اور مخلفوں میں محمد اقبال کے ذوق شعر کو جہاں بیش از پیش تحریک ہوئی وہاں اپنے جوہر خداد اور کمال فن کے اظہار کا انھیں ایک اور موقعہ مل گیا۔ ہمالہ ایسی نظم انھوں نے اسی مجلس میں پڑھی۔ یوں مشاعروں میں ان کا رنگ جمات علمی ادبی جرائد اور انجمنوں کی طرف سے فرمائشوں کی بھرمار ہونے لگی۔ شروع شروع میں وہ اپنا کلام تحت الملفظ سناتے۔ ایک مرتبہ دوستوں کے اصرار پر ترجم سے ایک غزل پڑھی۔ ان کی آواز قدر تبلند

اور خوش آئندہ ہے۔ طرزِ ترجم سے بھی خاصہ واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے ایک تو یہ کہ ان کے لیے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا۔ جب کبھی پڑھتے لوگ اصرار کرتے کہ لے سے پڑھا جائے۔ دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدر دان اور اسے سمجھ سکتے تھے، اس کشش کے سبب عوام بھی ٹھنچ آئے..... انہم من حمایت اسلام میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہو جاتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جاتی ہے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔<sup>۲</sup> کے رفتہ رفتہ مشاعروں میں لے سے پڑھنے کا رواج عام ہو گیا۔ شعر ان کا طرزِ ترجم اڑایا ہے مزاج کہا:

نظم اقبالی نے ہر ایک کو گویا کر دیا

لیکن یورپ سے واپسی کے بعد بہ سبب اس انقلاب کے جوان کی طبیعت میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ شاذ ہی مشاعروں میں شرکت کرتے تا آنکہ مشاعرے تو کیا شعروخن کی مغلوں میں بھی آنا جانا ترک کر دیا۔ ورنہ شروع شروع میں جب ایک نو خیز شاعر کی حیثیت سے مشاعروں میں شریک ہوتے تو، جیسا کہ قاعدہ ہے، دادخن لیتے دادخن دیتے۔ چنانچہ اس ابتدائی زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے:

ارشد و راحت سے ہوں اقبال میں خواہاں داد

آبداری میں ہیں یہ اشعار گوہر کا جواب

ارشد کا اشارہ تو ظاہر ہے مزاعبد الغنی ارشد گورکانی کی طرف ہے، راحت کا یقیناً رافت

کی طرف۔<sup>۳</sup>

کیا اس شعر کی داد بھی ملی

جب کہا میں نے کرو گے قتل کیونکر تم مجھے

مار کر تلوار بولے یہ ہے کیوں کر کا جواب

۱۹۰۸ء میں البتہ جب مولانا ظفر علی خاں کے زیر اہتمام انہم من خن قائم ہوئی اور ظہیر رضوی

کی وفات پر ایک جلسہ کیا گیا تو اس کی صدارت محمد اقبال نے کی اور اپنا کلام بھی سنایا شاید لے سے۔ انہم من خن ہی کی جانب سے مولانا ظفر علی خاں کی کوششوں سے موچی دروازہ کے باہر وہ جلسہ منعقد ہوا جس میں محمد اقبال نے اپنی مشہور نظم جواب شکوه پڑھی۔ لیکن اس ایک جلسے کے

علاوہ یہ صرف انجمن حمایت اسلام تھی جس میں قریباً قریباً ہر سال وہ اپنا کلام سناتے پیشتر لے سے۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں وہ نظمیں جو یورپ کی جنگ عظیم کے دوران یا خاتمه پر لکھی گئیں ترمیم سے پڑھی گئیں۔ بات یہ ہے کہ محمد اقبال کی شاعری نے جب ایک پیغام اور دعوت کا رنگ اختیار کر لیا تو انھیں اس امر سے کہ دوسروں کو اپنا کلام سنائیں، ان سے دادخن لیں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ وہ کہتے میرے سامنے ایک نصب العین ہے اور شاعری ان مخصوص خیالات اور تصورات کی ترجمانی کا ذریعہ جن کا تعلق اس نصب العین سے ہے۔ لہذا جبراً انجمن حمایت اسلام کے وہ کہیں بھی اپنا کلام نہ سناتے۔ فرمائش کی جاتی تو ٹال دیتے۔ اب شاعری کی حیثیت سے ان کے لیے ایک فن کی نہیں رہی تھی کہ دوسروں سے دادخن لیتے۔ وہ کہتے میرے اشعار کو نہ دیکھیے، یہ دیکھیے میں کہتا کیا ہوں۔ تا آنکہ انھیں ایک بار یوں محسوس ہوا۔ جیسے شاعری ان کے راستے میں حارج ہے۔ ان کا خیال تھا شاعری ترک کر دینی چاہیے۔ نثر میں ان کا پیغام شاید زیادہ تر موثر ثابت ہوا۔<sup>۵</sup> کچھ قسمی سے آرلنڈ کی نصیحت کا رگر آئی۔ آرلنڈ کو خوب احساس تھا محمد اقبال کی شاعری قوم میں بیداری کا صور پھونک دے گی۔ آرلنڈ کے کہنے سے محمد اقبال نے شاعری کو تو خیر باد نہیں کہی لیکن اس کا رخ جو کبھی سے بدل رہا تھا کہیتہ بدل گیا۔ بایں ہم وہ کہتے مجھ پر شاعری کی تھمت نہ باندھیے۔<sup>۶</sup> سید سلیمان لکھتے ہیں: ”کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر قصور نہ کریں“<sup>۷</sup> یہ دوسری بات ہے کہ شاعری سے اس طرح بریت کے باوجود ان کا کمال فن انہا کو پہنچ گیا، تا آنکہ وہ ترمیم اور لے جس سے کبھی حمایت اسلام کے جلوسوں میں ہر طرف محیت اور بے خودی سی طاری ہو جاتی ایک نغمہ جو بیل آشوب بن گیا، ایک پیغام سروش، ایک بانگ درا، ایک آواز رحیل کارروائی۔<sup>۸</sup>

ذاتی محفلوں میں بھی وہ شاعری پر بہت کم گفتگو کرتے بالخصوص اپنی شاعری کے بارے میں۔ اگرچہ ان کے عقیدت منداں<sup>۹</sup> میں رہتے کہ اب ان کی شاعری کا رخ کس طرف ہے۔ وہ کیا تھا تھا ہیں جن کی ترجمانی زبان شعر میں ہو رہی ہے۔ اس قسم کے سوالات گو وہ سرسری طور پر کچھ کہہ کر ٹال دیتے، ہاں جی چاہتا تو فرماتے اب میرے ذہن میں ایک ایسی نظم کا نقشہ ہے اور اس کا کوئی شعر بھی پڑھ دیتے۔ ۱۹۲۷ء میں کشمیر جاتے ہوئے میں اپنے رفقائے سفر ڈاکٹر عبدالحیم احراری مرحوم اور ڈاکٹر سید عبدالحسین کے ساتھ حاضر خدمت ہوا تو ازرہ لطف زبورِ حم کے جواب وقت زیریں تھی کچھ اشعار سنائے۔ عبدالصاحب نے وجد میں آ کر ان کے پاؤں کپڑا

لیے۔ ارشاد ہوا: ڈانٹے کی ڈیوائیں کامیڈی۔<sup>۵۴</sup> کی طرح ایک اسلامی کامیڈی کا نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ عابد صاحب نے مسکرا کر پوچھا: کیا میں اس کوئی بیاترچے<sup>۵۵</sup> بھی ہوگی؟ فرمایا: میری عمراب بیاترچے کی نہیں ہے۔ اللہ جاوید کو زندگی دے، میں اس کا نام جاوید کے نام پر رکھوں گا۔<sup>۵۶</sup>

گویا فرمائشوں پر شعر کہنا یا شعر سنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ مسح الملک بہادر حکیم اجمل خاں اور نواب ذو الفقار علی خاں کی فرمائش کو وہ کبھی رو نہیں کرتے۔ ہاشم شعیب القادر اور گرامی موجود ہوتے تو دونوں استادوں مخن ایک دوسرے کے اشعار سنتے اور اس طرح دادخن دیتے کہ شعر و شاعری کا لطف آ جاتا۔ گھنٹوں صحبت رہتی۔ لیکن بعض اوقات انکار کر دیتے تو بد مرگی کی پیدا ہو جاتی۔ بڑے بڑے والیان ریاست کی فرمائش ٹال دینے<sup>۵۷</sup> ۱۹۱۹ء میں بریلی گئے تو نواب لوہارو سے ملاقات ہوئی۔ گرامی کو لکھتے ہیں: ”نواب صاحب آپ کے بڑے مداح ہیں مجھ سے بھی شعر کی فرمائش کرتے تھے میں نے عرض کیا آپ کے سامنے شعر پڑھنا سوئے ادب ہے مجبوراً کچھ اشعار سنا پڑے“<sup>۵۸</sup> ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد گئے، مہاراجہ سر کشن پرشاد نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ بڑے بڑے ارکان ریاست شریک محفل تھے۔ لیکن اقبال، مشاعروں کے رسی آداب سے بے نیاز تھیں و آفرین کے غلغلوں سے بے پروا خاموش بیٹھے رہے۔ بمشکل چار پانچ شعر سنائے۔ محفل پر سنا چھا گیا۔ شعراء یکے بعد دیگرے اپنا کلام سناتے، نہ داد، نہ واہ واہ، تا آنکہ تیغ مولوی مسعود علی محوی کے پاس آئی۔ محوی نے غزل پڑھنا شروع کی۔ جب اس شعر پر پہنچے:

نگاہ کردن و ز دیدہ ام بہ بزم بدید  
میان چبین گل باغبان گرفت مرا

تو انھوں نے دفعتاً کہا پھر فرمائیے۔ اب پھر کیا تھا مشاعرے میں جان پیدا ہوئی۔<sup>۵۹</sup>  
۱۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء<sup>۶۰</sup> کی شام کو غازی حسین روف پاشا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ایک توسمی خطبہ ارشاد فرمایا۔ عنوان تھا: وطنیت اور اتحاد اسلامی۔ جس کی صدارت کے لیے امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی درخواست پر محمد اقبال لاہور سے دہلی آئے۔ جامعہ کے مہمان تھے۔ دارالسلام میں ڈاکٹر انصاری کے ہاں قیام رہا۔ غازی موصوف نے خطبہ پڑھا اور محمد اقبال بحیثیت صدر انتظامی کلمات کہنے کے لیے اٹھے تو غازی موصوف کے ارشادات کی رعایت سے

اسلام کے مستقبل کا خیال آ گیا۔ بے قابو ہو گئے۔ جذبات کا زور تھا۔ تقریر کرتے چلے گئے۔ تا آنکہ مسجد قرطہ کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے اور جو بہت آ گے چل کر بال جبریل میں شائع ہوئی اس کے اس شعر:

دیکھ چکا المني کوشش اصلاح دیں  
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہد کہن کے نشان

سے ابتداء کرتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا شعر پڑھنے لگے تو پھر کیا تھا سامعین وجد میں آ گئے۔ مجمع ہمہ تن گوش، محمد علی ہاں کے گوشے گوشے میں خاموشی ہی خاموشی۔ ایک تو ان کا تازہ کلام، دوسرے غازی حسین روف پاشا کی محبوب شخصیت، خلافت عثمانی کی مجاہد ان سرفروشیوں کی زندہ یادگار۔ ہر کوئی سوچ رہا تھا ہم کیا ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے یہ کہہ کر:

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا  
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

تقریختم کی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو طسم خاموشی ٹوٹا۔ شرکاءِ جلسہ آگے بڑھ بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے، اپنی عقیدت کا اٹھا کرنے لگے۔ ۸۸

رہا ان کا ترجمہ یا ان کے پڑھنے کا بے نظیر طرز سو شیخ عبد القادر لکھتے ہیں: ایک خاص اثر ان کی آواز میں تھا جو سننے سے تعلق رکھتا تھا اور لکھوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک طویل عرصے تک جس میں اپنی نظمیں ترجمہ سے پڑھتے رہے انہوں نے طے کیا کہ کسی بڑے مجمعے میں اپنی کوئی نظم ترجمہ سے نہیں پڑھیں گے لہذا وہ اپنا کلام تحت اللفظ ہی پڑھتے۔ دوستوں میں بیٹھے ہوئے بہشکل ترجمہ پر مائل ہوتے۔ اس عرصے میں مجھے اور دو اور دوستوں کو ان کی نوائے درد آغیز سننے کا موقع ملا۔ وہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس وقت آواز ریکارڈ بنانے کا رواج عام نہ تھا..... کہ ان کے پڑھنے کی بے نظیر طرز کو مستقل طرز پر مقید کر لیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جسٹس سید عبدالرؤف ..... احباب سے ملنے لا ہو ر آئے ..... جسٹس سید آغا حیدر صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ سید عبدالرؤف نے کہا..... میں انہیں رسلا ہوں میں رہا ہوں، اقبال سے ملاقات بھی رہی مگر مجھے بہت نہ ہوئی کہ میں فرمائش کرتا اپنا کلام لے سے پڑھ کر مجھے سنائیں۔ تجویز ہوئی کہ اقبال کو اور مجھے کسی دن کھانے پر بلا نہیں مگر اور کسی کو نہ بلا نہیں..... کھانے کے بعد ..... سید عبدالرؤف نے بہت اچھے لکھوں میں اپنی آرزو بیان کی..... میں بوڑھا آدمی ہوں.....

پھر یہاں آؤں نہ آؤں..... اس کا اقبال پر بہت اچھا اثر پڑا..... انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ان جھوں کے لیے ان کی خوش نوائی ایک نئی چیز تھی..... اقبال کو بھی مدت کے بعد اس طرح پڑھنے کا لطف آگیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہم تمیوں کی آنکھوں میں بھی..... آدھی رات ہو گئی..... اقبال کو بارگاہ رسالت سے عقیدت تھی، وہ ہر سید کا احترام کرتے تھے ۵۹۔ قول شیخ صاحب محمد اقبال نے احترام ان کی یہ درخواست قبول کر لی مگر شیخ صاحب نے بھی عہد کر لیا کہ آئندہ بھی اس قسم کی کوئی درخواست ان سے نہیں کریں گے۔ پھر کہتے ہیں：“کیف غم کی آواز تو اب سن نہیں سکتے مگر ان کا کلام اس سے لمبیز ہے اور اس کیف میں جوش زندگی ملا ہوا ہے”۔<sup>۶۰</sup>

## کے علی بخش

لاہور میں محمد اقبال نے طالب علمی کا تمام تر زمانہ کو آڈینگل میں گزارا۔ بجز اس کے کہ چند دنوں شیخ گلب الدین کے یہاں قیام رہا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے اور ملازمت ملی تو بھائی دروازے کے اندر میاں محمد بخش کا مکان کرائے پر لیا جس کے ایک طرف مولوی محمد باقر، پروفیسر فارسی مشن کا جس سے ذرا آگے شیش العلماء، مولوی محمد حسین، پروفیسر عربی مشن کا جس اور بازار میں مولوی حاکم علی، پروفیسر اسلامیہ کا جس اور مفتی محمد عبداللہ ٹوکنی کا قیام تھا۔ اس مکان کی نشاندہی اب ممکن نہیں۔ شاید اور بھی کئی مکان بدلتے، بازار بھائی دروازہ میں البتہ مکان ۷۱ ب میں چند ماہ ضرور تھے۔ یہ مکان کوچ جلوٹیاں کے موڑ پر جس سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ ایک کنوئیں کے پاس واقع ہے۔ محمد اقبال نے بالائی منزل کرائے پر لی۔ پھر اس کوچ کے اندر قریب ہی مکان ۷۱ ب میں اٹھ آئے اور تاسفر یو پ اسی میں مقیم رہے۔ یہیں علی بخش نے ان کی ملازمت اختیار کی۔ اس مکان پر بطور یادگار ان کے نام کی تختی لگی ہے۔ مکان کا دروازہ لگی کے اندر کھلتا ہے۔ بالائی منزل میں بازار کے رخ تین کھڑکیاں اور تین بخارچے ہیں۔ شیخ عبدالقدیر کو افسوس ہے کہ ”اقبال کے مداحوں“..... میں سے کسی کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس مکان کی ملکیت حاصل کر کے اسے قوم کے ذمے محفوظ کر لیں تاکہ ہماری نئی پود..... اس مسکن کو بھی دیکھ سکے جس میں بیٹھ کر اقبال نے اپنے اوپرین کام کا ایک معقول حصہ تصنیف کیا اور جس کے ساتھ ..... کئی روایات و حکایات وابستہ ہیں،<sup>۶۱</sup> ایک عبدالقدیر لکھتے ہیں:

یہی وہ مکان ہے جس میں بیٹھ کر، اک مولوی صاحب کی سنا تا ہوں کہاں، والی نظم لکھی گئی۔ وہ ایک صحیح واقعے کا صاف صاف بیان تھا جس سے شاعر کی عجیب اور پیچیدہ شخصیت پر بہت سی روشنی پڑتی ہے۔ جن دکانوں پر ان کا یہ مسکن واقع تھا انھیں پران کے مکان کے دوسری طرف ایک مولوی صاحب رہتے تھے جو ایک مقامی کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ انھیں حق مغفرت کرے بہت یک آدمی تھے اور درویشا نہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ خود تو بوڑھے نہ تھے اور ادھیر عمر کے تھے، مگر اقبال جوان تھا۔ انھیں اقبال کی وہ متفاہ صفات جن کا اس نظم میں تذکرہ ہے بمحض میں نہیں آتی تھیں۔ انھوں نے کسی کے رو برو تجنب کا اظہار کیا۔ اس نے وہ بات اقبال کو سنا دی اور یہاں اچھی خاصی تاریخی نظم ہو گئی۔ اقبال نے اس تضاد کا ذکر بھی کیا ہے۔<sup>۹۲</sup>

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں سے تم سخن نہیں واللہ نہیں ہے

محمد اقبال نے بھائی دروازے میں رہائش اختیار کی تو سیالکوٹ سے جو ملازم ساتھ لائے تھے اس سے کام نہ چلا۔ ملازم کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک روز مولوی حاکم علی کا ملازم علی بخش کسی کام سے ان کے یہاں آیا۔ محمد اقبال کو اس کے طور طریقے پسند آئے۔ اس سے کچھ سوال کیے۔ کہنے لگے علی بخش میرا جی چاہتا ہے تم میرے پاس آ جاؤ۔ علی بخش خاموش ہو گیا۔ شاید علی بخش کا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ ان کی بات مان لے۔ کچھ دن گزر گئے۔ اسلام پیر کالج میں چھٹیاں ہو گئیں۔ علی بخش گاؤں چلا گیا۔ اکتوبر میں واپس آیا۔ محمد اقبال سے ملا۔ سیالکوٹ کا جو ملازم ان کے یہاں کام کر رہا تھا۔ بد دیانت نکلا۔ لقطیلات ختم ہوئیں تو محمد اقبال نے علی بخش سے کہا تم میرے پاس ہی ٹھہر و مگر علی بخش نے کہا ٹھہر نے کا انتظام ہے۔ لقطیلات ختم ہوئیں۔ علی بخش کی تلاش ہونے لگی۔ بالآخر سید محمد تقی نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ علی بخش نے اپنے بڑے بھائی کو مولوی صاحب کے یہاں رکھا دیا۔ خود محمد اقبال کے پاس چلا آیا۔

علی بخش ۱۳، ۱۴ برس کی عمر، وطن اٹل گڑھ، ضلع ہو شیر پور کا ایک گاؤں۔ طبیعت کا سیدھا سادا، بات کا سچا، نیک دل، نیک خو، ناخواندہ مگر سمجھ دار، مددوب اور مختی، سرتاپا دفا، دل سے خدمت گزار۔ تاجین حیات محمد اقبال کے ساتھ رہا۔ بجز ان چند سالوں کے جب وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں علی بخش نے انھیں ایک خط بھی لکھا۔ محمد اقبال دل سے ان کی مدر کرتے تھے۔ ۱۹۰۷ء کو یک برج سے جواباً لکھتے ہیں ”بعد سلام واضح ہو،

میرے آنے میں سات ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ علی بخش کے ہاں چوری ہوئی تھی، افسوس سے کہتے ہیں: ”اگر میں یہاں نہ ہوتا تو ضرور تھاری مدد کرتا۔“ شادی کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں کہ یہوی کو آسودہ رکھ سکتے ہو تو کرو۔<sup>۳۹</sup> واپس آئے تو پھر علی بخش کی تلاش شروع ہوئی۔ علی بخش مل گیا۔ محمد اقبال ہائیکورٹ سے نکل رہے تھے۔ علی بخش کو دیکھ کر بغل گیر ہو گئے۔ علی بخش پھر محمد اقبال کے پاس آگ کیا اور ایسا آیا کہ انھیں کا ہورہا۔ شروع شروع میں تو جیسی صلاحیت تھی ویسے کام کرتا تھا۔ کھانا پکتا۔ رفتہ رفتہ سارے گھر کا انتظام و انصرام علی بخش کے ہاتھ میں آ گیا۔ علی بخش کہنے کو ملازم تھا، حقیقت میں صبح و شام کا حاضر باش حتیٰ کہ بندہ و آقا کی تمیز اٹھ گئی۔ علی بخش اور ڈاکٹر صاحب،<sup>۴۰</sup> لازم و ملزم ہو گئے۔ اس اثناء میں علی بخش کی شادی بھی ہوئی۔ گھر والے مصر کے علی بخش گاؤں چلا آئے۔ علی بخش ترک ملازمت پر مجبور ہو گیا۔ محمد اقبال کہتے ہیں: علی بخش کیا واقعی تم میرا ساتھ چھوڑ دو گے؟ بالآخر طے پایا کہ علی بخش کچھ دنوں چھٹی لے کر گھر ہو آیا کرے۔ جب تک علی بخش کی یہوی زندہ رہی بھی معمول رہا۔ مگر چند ہی سال گزرے تھے کہ یہوی کا انتقال ہو گیا۔ علی بخش نے پھر دوسری شادی نہیں کی۔ اب ڈاکٹر صاحب، ہی اس کی ساری کائنات تھے۔ ڈاکٹر صاحب، جہاں کہیں رہے علی بخش ساتھ تھا، انارکلی میں ساتھ، میکلوڈ روڈ میں ساتھ، جاوید منزل میں ساتھ۔

علی بخش محمد اقبال کا خدمت گزار رہی نہیں، مراج شناس بھی تھا۔ ان کی صحبت میں آپ ہی آپ اس کی تربیت ہوتی گئی۔ آپ ہی آپ سمجھ گیا، ان کا معمول کیا ہے۔ علی بخش ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا تھا۔ ۱۹۰۵ء تک تو اس کی ملازمت کا ابتدائی دور تھا، عمر بھی کچھ تھی لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد جیسے جیسے دن گزرتے گئے علی بخش سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب، کیا ہیں۔ انھیں دولت کی خواہش ہے نہ نام و نمود کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ نہیں ہے، پھر بھی بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب صحیح بہت سویرے اٹھتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ پھر کوئی کتاب۔ عدالت جانا ہوتا ہے تو عدالت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ واپس آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سہ پھر ہوتی تو ملاقاتیوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا۔ علی بخش گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ سارا وقت ڈاکٹر صاحب ہی کی خدمت میں گزارتا۔ ڈاکٹر صاحب کو دن بھر حق کی طلب رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آواز آتی علی بخش، بخش کو اچھا خاصہ طول دیتے، علی بخش حقہ، تا آنکہ علی بخش، حقہ اور ڈاکٹر صاحب لازم و ملزم ہو گئے۔ معلوم

نہیں یہ تینیٹ کب قائم ہوئی۔ یقیناً علی بخش کے آنے پر۔ شیخ عبدالقدار لکھتے ہیں: ”علی بخش اوپر کی منزل میں چولہا گرم رکھتا تاکہ اپنے مالک کا حقہ ساعت بساعت تیار کرتا رہے۔“<sup>۹۵</sup> گویا محمد اقبال اس سے بہت پہلے ہی حقہ پی رہے تھے، سیالکوٹ ہی میں، شاید طالب علمی کے آغاز میں۔ گھر میں حقے کا دور چلتا۔ ان کے والد ماجد اور بڑے بھائی حقے کے شوقین تھے۔ حقے کی شوقین تھے۔ حقے کی انھیں ہمیشہ طلب رہی۔ میں نے دیکھا ہے سفر میں حقہ تو مل نہیں سکتا تھا۔ سگریٹ پیتے، تیکین نہ ہوتی۔ دہلی میں اگر کہیں دو ایک روز ٹھہرنا ہوا تو میزبان کے یہاں حق کا خاص طور سے اہتمام ہوتا۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں: علام اقبال ایک مقدمے کے سلسلے میں کیمبل پور گئے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ کیمبل پور سے واپس آئے۔ آدمی رات کے قریب وزیر آباد جنتشن سے سیالکوٹ کے لیے گاڑی بنی تھی۔ گاڑی صبح پانچ بجے چلتی تھی۔ سیالکوٹ والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب انھیں حقے کی طلب تھی۔ قلی جو سامان اٹھا کر لا یا تھا اس سے کہا، اگر اس وقت گھر سے حقے لے آؤ تو تمھیں انعام ملے گا۔ قلی انعام کے لامچے میں تھوڑی سی دیر میں ایک بوسیدہ حقے لے کر آگیا۔ مٹی کا پیندا، ٹوٹی ہوئی چلم، مگر علامہ حق کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ بستر کو پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ اس پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگے۔ قلی بھی پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ حقہ پیتے۔ اس قلی سے با تین کرنے لگے۔ شیخ اعجاز احمد نے کہا حقہ تو بڑا گندा..... ہے، کہنے لگے جسے تمباکو کی عادت پڑ جائے اسے طلب کے وقت ان نزاکتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ تم اس کی عادت نہ ڈالنا۔<sup>۹۶</sup>

شروع شروع میں تو جیسا کہ لکھا جا چکا ہے علی بخش ہی سب کام کا ج کرتا، ۱۹۰۸ء کے بعد جب باقاعدہ گھر بنا تو گھر کے اندر کوئی ماما اور ملازمہ کرنے لگی۔ آگے چل کر دو ایک ملازموں کا اضافہ ہو گیا پھر بھی گھر کا انتظام، ملازموں کی نگرانی، گھر سے باہر کے کام یہ سب با تین علی بخش ہی کے ذمے تھیں۔ علی بخش ہی ان کا معتمد علیہ تھا۔ دن رات خیال رکھتا، کوئی بات ان کے خلاف مزاج نہ ہونے پائے۔ اپنی بساط کے مطابق جان گیا تھا ڈاکٹر صاحب کیا ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں، بہت بڑے سیاست دان، اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے والے۔ جب ہی تو لوگ دن رات ان کے پاس آتے ہیں۔ طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔ سہ پہر سے رات ہو جاتی ہے۔ علی بخش بڑے سلیقے سے ان کی پیشوائی کے لیے آگے بڑھتا۔ رفتہ رفتہ اس کا شمار بھی ڈاکٹر صاحب کے حلقوں میں ہونے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مند بھی اس سے دوستوں کی طرح

ملے، عزت کرتے، اس سے چھپڑ چھاڑ رہتی۔ محمود شیرانی مرحوم اسے پیر بھائی کہتے۔ علی بخش نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے دیکھے۔ ڈاکٹر صاحب، کو ظمیں پڑھتے سنا اور پھر وہ پر آشوب زمانہ بھی جو ۱۹۱۸ء میں طرابلس اور ایطالوی محلے سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح پر ختم ہوا۔ اس نے ترکوں کو شکست اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ غلافت کے خاتمے، لیک اور کانگرس، آگے چل کر شدھی، سنگھن تبلیغ اور کشمیر کے ہنگاموں کو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب، کے شب و روز اس کے سامنے تھے اور اس نے جہاں تک ممکن تھا ان کے دل و دماغ کی کیفیتوں کو سمجھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا تھے کیا ہو گئے۔ ان کی مصروفیتیں کس قدر بڑھ گئی ہیں۔ ان کے احباب ہی نہیں اور بھی تو کئی طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں سکھ اور عیسائی، ارباب حکومت، ارباب سیاست، ارباب علم، بزرگان دین، عام خاص، سب۔ وہ دیکھتا اسلام کی باتیں ہو رہی ہیں، سیاست زیر بحث آتی ہے۔ علی بخش کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کون کس غرض سے آتا ہے۔ دوست کون ہے، دشمن کون۔ ڈاکٹر صاحب کا خاص حلقة کیا ہے۔ ان کے عقیدت مند کون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ملاقاتی تھوڑی دریٹھیں یا زیادہ، نشستیں طویل ہوں یا مختصر، احباب کا حلقة ہو یا قومی اور سیاسی معاملات کی گفتگو، تخلیہ یارازداری، علی بخش کی ہربات پر نظر رہتی۔ خوب جانتا..... ملاقا تیں رسی ہیں۔ کوئی ذاتی یا سیاسی مقصود نہیں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھٹک لایا ہے۔ مزاج پر سی ہو رہی ہے یاد نیاداری۔ آنے والے حال پوچھنے آتے ہیں یا کچھ معلوم کرنے۔ علی بخش سب کو جان گیا تھا، سب کو سمجھتا، حتیٰ کہ ان پر رائے زنی بھی کرتا۔

علی بخش شب و روز کا حاضر باش، تمیں بتیں برس کا ساتھ، ڈاکٹر صاحب کے ظاہر و باطن سے واقف۔ علی بخش سے زیادہ کس کی بات سند ہو سکتی ہے۔ علی بخش کہتا میں پڑھا لکھا آدمی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھتا خوب ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی رمزیں ہوتی ہیں کہ اللہ والے ہی جانتے ہیں۔ مجھے شکوہ کے کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ اپنے دیہاتی لمحے اور روئی پھولی اُردو میں شکوہ کے اشعار سناتا۔ ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کا حال بیان کرتا: ڈاکٹر صاحب شعر کہتے تو بے چینی اور بے تابی کی سی کیفیت ہوتی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے۔ میں پنگ کے پاس کافند پنسل رکھ دیتا۔ اکثر ڈھانی تین بجے صبح شعر کہنا شروع کرتے اور پھر کہتے ہی چلتے۔ رک جاتے تو مجھ سے کہتے علی بخش قرآن مجید لے آؤ۔ یوں بھی دن میں کئی بار قرآن

مجید طلب کرتے۔ بہت سویرے اٹھتے بہت کم سوتے، فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ ایسی پراڑ کے پھر بھی پانی ہو جائیں۔ تجدبی پڑھتے۔ میں سونے سے پہلے مصلا اور وضو کے لیے پانی رکھتا۔ انھوں نے مہینوں باقاعدگی سے تجدب پڑھی۔ پہلے کالج میں ملازم تھے۔ یورپ سے واپس آئے تو کالج میں پڑھانے لگے۔ پھر دفعتاً نوکری چھوڑ دی۔ دنیا دار آدمی نہیں تھے تو کری میں جی نہیں لگا۔ کہتے علی بخش نوکری میں بڑی مشکلیں ہیں۔ میں قوم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، انگریز کی نوکری کی تو کہہ نہ سکوں گا۔ وکالت شروع کر دی، لیکن مقدمے بہت کم لیتے۔ پانچ سو ماہوار میں جاتے تو کہتے مشی صاحب اور مقدمہ نہ لیجیے گا۔ شیخ طاہر دین دروز والے ان کے مشی تھے۔ وہی سارا حساب رکھتے۔ مکان کا کرایہ دیتے۔ گھر کے اخراجات اور جیسی بھی کوئی ضرورت ہو پوری کرتے، ڈاکٹر صاحب کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔ سفر میں بھی جو کچھ ہوتا میرے پاس رہتا۔ آمد اور خرچ کا حساب پوری پوری تفصیل اور باقاعدگی سے رکھا جاتا۔ مشی طاہر دین صاحب کے تمیں بتیں برس کا رکھا ہوا حساب موجود ہے۔ کہیں پائی کا فرق نہیں۔ ۷۹ وکالت کا سارا کام انھیں کے سپرد تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے وکالت چھوڑ دی۔ شیخ صاحب اپنا کام کرنے لگے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کاغذات انھیں کے پاس رہتے۔ ڈاکٹر صاحب تینواہ دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے تینواہ نہیں لی۔ نماز فجر اور تلاوت کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک آرام کری پر بیٹھ جاتے۔ میں ان کے سامنے حقہ رکھ دیتا۔ عدالت جانا ہوتا تو کاغذات دیکھتے نہیں تو کچھ لکھتے، کچھ پڑھتے۔ پڑھتے بہت زیادہ۔ مقدمے کی تیاری صرف ایک دن پہلے کرتے۔ دوپہر میں ذرا سا آرام کر لیتے۔ ٹھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔ سہ پہر میں لوگوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا۔ رات کو ایک بجے تک محفل جمعتی۔ ڈاکٹر صاحب خوب باتیں کرتے۔ خوب حقہ پیتے۔ رات کو بہت کم سوتے، یہی تین چار گھنٹے۔ نیند گہری نہیں تھی۔ رات کو کھانا نہیں کھاتے۔ جی چاہتا تو دو دھپی لیتے، یاد لیا استعمال کر لیا یا پھر نمکین چائے پر ہی آکھتا کرتے۔ ناشتہ بھی معمولی تھا۔ یہی لیکی کا گلاس یا چائے کی ایک پیالی اور سکٹ۔ کبھی چائے پیتے ہی نہیں تھے۔ لیکن تھے خوش خوار اک گوکھاتے بہت کم۔ چاہتے تھے سالم عمدہ ہو۔ میں دو ایک سال میں تیار کر رکھتا۔ پلاو اور شب دیگ بہت مرغوب تھی۔ لباس میں چھوٹا کوٹ، شلوار قمپیش، سر پر ترکی ٹوپی، لنگی یا گڑی۔ ممل کی موئیار گنگ کی گڑی خاص طور سے پسند تھی۔ ولایت جانے سے پہلے سوٹ نہیں پہنا۔ ولایت سے واپس آ کر کوٹ پتلون پہننے لگے۔ مگر کوٹ پتلون سے انھیں

بڑی نفرت تھی۔ بس مجبوراً پہنچتے۔ گھر آتے تو فوراً اتارنے کی کوشش کرتے۔ قلعہ گجر سنجھ میں نظام الدین درزی کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ بڑی محنت سے ان کے کپڑے تیار کرتا۔ انارکلی میں تھے تو بگھی میں بیٹھ کر کچھری جاتے۔ میکلوڈ روڈ آئے تو ایک موڑ خرید لی گئر بہت کم اس میں بیٹھتے۔ بڑے حرم دل تھے۔ ایک مرتبہ چور گھس آیا، پکڑا گیا۔ ہم نے اس کی پٹائی کی توروک دیا۔ اسے کھانا کھلایا اور چھوڑ دیا۔ شروع شروع میں ان کی نظمیں شیخ عبدالقدار لے جاتے، زمیندار میں شائع ہوتیں۔ پھر فضل الہی مرغوب رقم نے ایک ایک نظم کتابی شکل میں چھانپی شروع کر دی۔ انھیں خود چھانپنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے شفیق اور مہربان تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ ملازمین کی دعوت کرتے۔ اچھی اچھی چیزیں کھلاتے۔ مجھ سے کبھی خفافیں ہوئے۔ ایک آدھ بار غصہ آیا بھی تو یونہی ذرا سی دیر کے لیے۔ ایک مرتبہ ان کے بھانجے نے مجھے گالی دی تو ڈاکٹر صاحب نے اسے پیٹا۔ سختی سے سرزنش کی۔

علی بخش گرامی مرحوم کی باتیں بڑے مزے سے بیان کرتا۔ گرامی کالا ہور آنا۔ انارکلی میں قیام، گھنٹوں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شعرو شاعری کی نشستیں گرامی کچھ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ دنیا میں محمد اقبال ایسے آقا اور علی بخش ایسے ملازم کی مثالیں، بہت کم ملیں گی۔ علی بخش محض علی بخش نہیں تھا محمد اقبال کی زندگی کا جزو تھا۔ وہ ابتدائی میں اپنے آپ کو ان سے وابستہ کر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے لیے اس کی دل سوزی بڑھتی گئی۔ بالخصوص ان کی آخری علاالت کے ایام میں، جب علی بخش کی ذمہ داریوں میں اضافے پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ علی بخش خود بھی جوانی اور کھولت کی منزلوں سے گزر کر بڑھا پے میں قدم رکھ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود علی بخش کے دن رات تیارداری میں گزرتے۔ لحظہ بہ لحظہ خبر گیری، ذرا ذرا سے وقوف پر دوا اور غذا کا اہتمام، حقہ پیا نہیں جاتا لیکن چلم بدی جا رہی ہے۔ ملاقاتی آرہے ہیں۔ تیاردار بیٹھے ہیں۔ ان کے لیے چائے لا رہا ہے۔ اسے بچوں کا خیال ہے، نشی طاہر دین سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے ہاں جانا ہوگا۔ علی بخش ایک ایک کر کے سب کام نبٹا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مٹھی چاپی بھی ہو رہی ہے۔ کپڑے بدلوانا، بستر ٹھیک کرتا، بستر ذرا ذرا سی دیر کے بعد ٹھیک کیا جاتا۔ تکیے ادھر سے ادھر رکھے جاتے۔ علی بخش کو ایک لمحے کی فرصت نہیں۔ ابھی خواب گاہ میں تھا، ابھی برآمدے، ابھی باور پی خانے، ابھی باہر ٹھکن میں۔ ہاتھ میں چلم ہے۔ ملاقاتیوں کی اطلاع کر رہا ہے۔ آفرین ہے علی بخش پر۔ نہ ماتھے پر بل، نہ دل پر بوجھ۔ محفل جمی ہے۔ اور موقعہ ملا تو علی

بخش بھی شریک گئنگو ہے۔ کوئی بات سمجھ میں آئی تو رائے زنی بھی کرے گا۔ چاہتا ہے ڈاکٹر صاحب کا دل بہلے۔ احباب بیٹھے ہیں، چھیر چھاڑ ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہیں تو علی بخش خوش ہو جاتا ہے۔ پچکے چپکے دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو محبت دے۔ تا آنکہ وہ رات آگئی جب صبح ہو رہی تھی۔ جب انھوں نے علی بخش کو شانوں کو دبانے کے لیے کہا۔ جب ذرا سے وقٹے کے بعد پاؤں پھیلادیئے، دل پر ہاتھ رکھ کر کہا یا اللہ۔ علی بخش میرے بیباں درد ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی سر جھکنے لگا۔ علی بخش نے آگے بڑھ کر سہارا دیا تو انھوں نے قلبہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ علی بخش کا لکھج دھک سے رہ گیا۔ آنسوؤں کی چھڑی گلگئی۔ بے تابانہ کبھی باہر کا رُخ کرتا کبھی سرہانے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ علی بخش اس سے پہلے بھی ایک روز بہت رویا۔ فرمایا میں تیس برس کا ساتھ ہے، رو یعنے دو، جی ہاکا ہو جائے گا۔<sup>۹۸</sup> ایک روز کیا دیکھتا ہوں علی بخش برآمدے کی سیڑھیوں میں افسرده اور پُر مردہ بیٹھا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا علی بخش خیر تو ہے۔ خاموش رہا۔ میں تیزی سے خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ سلام کے بعد علی بخش کا پوچھا، کہنے لگے بے وقوف ہے اسے سمجھا۔ اگر کسی نے مجھے رُبھلا کہا ہے تو اس میں خفگی کی کیا بات ہے ہر شخص کا حق ہے جیسی چاہے کسی کے بارے میں رائے قائم کر لے لیکن سوچ سمجھ کر، سوئے ظن گناہ ہے۔<sup>۹۹</sup>

علی بخش محمد اقبال کا خدمت گزار، محمد اقبال کا حاضر باش، محمد اقبال کی زندگی کا جزو۔ تیس بیس برس کا ساتھ، محمد اقبال کہتے علی بخش کا خیال رکھا جائے، اس کی دل شکنی نہ ہو۔ علی بخش ڈاکٹر صاحب کی یاد لیے جاوید منزل ہی میں مقیم رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے عقیدت منداں کی دل سے قدر کرتے۔ علی بخش، علی بخش نہ رہا، بابا علی بخش بن گیا۔ محمود شیرانی کہتے تھے تم میرے پیر بھائی ہو۔ پاکستان قائم ہوا تو سرکار نے اس کی خدمات کے صلے میں ایک قطعہ مر奔ج اراضی عطا کیا۔ یہ گویا قوم کی طرف سے معمولی ساہدیہ تھا اس کی خدمت گزاری کا۔ علی بخش بڑھاپے کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تو اپنے عزیزوں کے ہاں چلا گیا۔ زندگی کے آخری دن وہیں گزارے۔ صبح بھی کیا۔ وہیں چک مہر ۱۸۔ بی میں داعی اجل کو لبیک کہا، ۱۹۲۹ء میں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔<sup>۱۰۰</sup>

## ۸۔ حلقة احباب، ارباب بخن

محمد اقبال سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ شیخ گلاب دین توہم وطن تھے، ایک طرح سے ہم محلہ، میر حسن کے شاگرد۔ سید محمد تقی اور سیر بیشیر حیدر سے بچپن کی دوستی تھی۔ وہ بے فکری کے مشغلوں کبتوڑاۓ جا رہے ہیں۔ سیر و قفرتیک ہو رہی ہے۔ شعرو شاعری کی محفل جمی ہے۔ آئندہ زندگی کے نقشے بن رہے ہیں، وہ گزرے ہوئے دن، وہ پرانی یادیں وہ ایک دوسرے پر اعتماد، وہ صلاح و مشورے، رازداری۔ لاہور آئے تو یہ سب باتیں ساتھ آئیں۔ تعلقات میں عمر بھر فرق نہ آیا۔ کوئی معاملہ پیش آیا۔ کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ ان کے دست راست ہیں۔ ان کا ذکر اس سوانح میں بار بار آئے گا۔ شیخ گلاب دین تو پہلے ہی لاہور آچکے تھے، سید محمد تقی کو بھی لاہور میں ملازمت مل گئی۔ لاہور ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ کبوتر پالے اور خوب خوب پالے۔ سید بیشیر حیدر کو دوران ملازمت میں مختلف طنبوں میں رہنا پڑا۔ ہوشیار پور میں تھے تو گرامی سے خط و کتابت میں اکثر ان کا ذکر آتا۔ بیشیر بھی بالآخر جاوید منزل کے قریب سکونت پذیر ہو گئے۔ محمد تقی نے بھائی دروازے کے باہر مکان بنایا۔ ایک دوسرے سے ملتا ہوتا گھنٹوں صحبت رہتی۔ شیخ گلاب دین دین علالت میں اکثر مزاج پسی کے لیے آتے۔ گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تو میر نیز گ، میرزا اعجاز حسین اور میاں فضل حسین سے میل جوں شروع ہوا۔ میل جوں نے گھری دوستی کارنگ اختیار کر لیا۔ ۱۸۹۶ء میں محمد دین فوق لاہور آئے۔ شعرو شاعری کا شوق تھا، ایک مشاعرے میں محمد اقبال سے ملاقات ہوئی طرح تھی

داغ کا مصرع:

نہیں معلوم اک مدت سے قاصد حال کچھ داں کا

محمد اقبال نے غزل پڑھی۔ مقطع میں استاد کی شاگردی پر اظہار فخر کیا۔ اس سے پہلے کہہ چکے تھے:

نسیم اے وشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر

مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ تھن داں پر

فوق کی باری آئی تو انہوں نے غزل پڑھی، مطلع تھا:

دیا ہر چند میں نے واسطہ گیسوئے جاناں کا

نہ چھوڑا تار کوئی دستِ وحشت نے گریباں کا

دونوں کو قریب ہونے میں دینیں گلی۔ فوق محمد اقبال کے عقیدت مند تھے۔ محمد اقبال ان کی دوستی، محبت اور خلوص کے قدر داں۔ فوق کو شعر گوئی کے ساتھ ساتھ تصنیف اور تالیف کا بھی شوق تھا۔ صحافت سے بھی لچکی تھی۔ کشمیر یوں کی زبوب عالی پر کڑھتے۔ چاہتے تھے کوئی اخبار نکالیں، پیسہ اخبار میں ملازمت اختیار کی۔ صحافت کا فن سیکھا۔ ایک کے بعد دوسرا اخبار نکلا۔ بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ اسلامی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ تصوف میں خامہ فرمائی کی۔ کشمیر تو گویا ان کا خاص موضوع تھا۔ محمد اقبال کی تعریف و توصیف میں صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالے۔ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ تعلق بڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں فوق نے پنجھہ فواد کے نام سے ایک اخبار نکالا تو محمد اقبال نے اس کی تعریف میں ایک طویل نظم لکھی۔ ۱۹۰۲ء میں کشمیری میگزین جاری کیا جو بعد میں کشمیری اخبار کے نام سے شائع ہوتا۔ کشمیری مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے محمد اقبال انھیں مجدد کشا مرہ کے نام سے یاد کرتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”آپ لاہور میں ہیں یا امیر اکمل؟“ میں آپ نے کشمیری میگزین میں میرے حالات لکھے ہیں کوئی کاپی ہے تو ارسال کیجئے۔“ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: ”اگر آپ کی کوششوں سے کشمیر کے باشندوں اور پسمندہ مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو جائے تو یہی خدمت آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔“ ۱۹۰۳ء فوچ نے رہنمائی کشمیر کے نام سے ایک رسالہ لکھا تو محمد اقبال نے اس کی تعریف کی۔ بلکہ اس رسالے کو کیا دیکھا سیاحت کشمیر کی آزادی میں چکلیاں لیتے گئی۔ سلطان زین العابدین کے حالات میں ان کی کتاب شباب کشمیر کی تصنیف پر انھیں مبارک باد دی۔ ایسے ہی تاریخ حریت اسلام کی اشاعت پر۔ یاد رفتگان کے نام سے فوق کی کتاب اہل اللہ کے حالات میں پچھی تو لکھا: ”میں اس کتاب کو دیکھ کر بے خود ہو گیا۔ بھائی فوق مجھے خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش ہے جو بادشاہوں کے نزدیک میں نہیں ملتا، کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے۔“ ۱۹۰۴ء اور پھر وہ غزل کہی جس کا مطلع ہے۔

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں  
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں  
شلامار باغ کے حالات میں فوق کا رسالہ شائع ہوا تو محمد اقبال نے تاریخ کہی۔ ”تصور باغِ جان افرا“، جس نے آگے چل کر جدید تحقیقات کی روشنی میں ایک اعلیٰ تاریخی دستاویز کی

شکل اختیار کر لی۔ فوق ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ ملا عبد الجیم سیالکوٹی کی سوانح لکھنے کا خیال آیا تو محمد اقبال نے ہر طرح سے ان کی بہت افزائی کی فوق نے رسالہ طریقت نکالا۔ محمد اقبال کی طرح وہ بھی عجمی تصوف سے بدل ہو رہے تھے۔ شکایت کی لوگ ان کے مضامین پر انہار ناراضگی کر رہے ہیں، محمد اقبال نے لکھا ان کو شکر آلو دگولیاں کھلائے مخالفت سے گھبرائے نہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: آپ تو پیر طریقت ہیں۔ خدا کرے آپ بھی کسی روز پیر جماعت علی شاہ کی طرح کشمیر جا پہنچیں۔ رسالہ طریقت بالآخر بند ہو گیا۔ متاسفانہ کہنے لگے بہتر ہوتا آپ اسے جاری رکھتے۔ طریقت جاری نہ رہ سکا تو فوق نے ماہنامہ نظام جاری کیا۔ محمد اقبال نے نظام کے لیے بھی ایک قطعہ لکھا جعنوان مکافاتِ عمل<sup>۵</sup>۔ تصوف میں مجملہ دوسری تصنیفات کے ان کا رسالہ وجданی نشر جس کا عنوان محمد اقبال نے سوز و گداز تجویز کیا تھا، انھیں بے حد پسند تھا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۱۵ء کو فوق کے کارڈ کے جواب میں کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کہتے ہیں: آپ کو آنے کی کیونکہ ممانعت ہو سکتی ہے۔ انارکلی شیر انوالہ دروازہ سے دور نہیں۔ آئیے اور کتاب ساتھ لائیے۔ نہیں تو بے کتاب ہی آئیے۔ فوق نے اسرار خودی میں حافظ کے بارے میں سوال کیا کہ ان کا مسلک گوسفندی کیسے ہو سکتا ہے؟ تو محمد اقبال نے لکھا: اس کا جواب وجданی نشر میں موجود ہے کہ عالمگیر نے جب زنان بازاری کو حکم دیا بے نکاح نہ رہیں تو ایک حسین طوائف جو شیخ سلیم اللہ جہاں آبادی کی خدمت میں روز سلام کے لیے حاضر ہوا کرتی تھی، کہنے لگی: حضرت آج میرا آخری سلام ہے۔ شیخ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگی: بادشاہ نے نکاح کے لیے جو مدت دی تھی اس میں صرف ایک دن رہ گیا ہے۔ آپ نے کہا تم سب

حافظ کا شعر:

در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند  
گر تو نمی پسندی تغیر کن فضا را  
یاد کرو۔ صح جب تم سب کو دریا میں غرق کرنے لے جائیں تو اسے بڑی خوشحالی سے نشید کرو۔  
چنانچہ یہی ہوا۔ بادشاہ پر یہ شعر سن کر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔  
محمد اقبال کہتے ہیں: اگر یہ واقعہ سچا ہے تو خود ہی غور کیجیے گو سفندی کیا ہوتی ہے۔ محمد اقبال اور فوق کے تلققات روز بروز گھرے ہوتے گئے۔ لاہور میں طویل ملاقا تین ہوتیں۔ سیالکوٹ میں تھے۔ معلوم ہوا فوق کشمیر جا رہے ہیں۔ خط لکھا سیالکوٹ ہوتے جائیے۔ تکلفی کا یہ عالم کہ محمد

اقبال یورپ سے واپس آئے۔ انارکلی میں قیام تھا۔ فوق ملاقات کے لیے گئے۔ باہر ٹھہرے رہے کہ شاید انگستان جا کر بدل گئے ہوں۔ اجازت ملے تو اندر جاؤ۔ ملاقاتی کارڈ بھیجا۔ علی بخش نے کہا ذرا تشریف رکھیے۔ ۴۔ ۵۔ منٹ کے بعد انھیں اندر لے گیا تو محمد اقبال نے کہا یہ آپ نے کیا کیا۔ ایک بے تکلف دوست اور یہ تکلف! آئیے اور بے تکلف آئیے:

بصہن گلشن ما صورت بہار بیا

کشادہ دیدہ گل بہر انتظار بیا

ایک روز فوق بیٹھے تھے کہ مشرقی طاہر دین نے کہا، ایک موکل آ گیا ہے۔ کہنے لگا سے بھاؤ ابھی فرصت نہیں۔ فوق نے کہا: پیٹ کی فکر ہونی چاہیے۔ صوفیانہ غزلیں ہو رہی تھیں۔ کہنے لگے موکل کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ یہ شغلِ تروح ہے۔ روح ہے تو سب کچھ ہے۔ ایک بار فوق کو ملے عرصہ گزر گیا تو انھیں لکھتے ہیں: آپ کی فویت اس قدر بلند ہو چکی ہے کہ نظر ہی سے غائب ہو گئے۔ فوق کا نوجوان بیٹا نوت ہو گیا تو ان کے صدمے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا: مولوی عبداللہ غزنوی درس دے رہے تھے کہ نوجوان بیٹے کے قتل کی خبر سنی۔ ایک لحظہ تامل کیا۔ پھر طلباء سے کہنے لگے: ما بہ رضائے اور راضی ہستیم، باسید کہ کار خود بکلمیم۔ مسلمان اپنے مصائب کو بھی قرب الہی کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں فوق کی ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ فوق عیادت کے لیے گئے۔ محمد اقبال پہچان نہ سکے۔ فوق دل شکستہ ہو کر واپس آ گئے۔ انھیں کیا معلوم محمد اقبال کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔ بینائی بہت کم رہ گئی ہے۔ محمد اقبال کو معلوم ہوا تو انھیں بہت دکھ ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے بھائی مراج پری کے لیے آئے تو ان سے مغدرت کی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے دن فوق شدید بخار میں بیٹلا تھے، بخار ہی کی حالت میں محمد اقبال کے انتقال کی خبر سنی۔ بمشکل جنازے کے ساتھ شاہی مسجد تک گئے۔ تاریخ کہی:

یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی

یا چراغِ محفل ہندوستان سمجھا تھا میں

فوق کی طرح بخار کے مشہور صحافی بزرگ مولوی محبوب عالم سے بھی زمانہ طالب علمی ہی میں ملاقات ہو گئی۔ تعارف محمد اقبال کے سیالکوٹی دوست چراغِ ارمونیم کے ذریعے ہوا۔ مولوی محبوب عالم عمر میں محمد اقبال سے ۱۷۔ ۱۵ سال بڑے تھے۔ لیکن تفاوت عمر دستی کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ مولوی صاحب محمد اقبال کے دل سے قدر دان تھے۔ وہ بھی انھیں بزرگ سمجھتے۔ مولوی

صاحب ضلع گوجرانوالہ کے قبیلے فیروز والہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ ۱۸۸۷ء میں بہت کے نام سے ایک ہفت روزہ اور پھر پیسے اخبار کے نام سے دوسرا ہفت روزہ شائع کیا۔ گوجرانوالہ کی فضاراں نہ آئی۔ ایک دن بوریا بستر سرپر رکھے پیداہ پلا ہور کا رُخ کیا۔ بھائی دروازہ میں اونچی مسجد کے سامنے کوچ شیش محل میں گول کی دکان تھی۔ دکان کے ساتھ پہنچنے والی چار پائچ سیڑھیاں، وہیں بستر جمادیا۔ رات بھر سڑک میں لگی ہوئی لاٹیں کی روشنی میں مطالعہ کرتے۔ دکان کی چوکی داری کے ساتھ ساتھ انہیں اخبار جاری کرنے کی فکر میں لگے رہے۔ دن کی بستر لپیٹ کر دکان میں رکھ دیتے۔ گول حکیم محمد شجاع الدین اور ان کے بھائی کا دوازدھ تھا۔ ایک دن ان کو حکیم صاحب کے یہاں لے گیا۔ یوں مولوی محبوب عالم کو بھی بازار حکیماں کی محفل میں بارہل گیا۔ انہیں نکالنے کا ارادہ تو تھا ہی احباب نے جو ہر قابل دیکھ کر ہمت بندھائی۔ پیسے اخبار نکالا۔ بڑی محنت سے اس کی اشاعت بڑھائی تا آنکہ رفتہ رفتہ علمی ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلوں اور لا ہور کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ محمد اقبال سے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں محمد اقبال کو سرکاری ملازمت کا نااہل قرار دیا گیا تو مولوی صاحب نے اس فیصلے پر پیسے اخبار میں شدید احتجاج کیا۔ ایک بار مولوی صاحب ان سے ناراض بھی ہو گئے۔ وہ یوں کہ محمد اقبال جن دونوں بھائی دروازہ میں مقیم تھے انہوں نے ایک نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی۔ جس میں ملاوں پر خوب خوب چوٹ کی گئی تھی۔ ایک شعر تھا:

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت

نام محبوبان عالم کا یونہی بد نام ہے

مولوی صاحب خفا ہو گئے۔ سمجھے ان پر چوٹ کی گئی ہے۔ پیسے اخبار میں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ محمد اقبال نے معذرت کی۔ نیاز مندانہ عرض کیا اس سے تعریض کا کوئی پہلو نہیں تھتا۔ بے تکفی تھی۔ ناراضگی جاتی رہی۔ مولوی محبوب عالم کی ابتدائی زندگی بڑی عسرت میں گزری۔ ان کی شبانہ روز محنت گلگلی میں پھر کر اخبار پیچنا، غزم و استقلال، حوصلہ مندی اور جفا کشی مثال بن گئی۔ پیسے اخبار رہفتہ وار تھا، چل نکلا تو انتخاب لا جواب نکالا۔ انگریزی پر پچے ٹھٹ بٹس ٹھٹ کے نمونے پر۔ پھر بچوں کا اخبار، زمیندار اور باغبان، تا آنکہ مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی کہ انارکلی کے عقب میں پیسے اخبار اسٹریٹ کے اندر ایک عظیم الشان مطبع قائم کیا۔

صحابیوں کے ابوالا بابن گئے۔ سرکار ہی نہیں صحافت میں بھی بڑا نام پایا۔ ۱۹۰۰ء میں پیرس کی نمائش میں شرکت کے ساتھ ساتھ اخبارنویسی کے مطالعے کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ اس خوشی میں اسلامیہ کالج میں ایک عظیم الوداعی جلسہ منعقد ہوا جس میں محمد اقبال نے بھی اس تقریب کی رعایت سے ایک طویل نظم پڑھی۔ مولوی صاحب سفر و سیاحت کے شوقین تھے۔ سرکار انگریزی نے بھی ان کی بڑی قدر کی۔ انگلستان گئے، ملک عظیم سے ملے۔ پہلی بڑگ عظیم کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پیسہ اخبار تو گویا صحابیوں کا دہستان تھا۔ بڑے بڑے صحابیوں نے یہاں اس فن میں تربیت حاصل کی۔ بڑے مکسر مزاج اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ دولت برطانیہ کے دل سے وفادار تحریک خلاف کے دوران ان سے ملا تو زعماً خلافت کو جی بھر کر کوئے لگے۔ میں نے کہا آپ بزرگ ہیں، ایسا نہ کہیے۔ خاموش ہو گئے۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا، ۲۳ مئی۔ محمد اقبال جنازے میں شریک تھے۔ تاریخ کہی:

سحرگاہان بگورستان رسیدم  
وران گورے پر از انوار دیدم  
ز ہاتف سال تاریخش شنیدم  
معلیٰ تربتِ محبوبِ عالم

ان کی صاحبزادی محترمہ فاطمہ بیگم جن کو اپنے والد ماجد کی طرح تعلیم نسوان کا جنون تھا اور جنھوں نے بڑی محنت سے مسلمان عورتوں میں تعلیم پھیلائی، اکثر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ محمد اقبال بھی ان کی بہت افزاں کرتے۔ فاطمہ بیگم صحافی باپ کی صحافی بیٹی تھیں۔ کئی سال تک ہفت روزہ خاتون کی ادارت کرتی رہیں۔ تحریک پاکستان میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ فاطمہ جناح سکول قائم کیا اور بطور ایک وقف قوم کے حوالے کر دیا۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر بھی جن سے مشاعروں میں ملاقات ہو چکی تھی، کوچہ جلویاں میں محمد اقبال کے قریب ہی رہتے۔ روزانہ ملاقات ہوتی۔ روز کا ملنا مستقل رفاقت کی تمہید ثابت ہوا۔ خان احمد حسین خان مشاعروں کا اہتمام کرتے۔ شور محسوس اور سخن کی ادارت ان کے ذمے تھی۔ ان سے شب و روز ملاقات رہتی۔ میرزا ارشد سے نیاز منداہ روابط تھے۔ نواب غلام محبوب سنجانی بزرگانہ شفقت فرماتے۔ چوہدری شہاب الدین سے بھی اسی زمانے میں ملاقات

ہوئی اور ملاقات کے ساتھ ہی باہم چھپر چھاڑ شروع ہو گئی۔ بڑے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ جب بھی موقعہ ملتا محمد اقبال انھیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی سچھتی کہہ دیتے۔ وہ ہنس کر ٹال دیتے۔ مسندس حالی کا پنجابی میں ترجمہ کیا تو محمد اقبال نے کہا پوہدری صاحب آپ نے غضب کر دیا۔ حالی نے مسندس کیا لکھی جنت الفردوس میں گھر بنا لیا۔ آپ پنجابی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ دوزخ میں گھر بنار ہے ہیں۔

۱۸۹۰ء میں میاں شاہ دین پیر ستری کر کے انگلستان سے واپس آئے، با غبان پورہ کے میاں خاندان کے چشم و چارغ تھے علم و فضل اور شعر و خن کا ذوق بزرگوں سے ورنے میں ملا۔ بڑے کامیاب وکیل تھے۔ جلد ہی بھجی کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔ قانون میں خاص نظر رکھتے۔ ادب و شعر سے فطری مناسبت اور قانون میں ان کی قابلیت مسلم تھی۔ خود شاعر، شاعروں کے قدردان۔ ابتداء میں عاشقانہ غزلیں کہتے۔ انگلستان سے واپس آئے تو رنگ خن بدل گیا۔ ہمایوں تخلص کرتے۔ محمد اقبال کو شعر و خن کی محفلوں میں دیکھا۔ سن و سال میں خاصاً فرق تھا لیکن اس فرق کے باوجود ملاقات نے دوستی اور دوستی نے گھرے روابط کارنگ اختیار کر لیا۔ ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں بھی اس توسط سے محمد اقبال کے قریب ہوتے گئے۔ محمد اقبال انھیں پیار سے مولانا کہتے۔ شعر گوئی میں بہت افزاںی کرتے۔ میاں شاہ دین کشمیر کے عاشق زارتھے۔ کشمیر جاتے، نظمیں لکھتے، محمد اقبال کو یاد کرتے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں کیا اچھا ہوتا اگر اقبال اور عبدالقدار ساتھ ہوتے۔ ناظر سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ناظر بڑا مزہ ہو جو اقبال ساتھ دے

ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالamar ہو<sup>۱۵۸</sup>

اقبال ساتھ دے سے کیا بات پیدا کی ہے۔ کشمیر سے انتہائی وابستگی کا یہ عالم کہ

بی چاہتا ہے ہو مرا مسکن نشاط باغ

مر جائیے تو ڈل کے کنارے مزار ہو

محمد اقبال کے دل میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ ان سے دادخن لیتے۔ ایک غزل میں

کہتے ہیں:

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے

یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لیے

۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو جب اچاک ان کا انتقال ہو گیا تو اسلامی پنجاب کو اس سے ایسا عظیم نقصان پہنچا جس کی تلافی برسوں تک نہ ہو سکی۔ محمد اقبال بھی ایک شفیق اور مخلص بزرگ کی دوستی سے محروم ہو گئے۔ ہمایوں کے عنوان سے تعریت میں ایک نظم لکھی۔ تاریخ کہی۔<sup>۵۰۹</sup> میاں شاہ نواز کو لکھتے ہیں:

دوش بر خاک ہمایوں بلبلے نالید و گفت  
اندریں ویرانہ ما ہم آشناۓ داشتیم

سر شفیع سے بھی، جو میاں شاہ دین کے برادر عمزاد تھے، میاں صاحب ہی کی صحبوں میں دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ سرفیع کو بھی شعر و خن کا شوق تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے۔ محمد اقبال ان کی شرافت، نیک دلی اور قومی ہمدردی کا اکثر ذکر کرتے۔ ادھر میاں صاحب کے خلوص کا یہ عالم کہ وائرانے کی کوسل کے رکن بنے تو انارکلی میں اپنا دفتر ہی نہیں، جہاں ۱۹۲۲ء تک محمد اقبال کا قیام رہا، اپنے مقدمات اور علی شیخ طاہر دین کو بھی ان کے حوالے کر گئے۔ انہوں نے انجمن حمایت اسلام، لاہور کی شہری زندگی، ملی اور سیاسی تحریکوں میں محمد اقبال کا ساتھ دیا۔ وہ ان کے خلوص اور غریب پروری کی تعریف کرتے۔ میاں صاحب کے اچاک ان کا انتقال کی خبر سنی تو دلی صدمہ ہوا۔ ۹ جنوری ۱۹۳۳ء کو سوول ملٹری گزٹ لاہور کا نمائندہ ان سے ملا تو میاں صاحب کی تعریت کرتے ہوئے کہا: خدا نے انھیں اعلیٰ فتح کی گھر بیلو اور معاشرتی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک محبت کرنے والے باپ اور خاوند ایک ممتاز قانون دان اور تیز فہم سیاست دان تھے۔ بارا اور سیاسی کافرنگسوں میں یکساں طور پر نمایاں۔<sup>۵۱۰</sup> میاں صاحب دل سے مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ سیاست میں ان کا مسلک بڑا نرم تھا۔ انھیں سرکار سے وفاداری کے طعنے دینے جاتے۔ محمد اقبال کہتے: پیشک وفاداری ان کا مسلک تھا لیکن ان معنوں میں نہیں جن میں لوگ سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی کمی ہے۔ مسلمان صحیح معنوں میں باعتبار ”یکین ویسا“، دو سیاسی جماعتوں قائم نہیں کر سکے۔ میاں صاحب ایک اعتدال پسند سیاست دان تھے۔ ملک و قوم کے بھی خواہ، ان کی سیاسی روشن و ہی تھی جو ہندوؤں میں (لبرل) اعتدال پسند سیاست دانوں کی۔<sup>۵۱۱</sup> خواجہ عبدالرحیم کو لکھتے ہیں: سر محمد شفیع کی موت سے بڑا نقصان مسلمانوں کو ہوا۔ ہندوستان بھر میں ان کا ماتم کیا گیا۔<sup>۵۱۲</sup>

میاں شاہ نواز سے، کہ سرفیع کے داماد اور میاں شاہ دین کے برادرزاد تھے، محمد اقبال کی

دوسٹی کی داستان بڑی طویل ہے۔ ان سے بھی اسی زمانے میں ملاقات ہوئی جب میاں خاندان سے ان کے تعلقات بڑھ رہے تھے۔ انگلستان سے واپس آئے تو بارہوسم کی مغلبوں، آئے دن کی ملاقاتوں، جلوسوں اور مغلبوں میں ایسا یارانہ گھٹا کہ ایک جان دو قاب کی صورت پیدا ہو گئی۔ شاہنواز اور محمد اقبال ایک دوسرے کے ہدم، ندیم و جلیس تھے۔ دوستی ایسی کہ دوران علاالت میں بھی ایک دوسرے سے ملنے میں فرق نہ آیا۔ ایک دوسرے کی مزانج پر سی سے غافل نہ رہتے۔ محمد اقبال علیل ہیں۔ اتنے علیل کہ بستر سے ہٹنا مشکل ہے۔ شاہنواز کو فائج نے بے حس و حرکت کر رکھا ہے لیکن دوستی اور محبت کا یہ عالم کے طازم انھیں گاڑی میں بٹھاتا۔ جاوید منزل لے جاتا، گاڑی محمد اقبال کے پلنگ کے ساتھ لگا دی جاتی۔ محمد اقبال بستر میں لیٹے لیٹے آگے بڑھتے، گھنٹوں با تین کرتے اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد نہ معلوم انھیں کہاں کہاں لے جاتی۔ محمد اقبال کہتے: اب تو ہمارا آپ کا ملنا چکوے چکوی کا ملنا ہے۔ شاہنواز سخن فہم تھے، وہ ملی چوہے کو دیتی ہے پیغام اتحاد، والے قطعہ میں جو محمد اقبال نے ۱۹۱۵ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھا، شاہنواز ہی کا یہ فقرہ جوانہوں نے لندن کے لاث پادری پر چست کیا تھا ظہم ہو گیا ہے کہ پادری صاحب بیل کی طرح مسلمانوں کو دعوت اتحاد دے رہے ہیں کہ آئیے مل کر ترکان بد نہاد کا قلع قلع کر دیں۔ شاہنواز سیاسی داؤ پیچ بھی خوب سمجھتے تھے۔ محمد اقبال ان کی اصابت رائے کے قائل تھے ان کے ایثار اور اخلاق کی تعریف کرتے۔ بافسوں فرماتے: شاہنواز بہت بڑا آدمی ہے، بہت بڑا آدمی ہوتا لیکن حالات راستے میں حائل ہو گئے۔ شاہنواز آگے نہ بڑھ سکے۔ میں نے ان کی دو تین ملاقاتوں کا حال دیکھا ہے۔ ان کے خلوص اور محبت کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ انھیں ملاقاتوں میں مجھے ان سے نیاز حاصل ہوا۔

میاں شاہ دین کے حلقة احباب میں میر نیرنگ، ناظر اور اعجاز بھی شامل تھے۔ چوہدری خوشی محمد ناظر ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے بریوالا ضلع گجرات میں۔ ابتدائی تعلیم گجرات ہی میں مولوی نور الدین انور سے حاصل کی۔ شعر و سخن میں بھی ان سے اصلاح لیتے۔ پھر علی گڑھ چل گئے۔ ذوق دینداری کا تھا۔ علی گڑھ کی آب و ہوانے اسے اور پروش دی۔ مولانا حالی سے رشته تلمذ قائم کیا۔ غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں۔ اردو میں، فارسی میں۔ ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کیا۔ ریاست کشمیر میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کرتے کرتے میر مال کے عہدے پر جا پہنچے تھے اور شاعر جوگی، ایسی نظم اور کشمیر کی تعریف میں کئی نظموں کے مصنف۔ ناظر سے محمد اقبال کی ملاقات

کب ہوئی یہ معلوم نہیں لیکن ناظر کا شمار بہت جلد اس حلقے میں ہونے لگا جو مولانا فیض الحسن سہار نپوری اور میر ناظر اور پھر آگے چل کر مخزن کی بدولت لاہور میں قائم ہوا جس میں آزاد اور حالی کی کوششوں کا بھی دخل ہے جیسے بار ار حکیمیں کی محفلوں، انہم حمایت اسلام کے جلسوں اور آگے چل کر مخزن کو بھی۔ ناظر کا کلام مخزن میں چھپتا۔ میاں شاہ دین سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ چنانچہ میاں صاحب ہی کی ایک نظم سے، جو اکتوبر ۱۹۰۱ء میں مخزن میں شائع ہوئی، گمان ہوتا ہے کہ محمد اقبال کی شاید اس سے بہت پہلے ناظر سے ملاقات ہو چکی تھی۔ ان سے ادبی روابط قائم تھے۔ میاں صاحب کہتے ہیں:

اعجازِ دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج  
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے آج  
اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج  
ناظر کمان فکر سے مار ایک دو خندگ

تنقید بہمدرد میں جب ایک صاحب نے محمد اقبال کے کلام پر زبان اور محاورے کی رو سے کچھ اعتراضات کیے تو ان کے ساتھ ساتھ ناظر کو بھی اپنی زد میں لے آئے۔ سید متاز علی اور میر نیرنگ نے تنقید کا جواب لکھا۔ میر نیرنگ انبلوی کے نام سے مضامین لکھے۔ محمد اقبال نے بھی تنقید بہمدرد میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ناظر ملازمت سے سبکدوش ہو کر چک جھرا میں سکونت پذیر ہو گئے۔ انتقال اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

میاں خاندان کے علاوہ ایک دوسرا خاندان جس سے محمد اقبال کے گھرے مراسم تھے اور جس سے ایک گونہ قرابت داری تھی خواجہ رحیم بخش کا خاندان ہے جن کے دولت خانے ”لی لاج“ میں آگے چل کر علم و ادب کی مخلفیں گرم ہوں گی۔ خواجہ رحیم بخش، ان کے بھائی خواجہ کریم بخش اور امیر بخش خلیفہ نظام الدین، سید محمد شاہ وکیل اور مولانا ظفر علی خاں کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ ہے۔ مولوی سراج الدین خود بھی شعر کہتے۔

یہ بزرگ جب شعر و سخن، علمی اور ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تو شعراء کے کلام پر نقد و تبصرہ کرتے، ان کی بہت بڑھاتے۔ محمد اقبال بھی بقول حکیم احمد شجاع، معمولاً جلسوں میں کوئی نظم پڑھنے سے پہلے انھیں سنایتے۔ چنانچہ ”قصویر درد“ کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اول انھیں

حضرات کو سنائی گی۔ پھر جلسہ عام میں پڑھی گئی۔ اللہ یہ حلقہ تو بزرگوں کا تھا۔ بازار حکیماں کی محفیض بھی بزرگوں ہی کے نام سے قائم تھیں۔ ان میں حکیم شجاع الدین محمد، حکیم شہباز الدین، حکیم امین الدین انھیں بزرگوں ہی کی طرح عزیز رکھتے۔ یہ بزرگ خاندان حکیماں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے پہلو بہ پہلو بھائی دروازے کا ایک دوسرا، یعنی فقیر خاندان آباد تھا۔ دونوں میں باہم قرابت داری کا تعلق بھی تھا۔ دونوں دولت علم اور ذوق ادب سے مالا مال، روسائے شہر میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے۔ خاندان حکیماں سے تقریب ملاقات مشاعروں نے پیدا کی۔ مشاعروں ہی میں فقیر سید افتخار الدین نے انھیں دیکھا۔ جو ہر قابل کے ادشاں تھے، محمد اقبال کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ فقیر صاحب کے مورث اعلیٰ فقیر سید عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر باتن دیپر تھے، بلکہ کہنا چاہیے، رنجیت سنگھ کی حکومت کو جو استحکام نصیب ہوا فقیر صاحب ہی کی بدولت۔ چنانچہ فقیر خانہ کے نام سے جو حوالی بازار حکیماں میں تعمیر ہوئی اس سے اب بھی ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فقیر افتخار الدین ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتداء صوبائی سول سروں سے کی۔ ترقی کرتے کرتے افغانستان میں قضل مقرر ہو گئے۔ سرکار انگریزی کی خدمات کے صلے میں سی آئی ای کا خطاب پایا۔ محمد اقبال کے دل سے قدر دان تھے۔ شب و روز کی ملاقاتیں، رسم و رواہ، گفتگوئیں، باوجود تقاضہ عمر چند ہی دنوں میں گھرے تعلقات قائم ہو گئے۔ سیر و تفریخ میں اکثر ساتھ لے جاتے۔ ”میں ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تھا۔ مال روڈ سے گزر رہے تھے کہ ایک انگریز افسر کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ فقیر صاحب حسب قاعدہ باہمیں جانب ہٹے، لیکن اس حد تک کہ گاڑی سڑک سے اتر گئی۔ میں نے کہا: فقیر صاحب! آپ نے گاڑی کیا ہٹائی سڑک ہی چھوڑ دی۔ کہنے لگے بخوردار! سڑک کیا چیز ہے ہم نے تو ان کے لیے ملک ہی چھوڑ دیا ہے۔“<sup>۱۵</sup>

فقیر سید محمد الدین کے ہاں بھی شعرو شاعری کا چرچا رہتا۔ وہ فقیر سید افتخار الدین کے داماد تھے۔ محمد اقبال سے بڑی محبت کرتے۔ ان کے قدر دان تھے۔ فقیر صاحب طاؤس خوب بجا تے، کہنے مشت تھے۔ محمد اقبال ان سے طاؤس سنتے۔ درباری، مالکوں، ایکن فقیر صاحب کے پسندیدہ راگ تھے۔ گھنٹوں موسیقی کی محفل جمی رہتی۔<sup>۶</sup>

۱۹۳۷ء میں جب فقیر صاحب کا انتقال ہوا تو باوجودشدید علاالت کے ان کی تعزیت کے لیے گئے، بمشکل چند الفاظ کہے۔ جسی صوت کے باعث کھل کر اظہار افسوس نہ کر سکے۔

حکیم شہباز الدین کے دیوان خانے اور بیرونی چبوترے میں احباب کی محفل جلتی۔ زیادہ تر بازار کی جانب نکلتے ہوئے چبوترے پر۔ راگبیر آتے جاتے دیکھتے۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقے میں بیٹھے ہیں، شعرو شاعری اور حقیقت کا ذور ہے۔ لاہور میں اس چبوترے (پنجابی میں تھڑے) کی یادتا دیر قائم رہی۔

بازار حکیماں ہی کی محفلوں میں محمد اقبال کا تعارف مولوی احمد دین اور سید محمد شاہ سے ہوا۔ دونوں وکالت کرتے۔ سید صاحب خاموش طبع انسان تھے مگر انہم حمایت اسلام کے سرگرم کارکن۔ انہم کے معاملات میں محمد اقبال کے شریک شعرو شاعری کا ذوق تھا۔ محمد اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ مولوی احمد دین مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے زبان اور ادب میں استاد کا رنگ اڑایا۔ سرگزشت کے مصنف، بڑے فاضل انسان تھے۔ محمد اقبال کے احباب خاص میں شامل۔ عمر میں بڑے مگر دلی دوست، قدر دان اور ہمدرد۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتداء گوجرانوالہ سے ہوئی۔ لاہور آئے۔ بی۔ اے کیا۔ طلائی تمغہ ملا۔ اس زمانے میں بی۔ اے کی سند کا ہی درجہ تھا جو آج کل بڑی سے بڑی سند کا۔ ذوق ادب خداداد تھا۔ علم و حکمت سے دلی لگاؤ، قانونی قابلیت مسلم۔ انہم حمایت اسلام کی تعلیمی اصلاحی اور علمی سرگرمیوں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ سالانہ جلسوں میں پیچھہ بھی دیتے۔ انہم کشمیری مسلمانوں میں بھی خوب خوب حصہ لیا۔ علمی زندگی کی ابتداء صحافت سے کی۔ پیسہ اخبار سے تعلق رہا۔ خود بھی غم خوار عالم کے نام سے ایک اخبار نکلا۔ اردو اخبار، سے دلی وابستگی تھی۔ تصنیفات و تالیفات میں سرگزشت الفاظ بالخصوص قبل ذکر ہے۔ ایسے ہی اور نگزیب عالمگیری کی تحقیقی سوانح محمد اقبال پر مضامین لکھتے۔ ادبی مشاغل کا آغاز کانج سے ہو چکا تھا۔ بازار حکیماں کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ رقص و سرور کے دلدادہ تھے۔ محمد اقبال سے ملاقات ہوئی تو چند ہی دونوں میں باہم شیر و شکر ہو گئے۔ تعلقات یہاں تک بڑھے کہ شب و روز ایک دوسرے کے شریک رہتے۔ ہدم اور ہم مجلس گھر کا سامعاملہ۔ کشمیر کا پہلا سفر بھی ایک ساتھ ہی کیا۔ مولوی صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ وضع داری ضرب المثل۔ پرانی تہذیب کا جیتا جا گتا نمونہ، کم گو۔ دیوانی مقدمات میں کمال مہارت۔ سادہ لباس پہنتے۔ چھوٹا کوٹ، ترکی ٹوپی سر پر۔ چھوٹی چھوٹی دارچینی۔ شیخ گلاب دین سے گہری دوستی تھی۔ محمد اقبال کا اردو مجموعہ کلام سب سے پہلے انھیں نے مرتب کیا۔ ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا۔ حالات زندگی پر قلم اٹھایا۔

محمد اقبال ان دونوں بانگ درا کی اشاعت کا اہتمام کر رہے تھے۔ ادھر مولوی صاحب نے ان کا سارا کلام جو ادھر منتشر تھا، باحتیاط جمع کرتے ہوئے اقبال کے نام سے شائع کر دیا۔ کتاب چھپ کر محمد اقبال کے پاس پہنچی تو شیخ گلاب دین سے کہنے لگے: میں تو اپنا کلام خود ہی مرتب کر رہا تھا، نظر ثانی ہو رہی تھی، کیا اچھا ہوتا مولوی صاحب ذرا انتظار کر لیتے۔ مولوی صاحب نے یہ بات سنی تو اس کا کچھ اور ہی مطلب سمجھے۔ انھیں یہ بات گوارا ہی نہیں تھی کہ محمد اقبال کو کسی پہلو سے ناراض کریں یا نقصان پہنچائیں۔ سارے کا سارا مجموعہ کتب جو چھپ کر آیا تھا، صحن میں رکھا اور نذر آتش کر دیا۔ محمد اقبال کو معلوم ہوا تو انھیں بڑا صدمہ ہوا۔ دل سے معدترت کی۔ یہ کتاب بانگ درا کی اشاعت کے بعد ۱۹۲۶ء میں اگرچہ پھر شائع ہوئی لیکن مولوی صاحب نے بہت سا کلام حذف کر دیا۔ مولوی صاحب کا اخلاص اور اپنے ایک مثال بن کر رہ گیا۔ تعلقات میں سرموفرق نہ آیا۔ مولوی صاحب ہر معاملے میں بخی ہو یا کاروباری محمد اقبال کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

در اصل یہ غلطی فہمی یا شکر رنجی جو کچھ بھی کہیے خلوص و محبت کی ایک جذباتی کیفیت تھی ورنہ مولوی صاحب کو محمد اقبال سے نہ صرف محبت تھی بلکہ ان کی دل سے عزت کرتے۔ وہ ان کی بخی کے قائل تھے۔ اگر انھیں کوئی شعر پسند نہ آتا تو نظر انداز کر دیتے۔ بھائیوں کے سے تعلقات تھے بات صرف اتنی تھی مولوی صاحب نے اپنے مجموعہ کلام میں وہ نظمیں شامل کر رکھی تھیں جن کو اقبال قلمزد کر چکے تھے۔ نظر ثانی بھی ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا ایک مجموعہ کلام ہوتے ہوئے دوسرے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ عجب سماں تھا جب مولوی صاحب صحن میں بیٹھے کتابوں کے ڈھیر کوششوں میں خاک ہوتے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ محمد اقبال کو اس کی اشاعت پر کوئی اعتراض نہ تھا، صرف ضمناً ایک بات کہہ دی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ ان کے کلام کو بے اجازت چھاپنے کے معاملے میں جیسی بھی کسی قانونی کارروائی کا معاملہ مولوی صاحب ہی کے ذمے تھا۔ مولوی صاحب کے صاحزادے خواجہ ریاض احمد کا بیان ہے کہ کتاب شیخ گلاب دین کے ایسا پر جائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ محمد اقبال کے اصرار پر اس کتاب کو پھر سے چھپوایا گیا کوئی ترمیم۔ اصل نجاح بھی محفوظ ہے۔ رقم الحروف خود بھی خواجہ صاحب سے درخواست کر چکا ہے کہ اس کی پھر اشاعت ضروری ہے بظاہر وہ اس پر آمادہ بھی تھے۔

۱۹۲۳ء کے بعد مولوی صاحب بیمار رہنے لگے۔ محمد اقبال برابران کی مزاج پر سی کے لیے

جاتے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ان کا انتقال ہوا تو بسبب نظرس کی تکلیف کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ ان کے صاحب زادے خواجہ بشیر احمد کو لکھتے ہیں: افسوس ہے مولوی صاحب کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا..... پاؤں میں سخت تکلیف تھی..... دوسرے دانت کے درد میں اضافہ ہو گیا۔ خواجہ فیروز الدین کے ہم دست اپنی معدود ری کا پیغام بھیجا تھا۔ تازیت افسوس رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری جو دعا کی گئی اس میں شریک ہونے سے محروم رہا۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ آپ کو صبر جیل عطا فرمائے۔ کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد ہے۔

شام کے قریب سب بھائی گھر پر ہی ہوں گے یہاں

احمد حسین خان سے تو شب و روز ملاقات رہتی۔ وہ بازار حکیماں کی ادبی مخلوقوں کا اہتمام کرتے۔ شور محسن اور رسالہ سخن کے مدیر اور انجمن اتحاد کے معتمد اعزازی تھے۔ ۱۸۵۵ء میں مسٹر مدن گوپال پیر سٹر کی صدارت میں اٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ سب انجمنیں مل کر کام کر رہی تھیں۔ احمد حسین خان مشاعروں کے اہتمام میں شب و روز سرگرم رہتے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلوسوں میں بھی کوئی نہ کوئی نظم پڑھتے۔ محمد اقبال نے 'شکوہ پڑھا تو اگلے ہی سال احمد حسین خاں نے اس کے جواب میں ایک نظم پڑھی 'میرا خواب' اور خاتمه اس شعر پر کیا:

پھر نہ اقبال خدا کے لیے شکوہ کرنا  
مجھ کو منظور نہیں سو کے دوبارہ مرنا

ان کا یہ مصرع احمد حسین خان زمانہ بدل گیا، دیر تک زبانِ زد خاص و عام رہا۔ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ دادا سردار یعقوب خاں کی فوج میں ملازم تھے۔ نسلاً یوسف زئی پٹھان، لاہور آگئے۔ والد ڈاکٹر محمد حسین خان میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے۔ آنری ہسپٹ بھی رہے۔ احمد حسین خاں نے ۱۸۹۶ء میں گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کیا۔ گویا ایک طرح سے محمد اقبال کے ہم مکتب تھے۔ غزل گوئی کا شوق تھا۔ میرزا ارشد گورکانی اور مولانا فیض الحسن سے کسب فیض کیا۔ بڑے پر گو۔ غزل سے نظم کی طرف آگئے۔ تصنیفات بہت تھیں۔ میخن میں بالالتزام مضمون لکھتے۔ کئی ناول اور ڈرامے لکھے۔ ۱۹۰۷ء میں مسٹر بیل ڈائرکٹر مکمل تعلیم کی سفارش پر ای۔ اے۔ سی کے امتحان میں بیٹھے، کامیاب ہو گئے۔ سرکاری ملازمت مل گئی۔ دیر تک منصف رہے۔ ایشیا نک سوسائٹی لندن گئے۔ فیلوشپ کا اعزاز ملا۔ ۱۹۱۸ء میں منصفی سے سکندوشاں ہو کر مکمل تعلیم کے پرچے ٹھی۔ بی۔ سی کی ادارت کرنے لگے۔ میخن کا دور ختم ہوا تو ایک مدت

تک شباب اردو کے نام سے ایک ماہنامہ بن کا لئے رہے۔ قیام بازار حکیماں ہی میں تھا اس لیے خاندان حکیماں اور فقیر خاندان دونوں سے قربی مراسم رہے۔ طویل عمر پائی۔ مطالعے کے بے حد شوقین تھے۔ بڑے مستعد، بڑے مختی، بازار حکیماں کی محفلوں کی روح و رواں۔ محمد اقبال کے ساتھ ساتھ چلنا، بلکہ شاید آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء کی بات ہے، عید کے موقع پر حکیم امین الدین نے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ احباب کی محفل تھی، عید کا دن، کھانے سے فراغت ہوئی تو شیخ عبدالقدار نے کہا شیخ محمد اقبال اور خان احمد حسین خاں کیوں نہ فی البدیہ ہے ایک غزل کہیں۔ مصروع طرح دیا گیا۔ احمد حسین خاں نے غزل کہی۔ محمد اقبال نے بھی چنانچہ وہ غزل اسی محفل میں کہی گئی جس کے اس شعر سے:

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں  
جنتی ہو گا فرشتوں میں نمایاں ہو گا<sup>۱۸۹۸</sup>  
اندازہ ہوتا ہے کہ خودی کا تصور، جیسا کہ عرض کیا گیا، ابتداء ہی سے ان کے دل میں ابھر رہا تھا۔

انجم حمایت اسلام کے جلوسوں میں محمد اقبال کا تعارف مرزا غلام احمد قادریانی کے بڑے صاحبزادے مرزا سلطان احمد سے ہوا۔<sup>۱۹</sup> مرزا صاحب فقیر سید افتخار الدین کے احباب میں سے تھے۔ محمد اقبال سے ملاقات کیوں نہ ہوتی۔ مرزا صاحب ۱۸۵۰ء میں قادریان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں بی۔ اے کیا۔ نائب تحصیلداری سے ڈپٹی کمشنر تک پہنچ۔ ملازمت ختم ہوئی تو بے منصب سفارت افغانستان جانے سے انکار کر دیا۔ بہاول پور میں مشیر مال کا عہدہ پیش کیا گیا۔ بہاول پور سے قادریان واپس آئے۔ گوشہ نشینی اختیار کی۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں فوت ہوئے۔ بہت بڑے مصنف تھے۔ اخلاقی مباحث پر بالخصوص قلم اٹھاتے۔ تصانیف متعدد ہیں۔ اصول فقہ اسلام، الصلوۃ، اسسوہ رسول، یاد گار حسین وغیرہ وغیرہ۔ فنون لطیفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ شاعری، موسیقی، فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری پر سیر حاصل بحث کی اور اسے محمد اقبال کے نام ان الفاظ میں ممنون کیا: آداب ایشیائی اقوام کے مطابق ہدیہ اور نذر درینے کے واسطے پہلے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس رواج کے مطابق حضرت ڈاکٹر محمد اقبال سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس روز افزوں احترام اور محبت کے اعتبار سے جو حضرت اقبال کی نسبت میرے ناچیز دل میں ہے، یہ ادنیٰ نذر پیش کرنے کی جرأت

کرتا ہوں۔ اقبال کی کشادہ دلی اور دوست نوازی سے امید کرنی چاہیے کہ مجھے شرف قبولیت سے ممتاز فرمایا جائے۔ اس طویل اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود تقادت عمر کہ مرزا صاحب محمد اقبال سے پچیس ستائیں برس بڑے تھے، انھوں نے محمد اقبال سے کس قدر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے پہلے مرزا صاحب لدھیانہ کے ماہنامہ اقبال میں بھی اکبر اور اقبال کی ذہنی اور فکری مانثت پر ایک مضمون لکھے تھے۔ اکبر نے یہ مضمون دیکھا تو ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: دل چاہا مرح سرائی کروں لیکن وہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا۔

خوب ہے موععظتِ حضرت سلطان احمد  
دل انساں کی چمک خوب کہ سونا بہتر  
غفلت و کبر سے غم خانہ اکبر اچھا  
خندہ جام سے اقبال کا رونا بہتر  
ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن  
اپنے مدار کا مدار نہ ہونا بہتر

تین شعر ہیں۔ خاتمے پر لکھتے ہیں: مجھ میں اور حضرت اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی آواز ہے۔<sup>۱۲۰</sup> مرزا سلطان احمد نے احمدیت قبول نہیں کی۔ میخزن میں طرح طرح کے مباحث پر مسلسل قلم اٹھاتے۔ منشوی اسرار خودی پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مخالفین کے اعتراضات کا بڑی خوبی سے جواب دیا ہے۔<sup>۱۲۱</sup> انجمن حمایت اسلام کے جلوسوں میں شریک ہوتے۔ صدارت فرماتے۔ شمع و شاعر پڑھی گئی اور سید افتخار الدین کے ساتھ صدارت میں شریک ہوئے اور مراحاً محمد اقبال کو ہر جائی تھہرا یا تو محمد اقبال کا وہ مشہور قطعہ ”گاہ بالسلطان باشی گاہ باشی بافقی“، ارجمند اُسی ہر جائی کے جواب میں موزوں ہوا۔

پیسے اخبار کے پہلو بہ پہلو لا ہور سے ایک دوسرا اخبار وطن کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ وطن نے بھی لا ہور میں اردو صحافت کو خوب خوب فروغ دیا۔ وطن مولوی انشاء اللہ خاں کی ادارت اور ملکیت میں ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔ مولوی صاحب بھی ایک طرح سے مولوی مجتبی عالم کے ہم وطن تھے۔ وہ بھی گوجرانوالہ سے لا ہور آئے۔ اور صحافت کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ، دولت عثمانی، ترکوں اور ترکی کے بارے میں تفہیمات اور تالیفات اور تراجم کا سلسہ شروع کر دیا، اس حد تک کہ یہ سلسلہ وطن ہی سے مختصر ہو گیا۔ ادارہ طباعت کا نام بھی سلطان

عبدالحمید کے نام کی رعایت سے حمید یہ ایجنسی رکھا گیا۔ جاگز ریلوے پر باغصوص مضاہمین شائع کرتے۔ یہہ زمانہ تھا جب تحریک اتحاد اسلامی کو سلطان عبدالحمید کی زبردست تائید حاصل تھی۔ سلطان کا خیال تھا یوں دولت عثمانیہ کے ساتھ ساتھ دول مغرب کے مقابلے میں بھی سلطنت کے حفظ و استحکام کا ایک ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔ مولوی صاحب کوتار کوں سے دلی تعلق تھا اور یہی ان کے اخبار اور انشا پردازی کا سب سے بڑا موضوع۔ محمد اقبال سے بھی ان کے گھرے روابط تھے۔ بلکہ بے تکلفی۔ محمد اقبال یورپ گئے تو دوران سفر میں اور پھر کیسر ج پہنچ کر سفر کے بارے میں جو خط لکھے مولوی صاحب کو ہی لکھے۔ ان خطوں سے ہی ہمیں ان کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ یورپ سے واپس آئے، انارکلی میں قیام تھا۔ مولوی صاحب کا دہلی دروازے سے باہر وطن بلڈنگ میں، جوانارکلی سے زیادہ دور نہیں۔ مولوی صاحب اکثر ملاقات کے لیے آتے۔ انارکلی میں کشمیری طوائفیں رہتی تھیں، انھیں کسی دوسرا جگہ اٹھوایا گیا تو مولوی صاحب کہنے لگے: اب آپ کا جی کیسے لگے گا؟ محمد اقبال نے کہا مولوی صاحب کیا کیا جائے، وہ بھی تو آخر وطن ہی کی بھئیں ہیں۔

خان صاحب، میر منشی سراج الدین، محمد اقبال کے قریباً قریباً ہم عمر، ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے، ۲۶ فروری۔ بزرگوں کا پیشہ زمینداری تھا۔ کشمیر کے اکثر خاندانوں کی طرح ترک وطن پر مجبور ہو کر لاہور آگئے۔ منشی محمد اسماعیل وکیل لاہور کے بڑے صاحبزادے۔ ابتدائی تعلیم جہلم سے حاصل کی، پھر فارمن کر پھیں کانج لاہور میں داخلہ لیا تھا کہ ۱۸۹۴ء میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ شیر انوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں انگریزی اور فارسی پڑھانے لگے لیکن چند مہینوں سے زیادہ ملازمت نہ کر سکے۔ طبیعت کے غیور تھے، آزاد رو، خود دار، ملازمت چھوڑ دی۔ شعر و خن سے دلی شغف تھا۔ مشاعروں میں شریک ہوتے۔ مشاعروں میں شرکت ہی محمد اقبال سے تعارف کا ذریعہ بی۔ تعارف ہوا تو تعارف دلی دوستی سے بدل گیا۔ محمد اقبال سے شب و روز نشت رہتی۔ طبیعت نہایت موزوں پائی تھی۔ حافظ غصب کا تھا۔ اردو فارسی کے دیوان از بر۔ آپ نے کوئی شعر پڑھا، انھوں نے سنتے ہی اساتذہ کے کلام سے اسی مضمون کے دس شعر سنادیے۔ جہاں بیٹھے ہیں شعر گنگنا رہے ہیں۔ بڑے جہیر الصوت۔ شعر گنگنا تے آواز بلند ہوتی چلی جاتی اور پھر یوں محسوس ہوتا جیسے منشی صاحب عالم کیف میں کھوئے گئے ہیں۔ منشی صاحب کو خاص صاحب ہی کہا جاتا۔ وہ مشاعروں کی رونق تھے۔ سخن فہم، سخن سخن۔

جہاں بیٹھے ہیں مجفل جمی ہے، شعر اور شاعری پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ذوقِ سخن کی پروپریتی جارہی ہے۔ مشاعر و دل میں کرسی صدارت ان کی منتظر رہتی۔ ایسا رنگ جنمتا کہ لوگ قائل ہو جاتے۔ بڑا رعب دار پھرہ، تخت خشی داڑھی بڑی موچھیں، جسم بھاری، سوٹ زیب بدن، سر پر اوپھی دیوار کی سبزِ محملیں ٹوپی جس سے مرزا غالب کی کلاہ پاپاخ کی یادِ تازہ ہو جاتی۔ ان کی شخصیت شاعر و دل پر چھائی رہتی۔ لب و لبجہ اہل زبان کا۔ بڑی تمکنت اور وقار سے گفتگو فرماتے۔ مزان میں ظرافت۔ حاضر جواب ایسے کہ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ بات میں بات پیدا کرنا انھیں کا حصہ تھا۔ کہتے ہیں شاعر نہیں، شاعر کو تو نہ ہوں۔ ایک ایک مصرع پر گرفت کرتے۔ یہاں زبان کی غلطی ہے۔ یہ محاورہ ٹھیک نہیں، مضمونِ ناقص ہے۔ شاعر شعر پڑھنے سے گھبرا تا۔ محمد اقبال ان کے ذوقِ شعر کے قائل تھے۔ انھیں اپنا تازہ کلام سمجھتے۔ ان کی پسندیدگی اور سخن نہیں سے لطف اٹھاتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں آپ کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے، اگر نیچپر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرة شعرا میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں، بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اس سے بہتر<sup>۲۲</sup>۔ خان صاحب نے ملازمت چھوڑ دی۔ بے کار تھے، اتفاقاً سید محمد تقی سے معلوم ہوا کہ کشمیر ریڈینگسی میں ملکر کوں کی آسامیاں خالی ہیں۔ اردو فارسی میں قابل ملازمت میں کی ضرورت ہے۔ ریڈینگ کو بھی فارسی کا خاصاً ذوق تھا۔ خان صاحب سیالکوٹ پہنچے۔ سردیوں میں ریڈینگ کا دفتر سیالکوٹ منتقل ہو جاتا۔ میر حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ظاہر ہے محمد اقبال نے بھی ذکر کیا ہو گا۔ انھوں نے سفارش کی، ملازمت مل گئی۔ میر حسن کا نیاز حاصل ہو گیا۔ ہر سال سیالکوٹ آتے۔ بادب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ علم و ادب اور شعروخن میں استفادہ کرتے۔ خان صاحب نے میر حسن کے طریق درس کا حال بڑی خوبی سے لکھا ہے<sup>۲۳</sup>۔

خان صاحب کی ملازمت کا آغاز ۱۸۹۹ء میں ہوا۔ کچھ عرصہ لیہ (لداخ) میں بھی گزرا۔ پھر سری نگر آگئے اور ترقی کرتے کرتے میرنشی ہو گئے۔ خان صاحب کا خطاب پایا۔ کشمیر میں جو بھی ریڈینگ آتا ان کی علمِ دوستی اور ذوقِ ادب سے اس قدر متاثر ہوتا کہ کشمیر سے واپسی کی نوبت آتی تو اپنی کتابیں ان کی نذر کر دیتا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کا مجموعہ کتب کشمیر یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ایک خاص تقریب کا اہتمام ہوا۔ جس میں بیگم صاحب بھی موجود تھیں۔ خان صاحب نے بڑی نادر اور کمیاب کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ کئی ایک نئے ایسے بھی

جن کی پھر سے طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ قلمی کتابیں۔ خان صاحب ان کی جلد بندی اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ نئی کتابوں سے انھیں دلی لگاؤ تھا بمشکل کسی کو مستعار دیتے۔ ۱۹۰۳ء میں جب کشیر کو ایک قیامت خیر سیلا بے آ لیا تو انھیں گھر کے ساز و سامان کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کتابوں کی حفاظت کا۔ دن رات مطالعے میں منہمک رہتے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت سے با عزاز سبک دوش ہوئے۔ سری گنگر کے محلہ نواب پورہ میں مکان بنوایا اور اپنے بڑے صاحبزادے بشیر الدین کے نام پر اس کا نام بشیر آباد رکھا۔ کشیر ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ کتب خانے اور علمی ادبی مختلوں کے لیے ایک کمرہ خاص طور سے بنوایا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں نوفت ہوئے۔ ۱۱ اپریل۔ جو سنتا بخسرت کہتا:

یارہ وہ بلبل چنستان کدھر گیا  
ہر نغمہ جس کا حسن تمنائے گوش تھا

دوران ملازمت میں خان صاحب کا قیام زیادہ تر سری گنگر ہی میں رہا۔ سرد یوں میں البتہ ریڈ یونی کا دفتر چند مہینوں کے لیے سیالکوٹ آ جاتا۔ سیالکوٹ ہی میں مجھے ان کا نیاز حاصل ہوا۔ یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ بڑی شفقت فرماتے۔ کبھی کبھی تادیباً گوٹھالی کی نوبت بھی آ جاتی۔ میر حسن کی خدمت میں روز حاضر ہوتے۔ محمد اقبال سے تعلقات کی یہ یکیفیت تھی کہ شروع شروع میں تو وہ انھیں ڈیز سراج کہہ کر خطاب کرتے پھر برادرم اور پھر مندوی کہتے ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں خان صاحب نے انھیں چار انگوٹھیاں بھیجیں تو محمد اقبال نے ناسازی طبیعت پر معذرت کرتے ہوئے ایک اردو،

آپ نے کہیجی جو مجھ کو مہرباں انگلشتری

اور ایک فارسی قطعے میں:

یارم از کشیر مرا بفرست چار انگلشتری

ان کا شکریہ ادا کیا۔ ۲۳۳ فارسی قطعے میں بڑی مضمون آفرینی کی ہے جس سے پھر اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ فارسی میں محمد اقبال کی شاعری کا زمانہ اردو میں شاعری سے زیادہ مؤخر نہیں ہے۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں:

ہوں بہ تبدیل قوانی فارسی میں نغمہ خواں

ان اشعار میں زور ہے، گوہ محمد اقبال نے ان کو قبل اشاعت نہیں سمجھا۔ سمجھا تو شاعری کا

وہی حصہ ان کا نزدیک قابلِ اشاعت تھا جس کا تعلق ان کی دعوت اور پیغام سے ہے، یا ایک حد تک اس کی تمہید۔

ایک دوسرے خط میں، جو عید کے روز لکھا گیا، کہتے ہیں: گرامی اور سید بشیر حسین بیٹھے ہیں۔<sup>۲۵</sup> عبدالقدار بھی اٹھ کر گئے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے، خان صاحب نے کوئی نظم مانگی تھی، کہتے ہیں بھراللہ کمل گئی۔ خان صاحب نے داد دی۔ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ترتیب کلام کا خیال ہے مگر فکر روزگار سے نجات نہیں ملتی۔ ملٹن کے طرز پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ شاید وہی نظم جس کی طرف میر نیرنگ نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ابر گہر باز، لکھی جا رہی ہے۔<sup>۲۶</sup> ڈرتا ہوں کوئی وہابی اعتراض نہ کر دے۔ احبابِ کشمیر، صادق علی خان اور غیر کو سلام لکھا ہے۔ ایک غزل بھیج رہے ہیں۔<sup>۲۷</sup>

اسرارِ خودی کا نسخہ بھیجا تو خان صاحب نے تعریف کی۔ لکھتے ہیں: الحمد للہ آپ کو پسند آئی۔ پھر کہتے ہیں: یہ مشنوی گزشتہ دوسال کے عرصے میں لکھی گئی۔ چند اتوار کے دونوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے..... فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے مشنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہو گا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے امید ہے وہ حصہ اس سے زیادہ لطیف ہو گا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ پھر کہتے ہیں میں چاہتا ہوں اس مشنوی میں حقیقی اسلام کو بنے نقاب کروں۔<sup>۲۸</sup> مشنی صاحب نے مشنوی کے بارے میں ایک خط لکھا تھا۔ محمد اقبال نے مولانا عmadی کو بھیج دیا کہ مشنوی پر تقریظ لکھتے ہوئے اسے پیش نظر رہیں۔ غلطی سے وہ خط زمیندار میں چھپ گیا۔ حالانکہ اس کی اشاعت مناسب نہیں تھی۔ خان صاحب سرکاری ملازم تھے۔ محمد اقبال نے خط لکھ کر معذرت کی کہ اس غلطی کا میں ذمہ دار ہوں، یہ خط نہیں تھا۔<sup>۲۹</sup> غرض یہ کہ خان صاحب سے گوناگوں تعلقات تھے۔ افسوس ہے ان خطوط اور تحریروں کا مجموعہ جوان کے صاحب زادے امیر الدین کے پاس تھا دورانِ علاج میں ان کے کوئی معاف لے گئے تا حالِ دستیاب نہیں ہو سکا۔ کیا اچھا ہوا اگر یہ خط اور تحریریں مل جائیں۔

ایک خط میر حسن کے صاحب زادے سید محمد ذکی کا ہے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ محمد اقبال کی طرح خان صاحب بھی با وجود انتہائی ادب اور احترام کے میر حسن سے کس قدر قریب تھے علی ہذا یہ کہ خان صاحب اور محمد اقبال کے تعلقات کس قدر گہرے تھے۔ سید محمد ذکی کے لکھتے ہیں: خط خان صاحب کے صاحبزادے امیر الدین احمد کے نام ہے اور ان کی والدہ ماجدہ کی

فرمائش پر لکھا گیا۔ تاریخ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۳ء ذکر میر حسن اور محمد اقبال کی 'مجاہس' کا ہے۔ خان صاحب کر سمس کی تعطیل میں سیالکوٹ آئے۔ محمد اقبال بھی سیالکوٹ میں موجود تھے اور لطف یہ کہ خواجہ عبد الصمد گروہی خان صاحب کے یہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ خان صاحب نے سید محمد ذکری سے کہا ایسی تدبیر کرو کہ شاہ صاحب کھانے پر آ جائیں۔ گکرو اور اقبال موجود ہیں، ایک مجلس شعر و خن منعقد ہو جائے۔ شاہ صاحب مان گئے۔ کھانے سے فراغت ہوئی تو کچھ غزلیں پڑھی گئیں۔ محمد اقبال سے فرمائش کی گئی اپنا کلام سنائیں۔ کہنے لگے شاہ صاحب کی موجودگی میں مجھ سے گتنا خی نہیں ہوگی۔ مگر شاہ صاحب کا اصرار تھا کلام سنانا پڑا۔ محمد اقبال خوب جہ عبد الصمد گروہ اور مولانا میر حسن کو خان صاحب ہی باہم جمع کر سکتے تھے۔ محمد اقبال کو جہاں اعتماد تھا کہ خان صاحب ان کے فلسفیانہ غور و فکر کو خوب سمجھتے ہیں، وہاں خان صاحب بھی کوئی محفل ہو، کوئی مشاعرہ محمد اقبال کے خیالات کی تربیجانی کرتے۔ رقم المحرف نے ۱۹۱۶ء کے ایک مشاعرے میں محمد اقبال کی مشہور نظم 'محبت' کی تشریح سب سے پہلے انھیں کی زبان سے سُنسی۔ خان صاحب پر اس وقت ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایک ایک شعر شنید کرتے، رک جاتے، شرح فرماتے۔ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ افکار کا حوالہ دیتے۔ ۱۹۳۶ء میں بریگیڈ یئر جزل ٹیوٹ جن کا تعلق کشمیر یونیورسٹی سے تھا، لاہور آئے۔ محمد اقبال سے ملے۔ چاہتے تھے جاوید نامہ کا ترجمہ اگریزی میں کریں۔ کئی ایک مسائل حل طلب تھے۔ محمد اقبال بسبب علالت معذور تھے کہنے لگے، آپ کشمیر سے آئے ہیں، میرٹشی سراج الدین سے ملاقات ہو گی، ان سے ملتے رہیے۔ وہ ان مطالب کے حل میں ہر طرح سے آپ کی مدد کریں گے۔ بریگیڈ یئر صاحب کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ نہ یہ کہ جاوید نامہ کا ترجمہ ہوسکا یا نہیں۔ خان صاحب سے البتہ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

خان صاحب بڑے باغ و بہار انسان تھے۔ شعر گویا ان کی غذا تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے شعر گنگما رہے ہیں۔ اساتذہ کے کلام پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ خود بھی شعر کہتے اور بے تکلف کہتے چلے جاتے۔ سہرے، قطعے، غزلیں مگر تفریحی۔ بایس ہمہ ان کے کلام کا اچھا خاصاً اختیاب ممکن ہے۔ خان صاحب میں ایک دوسرا وصف یہ تھا کہ دوران ملازمت میں اگرچہ مہاراجہ پرتاپ نگھنے نہیں ہمیشہ قدر کی گاہ سے دیکھا لیکن ان کے جانشین ذرا مختلف قسم کے انسان تھے۔ خان صاحب سے ان کا طظنه بھی برداشت نہ ہو سکا۔ ملازمت کے باوجود اس زمانے میں

بھی مہاراجہ کے احکام کی مخالفت کرتے۔ قطع نظر اس سے کہ یوں انھیں نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ ریزیڈنی میں ان کی آزادی رائے اور اصول پرستی کی بڑی قدر تھی۔ علم و فضل، معلومات کی کثرت، ذوق شعر انگریزی اور مشرقی ادب میں گہرا مطالعہ۔ ۱۹۲۰ء میں مجھے لکھا لا ہور آ رہا ہوں، جی چاہتا ہے تمہارے ساتھ میلہ چراغاں دیکھوں۔ خال صاحب آ گئے۔ شالا مارکی سیر ہوئی۔ لیکن محمد اقبال ہی کا ذکر رہا۔ بات بات پر اظہار افسوس کرتے کہ بسب خرابی صحت ان کی عیادت کے لیے نہ آ سکے۔ جاوید منزل بھی گئے۔ اس کے چند ہتھی دنوں کے بعد ان کی وفات کی خبر آ گئی۔ بے حد صدمہ ہوا۔ ظاہر ان کی صحت اچھی تھی، تشویش کی کوئی بات نہیں تھی، مگر اللہ کی مرضی ایک بزرگ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خال صاحب سری گنگہ ہی میں مدفون ہیں۔ لیکن ہفت روزہ گل خندان سری گنگہ، اشاعت ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ء میں لکھا ہے کہ درگن میں گرجا گھر کے سامنے قبرستان میں ان کا مدفن بڑی امتر حالت میں ہے۔ افسوس۔

مولانا عبداللہ العمادی۔ وطن امری تھوا ضلع جون پور۔ بڑے فاضل اور جامع کمالات بزرگ تھے۔ اسلامی علوم و معارف اور عربی زبان کے جید عالم۔ صحافت سے وابستگی کے باوجود عمر بھر علی مشاغل میں منہمک رہے۔ بطور صحافی بھی علمی مضامین ہی پر قلم اٹھاتے۔ زمیندار اور وکیل میں برسوں کام کرتے رہے۔ الیمان کے نام سے ایک رسالہ عربی میں نکال۔ جنگ عظیم کے دوران میں لا ہور آ گئے۔ مولانا ظفر علی خال اس زمانے میں ستارہ صبح نکال رہے تھے۔ مولانا عmadی بھی ان کے ساتھ کام کرتے۔ مولانا کے مزاج میں تکون تھا، ان بن ہو گئی تو مولانا عmadی نے ستارہ صبح کی تقلید میں الصباح جاری کیا۔ ستارہ صبح سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ظفر علی خال نے ترکی بہتر کی جواب دیا۔ عmadی نیک طینت انسان تھے، معدترت خواہ ہوئے، آپ کی شکر رنجی دور ہو گئی۔ پھر مولانا سے جاملے۔

دارالترجمہ حیدر آباد نے ان کے علم و فضل اور لغت دانی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ عmadی نے مصطلحات وضع کیں۔ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ محمد اقبال کے دل سے قدر دان تھے۔ لکھتے ہیں: اقبال کا دل وہی الہی کا آئینہ دار ہے۔ کشف عطا نے ان کے سامنے سے آسمان وزمیں کے پردے اٹھادیے ہیں۔ محمد اقبال کا ذکر بڑی محبت سے کرتے۔ ایک قطعہ محمد اقبال ہی کی وجہ سے پنجاب کی تعریف میں لکھا ۱۹۳۱ء کہ پنجاب میں اقبال اور اسلام موجود ہیں تو سب کچھ موجود ہے۔ مولانا ابوالخیر مودودی لکھتے ہیں عmadی جتنے بڑے عالم تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم

کے انسان تھے۔ بلند نگاہ، کریم نفس، قلندر صفت، قلندر سیرت، زندگی شرافت علم اور شرافت نفس کا امتراج۔ رقم الحروف کے نام ایک گرامی نامے میں لکھا ہے۔ ۳۲ ”اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے شبہ، ۱۲۱ اپریل ۱۹۲۸ء کو نقل مقام فرمایا۔ عمادی رحمۃ اللہ علیہ نے انا لله وانا الیہ راجعون، فرمایا۔ آیات کلام اللہ زبان پر جاری ہوئیں۔ اٹھتے، بیٹھے، ٹھلتے رہے۔ اپیات رقم فرمائیں:

مردال کہ جال بخضرت جنان سپردہ اند  
در راه زندگانی جاوید مردہ اند  
آزادہ رو کلاہ کرامت بسر نہند  
افتادہ را بہ انتم الاعلوں بردہ اند  
آموز گار خواجی و بندگی نواز  
خود را ز چاکرانِ محمد شمردہ اند  
تقدیر را کنند بہ تدبیر ساز گار  
حرف غلط ز لوح زمانہ ستردہ اند  
سر زیر پائے خواجه بدر و احد نہاد  
اقبال لا بقا شد و اقبال زندہ باد

یہ اشعار غالباً غیر مطبوعہ ہیں۔ میں ان کے لیے مولانا ابوالحیر کا ممنون ہوں۔

گرامی۔ غلام قادر نام مگر خود بڑے قادر کلام۔ ان کے دم سے فارسی کے اساتذہ تھن کی یاد تازہ ہو گئی۔ بقول محمد اقبال فنا فی الشیر۔ جذبات گھرے، افکار بلند، حافظہ نہایت قوی، دیوان کے دیوان اور مشنویوں پر مشنویاں از بر۔ نقدخن کا یہ عالم کہ خود اپنے کلام پر بار بار نقد کرتے۔ محمد اقبال کے اشعار تو کیا مصرعوں اور الفاظ تک کو بہ نگاہ تقید دیکھتے، مشورے دیتے، اعتراض کرتے۔ بایس ہمہ ان کے کمال فن اور عظمت فکر کے بدل و جان متعرف۔ گرامی کی شاعری غزل کی شاعری ہے، نظیری سے ہم آہنگ۔ محمد اقبال کہتے ہیں: فارسی ادب میں تازہ گوئی کے جس شوق کی ابتداء اکبر کے عہد میں ہوئی گرامی پر ختم ہو گیا۔ پنجاب کی ادبی روایات کا جو سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع ہوا دراصل فارسی ہی سے وابستہ تھا۔ گرامی اس روایت کے بہترین حامل تھے۔ انہوں نے نہ نہیں لکھی۔ لکھتے تو خوب لکھتے۔ پھر کہتے ہیں جدید فارسی کی تراکیب اور الفاظ سے اجتناب ان کے ذوق صحیح کی دلیل ہے۔ وضع تراکیب میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔ ۳۲

گرامی فنا فنا شعر تو تھے ہی، اٹھتے بیٹھتے جب دیکھیے شعر کی دھن میں ہیں۔ پچھنہ کچھ گلنگا تے رہتے۔ شعر ہو جاتا تو آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ سامعین دادخسین دیتے لیکن گرامی اپنے آپ میں گم رہتے، انھیں تحسین و آفریں کی خبر نکل نہیں۔ ہر وقت استغراق کا عالم ہے۔ جب دیکھیے خالی الذہن۔ کسی کی تعریف سُنی تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے۔ لیکن جب اسی شخص کے بارے میں کوئی غلط بات سننے میں آتی تو اسی وقت کہتے: چھوڑ واس مردودا زی کے ذکر کو۔

مکاتیب گرامی ان خطوط کا مجموعہ ہے جو محمد اقبال نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۷ء تک گرامی کو لکھے، گویا صرف ان خطوط کا جواب تک مل سکے۔ یہ خطوط گرامی اور محمد اقبال کی شخصیت، سیرت و کردار اور ان کے باہمی تعلقات، فن شاعری اور ادب کے مطالعے میں بے حد اہم ہیں۔ شخصی سوانحی معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دکن میں محمد اقبال کی بھی، یا عثمانیہ یونیورسٹی کی سربراہی کے لیے جو کوششیں ہوئی تھیں۔ ان کے باوجود محمد اقبال کی شان استغنا اور خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ باعتبار بخی حالات کے ان خطوط کی اگرچہ کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن یہی خطوط ہیں جن سے ایک تو اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ حکومت کا ارادہ ایک "فلسطین کمیشن" قائم کرنے کا تھا مگر اس کمیشن کا کوئی اجلاس منعقد نہ ہو سکا، معاملہ یونہی رہ گیا۔ دوسرے یہ کہ محمد اقبال کا ارادہ حیات مستقلہ اسلامیہ کے عنوان سے ایک مشنوی لکھنے کا تھا جو اسرار و رموز کا ضمیمہ ہوتی۔ اس مشنوی کا ذکر تو بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مشنوی کمھی نہیں گئی۔

بھیتیت مجموعی البتہ یہ خطوط اشعار کی باریکیوں، زبان اور محاورے کی بحثوں الفاظ اور تراکیب کے رد و بدل پر مشتمل ہیں۔ گرامی عمر میں محمد اقبال سے کوئی بیس بڑے تھے۔ مگر باوجود تفاوت عمر ایک دوسرے سے خلوص اور محبت کے ساتھ ساتھ بے تکلفی تھی، اعتماد اور پھروسہ بھی جو دوستی کا خاصہ ہے جس طرح گرامی محمد اقبال کے قائل تھے محمد اقبال بھی زبان کے معاملے میں اپنے استاد میر حسن کے علاوہ گرامی سے بھی مشورہ لیتے۔ گرامی زبان کی اصلاح کرتے۔ مصروعوں کو بدل دیتے اور محمد اقبال بالعموم ان کا مشورہ قبول کر لیتے۔ افکار کا معاملہ، یا حقوق کی بحث ہو تو ایسا نہیں کرتے۔ مگر پھر محمد اقبال بھی تو شاعری کے معاملے میں گرامی پر اثر انداز ہوئے۔ گرامی خطوں میں انھیں کبھی، حضرت ڈاکٹر صاحب کہہ کر خطاب کرتے، کبھی حضرت محمد دعصر کہتے۔ گرامی نے ان کی تعریف میں رباعیاں کیے، اشعار کہے تا آنکہ ان کے پیغام اور دعوت کو اس شعر میں کس خوبی سے بیان کر دیا ہے:

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

در دیدہ معنی لگران حضرت اقبال

پیغمبری کرد و پیغمبر نوان گفت

محمد اقبال بھی خطوں میں انھیں کبھی بابا گرامی کہہ کر خطاب کرتے، کبھی حضرت اقدس بے تکلفی کی نوبت آئی تو ڈیر گرامی یا ڈیر مولانا گرامی لکھ دیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”آپ حیدر آباد میں ہیں کہ غلام آباد میں“، گرامی کھوئے کھوئے سے رہتے تھے محمد اقبال نے کہا آپ کو گرامی نہیں ”نومی“، کہنا چاہیے۔ غرضیکہ طرح طرح سے چھپٹر چھاڑ رہتی۔ طرح طرح سے محبت اور خلوص، قدر دانی اور قدر افزائی کا اطمینان ہوتا۔ گرامی سے محمد اقبال کی دوستی اور تعلق خاطر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُردو میں نوان کے ہم نواہ بہت تھے، فارسی میں بجز گرامی کوئی ان کا ہم نوان ہیں تھا۔ خواجہ عزیز الحسن لکھنؤی دور تھے اور عمر کی آخری منزلوں میں۔ گرامی ہی کی صحبت میں شعروں سخن کی محفل گرم ہو سکتی تھی۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۳۸ءے ہے۔ فارسی میں شعر کہتے۔ نوق مشاہیر کشمیر لکھ رہے تھے تو محمد اقبال نے انھیں مشورہ دیا خواجہ صاحب کے حالات زندگی اور شاعری پر بھی قلم اٹھائیں۔ ۱۹۳۱ء میں خواجہ صاحب کا کلام کلیات عزیز کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے صاحبزادے خواجہ ولی الدین نے ایک نسخہ محمد اقبال کی خدمت میں بھی بھیجا تو محمد اقبال نے جواباً شکر یہ ادا کیا۔ خواجہ صاحب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرحوم فارسی ادبیات کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی ابتداء شہنشاہ اکبر کے عہد سے ہوئی۔ افسوس کہ وہ دور ہندوستان میں ان کی ذات پر ختم ہو گیا۔ پھر خواجہ صاحب کی فارسی زبان پر قدرت اور ان کے کئی ایک اشعار نقل کرتے ہوئے خواجہ صاحب کے کلام کو سراہا ہے۔ اسرار خودی تصنیف ہوئی تو گرامی کو لکھتے ہیں کاش! آپ یہاں ہوتے یا میں حیدر آباد میں ہوتا..... یا لکھنؤ جا کر عزیز کو سناؤں“، غور کجیے محمد اقبال کے دل میں خواجہ صاحب کی کس قدر عزت تھی، کس حد تک قدر و منزلت!

گرامی جالندھر میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت معلوم نہیں۔ پھر یا اسی برس سے زیادہ عمر پائی۔ جالندھر میں خلیفہ ابراہیم کے مکتب اور ترک علی شاہ قلندر کی خدمت میں بیٹھے۔ اصل نام غلام محمد ہے۔ اور نیٹل کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ملازمت کی ابتداء، امترس، کپور تھلہ، لدھیانہ میں معلّمی سے کی۔ پولیس میں چند دن سارجنٹ کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ نواب فتح علی خاں قولباش کے معلم اور اتالیق بھی رہے۔ بالآخر خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ کے توسط، نواب عماد

الملک بہادر سید حسین بلگرامی کی سفارش اور مولانا محمد حسین آزاد کے تعریفی خط کی بدولت دربار دکن میں پہنچ۔ میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے زمانے میں شاعر دربار کے مرتبے پر فائز رہے۔ ۱۹۱۶ء میں واپس آگئے۔ پھر شاید بہت کم دکن جانا ہوا۔ شادی ان کی ہو شیار پور میں ہوئی۔ ہو شیار پور ہی میں بیوی کے نام پر سر جلوہ اقبال ایک ہو یہی گرامی منزل تعمیر کی۔ ہو شیار پور ہی میں اقامت گزیں رہے۔ بیگم گرامی کا نام بھی اقبال تھا۔ شاعرہ تھیں ترک تخلص کرتیں۔ محمد اقبال نے ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ ہم نام اقبال کہہ کر اپنا سلام بھیجتے۔ گرامی کی وفات پر مرثیہ لکھتے ہوئے کہتی ہیں:

کہے کوئی انا الحق ہم انا الحبوب کہتے ہیں

سر اپنا، شور اپنا، شوق اپنا، مدعایا اپنا

گرامی ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو ہو شیار پور میں فوت ہوئے۔ تا دم آخر محمد اقبال کو یاد کرتے رہے۔ محمد اقبال کسی وجہ سے مزاج پر سی نہ کر سکے۔ عیادت نہ ہو سکی۔ کہا گیا:

برفت جان گرامی و تو ہنوز خوش

لوگوں نے اسے گرامی سے منسوب کرتے ہوئے غلطی سے محمد اقبال کی بےاتفاقی پر محبول

کر لیا، حالانکہ یہ شعر:

صبا به حضرتِ اقبال ایں پیام ده

برفت جان گرامی و تو ہنوز خوش

جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ہفیظ ہو شیار پوری کا ہے، گرامی کا نہیں ہے۔ محمد اقبال کو گرامی کی وفات کا دلی صدمہ تھا۔ پنڈت ہری چند اختران کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مخزن کے لیے ایک طویل بیان امالا فرمایا۔ مرثیہ لکھا۔ کس حسرت بھرے دل سے کہتے ہیں:

یاد ایامے کہ با او گفتگو با داشتم

اے خوشا حرفاً کہ گوید آشنا با آشنا

گرامی کی وصیت تھی کہ ان کی ایک رباعی اور نعت کے چند اشعار جو ایک پر زہ کاغذ پر لکھ رکھے ہیں، لحد میں رکھ دیئے جائیں۔ مگر یہ تحریر نہ مل سکی۔ ایک روز بیگم کے خواب میں آئے کہنے لگئے بخشش کا فکر نہ کرو رباعی اور نعت لوح مزار پر کنہ کرا دو۔ تمیل ارشاد کردی گئی۔ رباعی ہے:

خاور دم از شم باین تیرا شمی

کوثر چکد از لمب بہ این شنہ لمی  
اے دوست ادب کہ در حریمِ دل ماست  
شانہشہ کونین رسول عربی

نعت کا آخری شعر ہے:

گرامی در قیامت آن نگاہ مغفرت خواہد  
کہ در آن غوش گیر جرم ہائے بے حسابش را

گرامی بڑے صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ تو حیدور سالت میں یقین کامل، ایمان حکم، پاک  
سیرت، پاک باطن۔ بقول محمد اقبال صلح کل، وسیع الاخلاق، جہا نگیری بہار کا آخری پھول جو ذرا  
دیر کے بعد شاخ سے چھوٹا۔ کاش! خان خانہ ہوتے، دیکھتے خاک پنجاب شیراز اور نیشاپور  
سے کسی طرح کم نہیں۔<sup>۳۵</sup> گرامی کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ محمد اقبال تاکید کرتے اور کلام  
مرتب کیا جائے۔ کہتے اس زمانہ انحطاط میں بھی گرامی کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں  
زندگی کی قوت باقی ہے۔

گرامی نے حافظ کی زمین میں ایک غزل کی۔ ایک شعر تھا:

عصیانِ ما و رحمت پروردگارِ ما  
این را نہایتے است نہ آں را نہایتے  
محمد اقبال اس شعر پر پھر کاٹھے۔ نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:

سبحان اللہ گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیے۔ خواجہ حافظ تو ایک طرف  
فارسی لٹرپیچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔<sup>۳۶</sup>

گرامی کی زندگی اور شخصیت کا یہ بیان کسی قدر طویل ہو گیا لیکن گرامی کو محمد اقبال اور محمد  
اقبال کو گرامی سے جو تعلق تھا اس کی نوعیت یونہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ گرامی کی زندگی اور گرامی  
کی شخصیت ہمارے ذہن میں رہے۔ زندگی ایک سفر ہے، اثنائے سفر میں کئی رفیق راہ ملتے۔  
تحوڑی دور ساتھ دیتے ہیں۔ نئے رفقاء سفر میں جاتے ہیں۔ یہ قانون فطرت ہے۔ روابط ہوں  
یا تعلقات، دوستی ہو یا آشنائی ان کا سلسلہ یونہی ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتا، جڑ کر ٹوٹا رہتا ہے۔ چند دن  
قام رہا پھر ٹوٹ گیا۔ تا آنکہ موت اسے ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں  
کہ زندگی بھر قائم رہتے ہیں۔ ان میں شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فطرت انھیں ہمیشہ کے

لیے یک جا کر دیتی ہے۔ محمد اقبال کو گرامی سے کچھ ایسا ہی تعلق تھا۔ جب تک جیسے ایک دوسرے سے وابستگی میں فرق نہ آیا۔ اس تعلق کا آغاز، جس کی نویعت کچھ ولیسی ہی تھی جیسی شاہنواز، عبدالقدار اور جلال الدین سے، شاید ۱۹۰۰ء کے اوائل میں ہوا اور یہ وہ زمانہ ہے جب گرامی کا قیام مستقلًا حیر آباد میں رہتا۔ احیاناً وطن کا رخ کرتے البتہ لاہور آتے تو محمد اقبال سے ملتے۔ جیسا کہ ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء کے ایک خط سے جنواب صدر یار جنگ بہار کو لکھا گیا، ظاہر ہوتا ہے۔ محمد اقبال لکھتے ہیں: گرامی میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔<sup>۲۳</sup> اس کے بعد کوئی خط ملتا ہے تو ۱۹۱۰ء کا اور یہ گرامی کے نام ان کا پہلا خط ہے جو دستیاب ہوا۔ لیکن اس چھ سالات برس کی مدت میں اکثر ان سے ملاقات رہتی، خط و کتابت بھی ہوتی۔ وہ غزل جس کی روایت ہے اہل درد، گرامی ہی کی صحبت میں لکھی گئی۔ بہرحال ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۷ء تک مکاتیب گرامی یعنی گرامی کے نام محمد اقبال نے جو خط لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے محمد اقبال کے دل میں قدر و منزلت کا کیا عالم تھا جیسے یہ کہ خود محمد اقبال بھی فکر و نظر کی کن بلند پوس پر تھے۔

۱۹۱۸ء میں جب گرامی نے انھیں لکھا کہ ملک الموت کا انتظار ہے تو محمد اقبال مراقبے میں بیٹھ گئے کہ دیکھیں گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن۔ پھر جواباً لکھتے ہیں: ”مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا پکھی ہے۔ گرامی مسلم ہے، تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر لے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے کہ جامع ہے موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جاتے تو برداشان بن جائے۔ پانی اس کی بیبیت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہوئی ہیں۔“<sup>۲۴</sup>

پھر لکھتے ہیں: ”مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت اور ابراہیمیت کا کیونکر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوت جاذب بھی ذاتی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کف سے جس نے اس ریگستان کے چکتے ہوئے ذرول کو پامال کیا۔“<sup>۲۵</sup>

گرامی دکن سے واپس آگئے تو محمد اقبال اگرچہ خود کبھی ہوشیار پور میں ان سے نہیں ملے لیکن گرامی اکثر لاہور آتے۔ محمد اقبال کے یہاں دونوں تک قیام رہتا۔ ایک مرتبہ قیام نے طول کھینچا تو بیگم صاحب کا تار ملا کہ بیمار ہیں۔ گرامی بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھے کہنے لگے ابھی ہوشیار

پور جاتا ہوں۔ محمد اقبال کو معلوم تھا تاریخ فرض ایک بہانہ ہے گرامی واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ محمد اقبال نے کہا ایک رباعی ہو گئی ہے مگر اس کا چوتھا مصروف نہیں ہو رہا۔ گرامی یہ سنتے ہی چوتھے مصروف میں گم ہو گئے۔ اب کہاں بیگ صاحب اور کیسا تار۔ مصروف پر مصروف موزوں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ رات گزرتی رہی۔ بالآخر کوئی چار بجے صبح حسب مطلب مصروف موزوں ہو گیا تو اُٹھے۔ محمد اقبال سے کہنے لگے سنگتھے کھلائی مصروف ہو گیا۔ محمد اقبال پریشان تھے کہ چار بجے صبح اور سنگتھے بمشکل علی بخش نے فرمائش پوری کی۔ کہیں نہ کہیں سے سنگتھے لے آیا۔

گرامی کولا ہو رآئے ہوئے دیر ہو جاتی تو محمد اقبال خط پر خط لکھتے کہ لا ہو رآئے۔ ایک مرتبہ علی بخش کو ہوشیار پور بھیجا۔ خط لکھا علی بخش کے ساتھ آ جائے۔ گرامی روزِ عزم سفر کرتے دن پر دن گزرتے گئے۔ ایک روز ہمت کر کے کمرے سے باہر نکلے۔ تانگے پر بیٹھے۔ تانگہ گرم ہو رہا تھا۔ اتر گئے۔ سامان اتروالیا۔ کہنے لگے علی بخش تم جاؤ، تانگہ گرم ہو گیا ہے، اب سردیوں میں آئیں گے۔

لا ہو ریں قیام ہوتا تو دونوں استاد ان فن بیٹھے گھنٹوں شعرو شاعری میں غرق رہتے۔ انارکلی کے رخ نشست ہوتی۔ راگیروں کی ہتھی کیسے ایک دوسرے سے گفتگو ہو رہی ہے۔ داد دی جا رہی ہے۔ واہ واہ ہو رہی ہے۔ گرامی کو جب دیکھیے کھوئے کھوئے سے رہتے جب دیکھیے محیت ہے۔ کسی خیال میں گم ہیں۔ محمد اقبال کی بات دوسری تھی۔ ایک طرف صحوتا، دوسری طرف سکر۔ صحوسکر کی یہ یقینیں کسی پر لطف ہوں گی ہم ان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ محمد اقبال گرامی کا بڑا خیال رکھتے کہ ان کی خاطر مدارات میں کمی نہ آ نے پائے۔ گرامی عالم استغراق میں ہیں۔ علی بخش سے پوچھتے ہیں آج کھانے میں کیا ہے۔ علی بخش کہتا ہے شلجم۔ گرامی کہتے ارے تو بمعنی شلجم شام شلجم، کیا گوہی نہیں ملتی؟ شام کو گوہی تیار ہوتی۔ سامنے آتی تو کہتے صبح گوہی شام گوہی، علی بخش کیا شلجم نہیں ملتے۔ یوں علی بخش کی بھی ان سے خوب چھیڑ چھاڑ رہتی۔ ۱۹۲۱ء میں محمد اسد ملتانی نے ” قطرہ شب نم“ کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ گورنمنٹ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ نظم مقابلہ میں پیش کی گئی تو محمد اقبال نے محمد اسد کے حق میں فیصلہ دیا۔ ان کی بہت بندگی۔ کچھ دنوں کے بعد یہی نظم ساتھ لیے محمد اقبال کی خدمت میں پہنچ، نظم کے بارے میں گفتگو کی۔ گرامی بھی موجود تھے۔ پنگ میں لیٹے شاید ان کی گفتگوں رہے تھے۔ باقاعدہ میں ان کے حافظے کا ذکر آ گیا۔ محمد اقبال کہنے لگے ذرا اس کا کرشمہ دیکھیے گا۔ گرامی سے مناطب ہوئے فرمایا

مولانا وہ حضرت نظام نے کیا کہا ہے:

ز گرد بیبان بیبان بگرد

بس اس مصرعے کا سنتا تھا کہ گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا اٹھا کر  
چونے لگے۔ کہتے اللہ اللہ! دو ایک بار اس مصرعے:

ز گرد بیبان بیبان بگرد

کو دھرایا اور پھر اسی مصرعے سے پوری مثنوی پڑھنا شروع کر دی..... محمد اسد لکھتے ہیں: میں نے  
مولانا کو پہلی اور آخری پار دیکھا۔ منڈا ہوا سر، اٹھی ہوئی انگلیاں، نیم و جد کا عالم، جھوم جھوم کر  
زوردار اور پروجد آواز کے ساتھ شعر پڑھنا۔

گرامی کی طرح میاں عبدالعزیز مالواڑہ سے بھی محمد اقبال کے گھرے مراسم تھے۔ میاں  
صاحب گرامی کے ہم وطن تھے۔ ہوشیار پور سے لاہور آئے تو ان کا شماران حریت پسند بزرگوں  
میں ہونے لگا جنہوں نے لیگ ہو یا کانگریس ہر اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو دولت  
برطانیہ کی غلامی اور مکومی سے اختلاص کے لیے وقفًا فوتًا منظقم ہوتی رہی۔ بلدیہ لاہور کے مตوق  
صدر رہے۔ ان کا دولت خانہ ارباب سیاست کا مرجع تھا۔ میاں صاحب ان کی میزبانی  
فرماتے۔ میاں صاحب ہی کے بیہاں مشورے اور گفتگو میں ہوتیں۔ میاں صاحب نے ۱۹۰۲ء  
میں محمد اقبال کی ایک نظم انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں سنی توبے حد متاثر ہوئے۔ فقیر سید نجم  
الدین کے ہاں پہنچ۔ ان کی وساطت سے محمد اقبال سے ملاقات ہوئی۔ روابط بڑھتے چلے  
گئے۔ محمد اقبال یورپ سے واپس آئے اور میاں صاحب کی کوششوں سے اسلامیہ ہائی اسکول  
ہوشیار پور کا افتتاح ہوا تو میاں شفیع اور میاں شاہدین کے ہمراہ ہوشیار پور گئے۔ یہ ۱۹۰۸ء کی  
بات ہے۔ میاں صاحب نے اس موقع پر گرامی مرحوم کی دعوت کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ گرامی  
کی بدولت محمد اقبال اور میاں صاحب ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہو گئے۔ دوستی نے بے  
تکلفی کارنگ اختیار کر لیا۔ میاں صاحب ۱۹۱۹ء میں لاہورے آئے۔ ایک دروازے کے باہر  
ایک عظیم حوالی تغیر کی۔ اس سے پہلے ہوشیار پور میں بیرسٹری کر رہے تھے۔ محمد اقبال کسی  
مقدارے کے سلسلے میں لاہور جاتے یا میاں صاحب لاہور آتے تو ایک دوسرے سے خوب خوب  
ملاقات رہتی۔ ۱۹۲۷ء میں جب محمد اقبال نے پنجاب لیجسٹیشن کو نسل میں رکنیت کے لیے  
انتخاب اڑا تو میاں صاحب سے پوچھ کر کہ ان کا ارادہ تو اس میں حصہ لینے کا نہیں ہے۔ میاں

صاحب محمد اقبال کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ انتخابی مہم میں بڑی سرگرمی سے محمد اقبال کی مدد کی۔ ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظم نے لیگ کی تنظیم نو کے سلسلے میں میاں صاحب کو خط لکھا تو ۱۳۰۴عی میں کو ان کے دولت خانہ پر ایک جلسہ ہوا۔ قائدِ اعظم تو لا ہور نہ آسکے۔ ارباب لیگ البتہ جمع ہو گئے۔ محمد اقبال چیزِ مین اور میاں صاحب ڈپٹی چیزِ مین مقرر ہوئے۔ یہ زمانہ محمد اقبال کی علاالت کا تھا۔ ان کی صحت روز بروز گردی تھی۔ میاں صاحب نے ان کے مشوروں سے لیگ کی تنظیم میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ میاں صاحب محمد اقبال کی صاف گوئی کے بڑے معترض تھے۔ انھیں ان کی یہ اداہہت پسند تھی کہ کسی میں کوئی عیب ہوتا اور اس کا ذکر آتا تو محمد اقبال بات کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتے۔ کہتے میں اس بارے میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ رقم الحروف کا ذائقی تجربہ بھی بیہی ہے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ بعض حضرات کے بارے میں ان سے کرید کرید کر سوالات پوچھنے گئے کہ شاید ان کے خلاف کوئی بات نکل آئے مگر انھوں نے بات آگے گئیں بڑھنے دی۔ کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ کسی کا دل دکھے یا انھیں گوارا ہی نہیں تھا۔ ”الجتماعے مسافر“ میں ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے  
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسمان مجھ کو

میاں صاحب سے ان کے تعلقات میں خلوص اور دل سوزی کا یہ عالم تھا کہ ۳۵-۳۶ء میں کبھی شکایت یا شکر رنجی کا موقعہ نہیں آیا۔ لیکن میاں صاحب سے محمد اقبال کے تعلقات کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میاں صاحب نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی۔ سال وفات ۱۹۷۱ء ہے۔ سو برس کے قریب عمر پائی۔

محمد اقبال کے ہندو دوستوں میں سوامی رام تیر تھے۔ الباخوص قابل ذکر ہیں۔ سوامی جی محمد اقبال کے قریباً قریباً ہم عمر تھے۔ گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گوجرانوالہ اور لاہور میں تعلیم پائی۔ زمانہ تعلیم بڑی سختیوں، عسرت اور ناداری میں گزاریاں لکھ میں ملازمت ملی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے محمد اقبال سے ان کی ملاقات لاہور ہی میں ہوئی۔ اس وقت جب وہ مشن کالج میں ریاضی کے اُستاد تھے۔ طبیعت پر شروع ہی سے تصفوف کا غلبہ تھا۔ گوجرانوالہ میں ایک بھگت دھنارام سے فیض حاصل کر چکے تھے۔ زندگی بھرا نہیں اپنا گرومانے رہے۔ لباس درویشانہ کھدر کا کرتا، کھدر کی دھونتی، دلیکی جوتا، بھی کبھی سر پر صافہ پیٹ لیتے۔ کھاتے بہت کم۔ یہی کبھی ہفتے میں ایک آدھ بار، ورنہ دن بھر پانی پی پی کر گزر کرتے۔ شادی

بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ لیکن طبیعت دنیا سے اُچاٹ تھی۔ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ ہر لمحہ محیت و استغراق کی ایک کیفیت جو بڑھتی چلی گئی۔ کالج سے استفادے دیا۔ تا آنکہ جذب کامل نے سنیاں کا رنگ اختیار کر لیا۔ ہمالہ کے دامن میں گنگا کے کنارے دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ دھیان گیان اور وید پاٹھ میں وقت گزرتا۔ سوامی جی کو اُردو، ہندی، فارسی اور پنجابی زبانوں میں صوفیا کا کلام حفظ تھا۔ انگریزی اور سنسکرت خوب جانتے تھے۔ مغرب کے فلسفے سے بھی متاثر ہے۔ مشن کالج کے زمانہ ملازمت ہی میں بلھے شاہ کے اس مصرعے کا وکاف توں درکار، ۱۹۲۷ سے متاثر ہو کر ایک ماہوار رسالہ الف کے نام سے جاری کیا مقصد تھا ویدانیت اور تصوف کی بلا امتیاز مذہب و ملت ترویج۔ رومنی کا شعر:

### مذہب عشق از ہمہ مذہب جداست

زیب سرور ق ہوتا۔ سوامی جی پر وحدۃ الوجود کی ہندی آریائی شکل کا غلبہ تھا اور یہی ان کی مذہبی زندگی کا منہما۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کیا رام اکیلا ہے۔ ایک فارسی غزل میں ’تہاں تم تہاں تم‘ کا تکرار کیا ہے۔ پنجابی میں ’جام شہادت وحدت والا پی پی ہر دم رہ متواں‘ اور اس قبیل کے اشعار پاگل اصلی پاگل ہو جامست الاست پیاریا ملتے ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں جاپان چلے گئے۔ جاپان سے امریکہ پہنچے۔ ساحل سان فرانسیسکو میں قیام رہا۔ ۱۹۰۶ء میں واپس آئے۔ گنگا کے کنارے چند میل دور ایک غار میں رہنے لگے۔ ایک روز دریا میں لیٹے تھے کہ پانی کاریلا آیا اور انھیں بہا کر لے گیا۔ تیسرا روز لاش ملی۔ محمد اقبال نے بافسوس یہ خبر سنی۔ سوامی جی کی یاد میں جو نظم لکھی ہے باعتبار ان کی موت کے ان کے صوفیانہ نصب العین کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

هم بغل دریا سے ہے اے قطرہ بیتاب تو  
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو

فرمایا: ”سوامی جی خوب آدمی تھے۔ ویدانیت کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ ویدانیت کے خشک عقلی اور مابعد اطبيعي تصوف کا جس میں فکر ہی فکر ہے، ان پر غلبہ تھا۔ ویدانیت کا تعلق دماغ سے ہے۔ قلب سے نہیں ہے۔ میری ان کی خوب نوب گنتگوئیں ہوتیں۔ ان گنتگوئیں میں جب ویدانیت کا پیوند بھی تصوف سے لگا، افکار دماغ پر جذبات قلب کا رنگ چڑھا تو سوامی جی کے دل میں کیف و سرمستی کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس سے ان کے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب ان کا وحدۃ الوجود ویدانیت کا وحدۃ الوجود نہ رہا۔ ۱۹۲۷ء محمد اقبال کو سوامی جی سے دلی تعلق

تھا۔ ان کا سوامی جی سے یہ تعلق اس پہلو سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے سوامی جی سے زیادہ یاتھوڑی بہت نہیں تو یوں کہیے بقدر ضرورت سنسکرت سیکھ لی۔ ہندو فلسفہ اور ویدا نیت کا مطالعہ بھی زیادہ گہری نظر سے کیا۔ محمد اقبال کا خیال تھا سوامی جی کی موت اتفاقی نہیں تھی، ارادی تھی۔<sup>۲۷</sup> محمد اقبال کے ہندو دوستوں کا حلقة خاصاً سبج تھا۔ سوامی رام تیرتھ سے کہ ہندو روحانیت اور وحدانیت کی جیتنی جاگتی تصویر تھے۔ تیرتھ رام سے رام تیرتھ ہو گئے۔ ان کا تعلق خاطر سمجھ میں آتا ہے۔ سوامی جی کی درویش منشی اور وسیع المشربی کا یہ عالم تھا کہ مسجد میں جا بیٹھتے۔ ”قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ مسلمانوں کے ہاں کھانا کھاتے۔ کہتے ہندو ہوں نہ مسلمان، معلوم نہیں کیا ہوں۔ البتہ وحدۃ لا شریک کو مانتا ہوں۔ کفر پر لعنت بھیجنما ہوں۔ پھر اس درویش منشی کے ساتھ ان کا علم و فضل اور محمد اقبال کی طرح فلسفہ سے شغف، تصوف سے دلی لگاؤ۔ ادھر محمد اقبال کے دیکھنے میں نہ سہی، باطنًا صوفی، درویش منش۔ طلب علم میں ہمہ تن تحقیق و تحس۔ انھوں نے سوامی جی کی صحبتوں اور ملاقاتوں میں ہندو فلسفہ اور ویدا نیت کی حقیقی روح کو پالیا۔

سوامی جی کی طرح مشہور ہندو انقلابی رہنماء ہر دیال سے بھی ان کے خاصے تعلقات تھے۔ ہر دیال بڑے ذہین طالب علم تھے۔ غصب کا حافظہ پایا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر رشی اور منی ہونے کا دعویٰ کرتے تو غلط نہ ہوتا۔ ٹلن سے بے پناہ محبت تھی۔ جلاوطن ہو کر امریکہ چلے گئے۔ برلین میں انقلاب ہوا۔ طالب علموں میں حد رجہ ہر دعزیز تھے۔ محمد اقبال کی حب الوطنی اور فلسفہ پسندی دوستی کا ذریعہ بنی۔ ۱۹۰۲ء میں ہر دیال نے واٹی۔ ایم۔ سی۔ اے کے مقابلے میں واٹی۔ ایم۔ آٹی۔ اے۔<sup>۲۸</sup> اے کی بنیاد ڈالی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت محمد اقبال نے کی۔ لیکن انھوں نے تقریر کی بجائے اپنی مشہور نظم ”قومی ترانہ“

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا  
پڑھ کر سنائی۔ سامعین تقریر کے منتظر تھے، ترانے کو سنا تو سرد ہنٹنے لگے۔ جسے دیکھیے اس پر ایک وجہ اُنی کیفیت طاری۔<sup>۲۹</sup> ہر دیال کی انقلاب پسندی انھیں ملک سے باہر لے گئی۔ شاید ان سے پھر ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

راج نارائن دہلوی تو ان کے شریک محفل تھے۔ ایسے ہی تارا چند تارا۔ فوق کو لکھتے ہیں۔ سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء کا لکھا ہوا خط ہے۔ اللہ یار جو گئی کو سلام پہنچے۔ تارا کو بھی۔ تارا چند تارا داغ کے شاگرد تھے۔ داغ سے تعلقات تھے۔ رفیق تمبا کو فروش سے بھی اصلاح لیتے۔ وہ بھی داغ

کے شاگردوں میں سے تھے۔ تارامٹھائی کی دوکان کرتے۔ کسن شان سے کہتے ہیں:

تارا نہ ہو تو حلوہ سوہن کھلانے کون

جو گی پینچہ فولاد میں مسح کا کام کرتے مگر شعرو شاعری کی محفلوں میں شریک ہوتے ہوتے شاعر بن گئے۔ فوق کے محمد اقبال سے تعلقات تھے۔ جو گی نے بھی ان سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ محمد اقبال انگلستان سے واپس آئے تو ان کے خیر مقدم میں ایک نظم لکھی۔ محمد اقبال اپنے ملنے والوں کے قدردان تھے، انھیں کبھی نہیں بھولے۔<sup>۲۶</sup>

محمد اقبال کی شاعری، محمد اقبال کی حب الوطنی، محمد اقبال کی بے تعصی، رواداری اور وسیع الہمشربی نے ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا۔ ان کا خیال تھا وہ بڑے مہا پرش اور دلش بھگت ہیں۔ بے شک، لیکن ان معنوں میں نہیں جو ہندوؤں کے ذہن میں تھے اور جن کا اظہار آگے چل کر سیاست میں ہوا۔ بہر حال ہندوؤں میں بھی ان کے قدردانوں کی کمی نہیں تھی۔ لالہ کنور سین میں لاء کالج کے پرنسپل اور آگے چل کر ریاست کشمیر کے چیف جسٹس ایک طرح سے ان کے ہم درس تھے۔ میر حسن کے شاگرد۔ عربی میں ایم۔ اے کیا۔ عربی اور فارسی ادب سے شناسا۔ آیات قرآنی کا بلا تکلف حوالہ دیتے۔ شاید ۱۹۱۱ء کی بات ہے میں نے والد ماجد کے ہمراہ انھیں دیکھا۔ ان کا قیام اس وقت اس کوٹھی میں تھا جہاں کچھری روڑ پر اب واں چانسلر کا دفتر ہے۔ کنور سین اس زمانے میں لاء کالج کے پرنسپل تھے۔ سہ پھر کا وقت تھا والد ماجد سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار جب انہوں نے دول یورپ کے ہاتھوں دولت عثمانی کی پریشانی کا ذکر کیا تو کہنے لگے، شاہ صاحب قوموں کی زندگی میں ایسی پریشانیاں آتی ہی رہتی ہیں۔ پھر بلا تکلف قرآن مجید کی آیات قل اللہم مالک الملک توتی الملک من تشاء..... پڑھ ڈالی۔ محمد اقبال کی لیاقت اور قابلیت کے دل سے معرفت تھے۔ بڑے وضع دار بامروت۔ میر حسن کا ذکر آتا تو بڑے ادب سے ان کا نام لیتے تو اس کے باوجود حدود جہہ متصرف۔ کشمیر میں جو کوئی ان سے ملا اور محمد اقبال کا ذکر آیا گو دلی محبت اور قدردانی سے ان کی تعریف کی۔<sup>۲۷</sup>

لالہ لاچپت رائے کو بھی محمد اقبال سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ ان کے جذبہ حب الوطنی کے معرف اور سیاست میں شدید اختلاف کے باوجود ایک بات میں ان کے متفق، گواپنے طور پر لاچپت رائے کہتے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اپنا ایک طریق زندگی ہے۔ ان میں سیاسی اتحاد ممکن نہیں۔ ایک قوم کیسے نہیں۔ کیوں نہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ لاچپت رائے کی اس

معاملہ میں اپنی ایک رائے تھی۔ ایک طریق عمل۔ محمد اقبال کو دل سے ناپسند۔ ویسے لاجپت رائے سے خوب خوب گفتگو کیں ہوتیں۔ ۱۹۲۸ء میں جب درود گردہ کا شدید دورہ ہوا اور میر حسن نے رائے دی کہ محمد اقبال طب سے رجوع کریں تو لاجپت رائے ہی کے مشورے سے دہلی گئے۔ حکیم نایینا مرحوم سے رجوع کیا اور ان کے علاج سے اچھے ہو گئے۔ لاجپت رائے کو ۱۹۲۷ء میں سائنس کیشن کے خلاف مظاہرے میں شدید ضریب آئی تھیں۔ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی حکیم نایینا سے رجوع کیا۔ ان کا علاج کامیاب، رہا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پنپل کرٹل ہارپنیشن ۱۹۳۸ء کا علاج تھا، بات نہیں بن رہی تھی، حکیم صاحب کی کامیابی پر حیران رہ گئے۔

پنڈت شیبو نارائن شیم کیل ہائیکورٹ، شاعر، زبان دان، محمد اقبال کی دل سے قدر کرتے۔ مرا جلال الدین کہتے ہیں انھیں اقبال سے بڑا انس تھا۔

محزن کے اہل قلم میں توک چند محروم کا نام سرفہrst رہے گا۔ انھوں نے پنجاب کے ایک دور دراز ضلعے میاں والی میں پیٹھ کر اردو زبان میں بڑی عمدہ نظمیں لکھیں۔ اردو زبان پر انھیں جو قدرت حاصل تھی اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ محروم کو بھی محمد اقبال سے دلی لگاؤ تھا۔ انگلستان سے واپس آئے تو انھیں خوش آمدید کی۔ ایک نظم لکھی۔ ان کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد تو آج کل بھارت میں گویا اقبالیات کے خاص نمائیدے ہیں۔

محروم نواحی خیل میں پیدا ہوئے۔ موضع نور زمان شاہ میں تعلیم مکمل کی تو دیریک عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں معلم رہے۔ پھر گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو کے پیغمبر مقرر ہو گئے۔ سلسلہ ملازمت پنجاب یونیورسٹی دہلی میں ختم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں انتقال کیا۔ دو اویں متعدد ہیں۔ ایک مجومد رباعیات بھی ہے۔ محمد اقبال کی وفات کی خبر سنی تو دل تھام کر رہ گئے۔ کاغذ پھل لے کر بیٹھ گئے، مرثیہ لکھا۔ محمد اقبال سے اپنی عقیدت اور تعلق خاطر کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔ ۷۔ اشعار ہیں

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا  
احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا  
کنج مزار میں تن خاکی کو چھوڑ کر  
قدسی نژاد اون سماوات پر گیا

ہر گز نمیرد آنکہ داش زندہ شد بہ عشق  
 روشن تر اس حقیقت روشن کو کر گیا  
 محروم کیوں ترے دل حرام نصیب کو  
 یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا  
 ایک مرتبہ محمد اقبال سے ملے۔ عروض زیر بحث تھا۔ محمد اقبال نے کہا میں نے عروض  
 سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ پھر مشورہ دیا کہ آپ اس خارزار میں نہ الجھیں۔ زبان اور شعر کے بارے  
 میں محروم کا یہ شعر کیا خوب ہے:

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا  
 بیساختہ زبان سے نکلی ہے دل کی بات  
 محمد اقبال اپنے دوستوں کی بڑی قدر کرتے۔ سیالکوٹ کے علاوہ لاہور میں بھی ان سے  
 رسم و راہ میں فرق نہ آیا۔ مثلاً اللہ و حضرت رائے وکیل سے کہ بازار حکیماں کے شرکاءِ محفل میں  
 سے تھے۔ پنڈت کیوں کرشن نے تو آگے چل کر ان کی شاگردی بھی اختیار کی۔ آخری علالت  
 میں بھی ان کے بعض ہندو نیاز مند مزاج پرسی کے لیے آتے۔ ڈاکٹر جعیت سنگھ تو ہر دوسرے  
 تیسرے روز بلاناغہ حاضر خدمت ہوتے۔ ان کے سینے اور پیچھوں کا معانہ کرتے۔ کوئی نہ  
 کوئی دوسرا ساتھ ہوتی۔

۱۹۰۵ء میں محمد اقبال کی ملاقات مرزا جلال الدین سے ہوئی۔ مرزا صاحب بھی میاں  
 شاہنواز کی طرح ان کے یار غار تھے۔ دلی دوست، ہدم وہم راز، ندیم و جلیس، صبح و شام کا  
 ساتھ۔ ایک دوسرے کی رفاقت، بے تکلفی، ظاہر و باطن کے راز دار۔ مرزا صاحب لندن میں  
 بیرونی کر رہے تھے۔ شیخ عبدالقدار کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے۔ محمد اقبال کا ذکر آتا۔ محمد  
 اقبال سے غائبانہ تعارف ہو گیا۔ مرزا صاحب بیرونی بن کر لاہور آئے تو شیخ عبدالقدار نے  
 انھیں لکھا محمد اقبال انگلستان آنا چاہتے ہیں تم سے ملیں گے۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ محمد  
 اقبال مولوی سید ممتاز علی کے ہمراہ ان کے ہاں پہنچ۔ ملاقات رسی تھی۔ محمد اقبال نے معلومات  
 حاصل کیں۔ انگلستان چلے گئے۔ واپس آئے۔ وکالت کرنے لگے۔ مرزا صاحب بھی وکالت  
 کر رہے تھے۔ شیخ گلاب دین اور مولوی احمد دین سے ان کا بڑا گھوڑا تھا۔ صبح و شام کی نشست  
 رہتی محمد اقبال کا ذکر آتا۔ یوں مرزا صاحب کے دل میں پھران سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

محمد اقبال سے ملے، تجدید ملاقات ہو گئی۔ شیخ عبدالقدیر بھی انگلستان سے واپس آچکے تھے۔ رفتہ رفتہ دوستوں کا ایک چھوٹا سے حلقہ قائم ہو گیا۔ بارہووم کی پر لطف نشتوں میں مزے سے وقت گزرتا۔ بے تکلفی تھی۔ تعلقات بڑھنے میں دیرندگی۔ یہاں شاہنواز سے بھی یارانہ گھٹ پکا تھا۔ وہ بھی اس حلقے میں آ ملے۔ مرزا صاحب شعروخت کے ولد اداہ تھے۔ راگ رنگ کے شوقین۔ اپنے یہاں اکثر رقص و سرود کی محفلوں کا اہتمام کرتے۔ دوست جمع ہوتے۔ مولوی احمد دین کو رقص و سرود کا بڑا شوق تھا۔ مولوی صاحب ہی محمد اقبال کو ان محفلوں میں لے گئے۔ بقول مرزا صاحب: ”مولوی صاحب کو اقبال کی ذاتی زندگی میں بڑا دخل تھا۔ اس کے خفی و جلی پہلوؤں سے پوری طرح واقف۔“<sup>۱۵۹</sup>

محمد اقبال مرزا صاحب کی محفلوں میں شریک ہوتے، گانا سنتے۔ مرزا صاحب نے تھوڑے ہی دنوں میں دیکھا کہ ”رقص و سرود کے دوران ہی کسی نہ کسی نظم کی آمد ہو جاتی ہے۔“ یہی سی آواز میں گنگنا نے لگتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو گانا بند کر دیا جاتا۔ محمد اقبال کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ سازندے جو اقبال کی طرز سے واقف ہو چکے تھے، نہایت مدھم سروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے جس کے ساتھ وہ اپنی مخصوص لے میں، جس کی دل کشی کا انہمار الفاظ میں نہیں ہو سکتا، اپنے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے۔ سازوں کی آواز کچھ ایسی دل نواز ہو جاتی کہ سماں بندھ جاتا۔ گانے کی مجلس میں کوئی لطف نہ رہتا۔ گویاں کو رخصت کر دیا جاتا:

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

اس نظم کی بنیاد ایک ایسی، ہی مجلس میں رکھی گئی۔<sup>۱۶۰</sup> مرزا صاحب کے یہاں ریاست ٹونک کا ایک ملازم ستار خوب بجاتا۔ وہ جب حضور سرور کائنات گی تعریف میں مسدس کا یہ بند

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

نشید کرتا تو محمد اقبال بے اختیار آب دیدہ ہو جاتے۔ جہاں کہیں کوئی عمدہ نعمت سننے رقت طاری ہو جاتی۔ محفل کا نشہ بدل جاتا۔ حقیقی اقبال کی جھلک دکھائی دینے لگتی جس کا دماغ حریم ربانی کے جلوؤں سے مدد ہوش، جس کا دل تجلیات خداوندی سے منور۔ جس کی نگاہ میں پیغمبرانہ پا کیزگی اور جس کے تخیل میں ملکوتی بلندی تھی۔ یہی وہ مقدس ساعت ہوتی جس میں شاعر مشرق خاک دلن عالم سے بلند ہوتا۔ خود عرش معلیٰ کی طرف بڑھتا اور جذبات کی تند تیز موجیں اس کے مخنی چشمے سے موسیقیت کے ساتھ شعر کی صورت میں اٹھنے لگتیں۔<sup>۱۶۱</sup> مرزا صاحب نے محمد اقبال سے

اپنی سالہا سال کی رفاقت کے حالات بڑی خوبی سے لکھے ہیں۔ اسلام سے محمد اقبال کی والہانہ محبت، قرآن مجید میں مذہب و تلقیر، آیات قرآنی کی تفسیر، قادیانی تحریک سے بیزاری، علی گڑھ تحریک کی حمایت، سیاست میں سرسید کی تعریف مگر تفسیر میں اختلاف، شوق مطالعہ، اسلامی علوم و معارف کی اشاعت کا خیال، قناعت، توکل، دینیوی اعزاز اور دولت سے بے نیازی، یہ تھے محمد اقبال۔ مرزا صاحب نے بارہوں اور دس توں کے یہاں محمد اقبال کی پر لطف گفتگوؤں، لطیفوں اور چٹکوں کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ ان کی جودت طبع، علوقہ، پاکیزہ خیالی اور ذہن رسا کا یہ عالم تھا کہ بذلہ گوئی کی نوبت آتی تو اس میں بھی کوئی علمی نکتہ پیدا کر لیتے۔ مرزا صاحب نے محمد اقبال سے اپنے گھرے روابط کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ اور سیرت و کردار کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔

ستمبر ۱۹۳۷ء میں مرزا صاحب یورپ سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ محمد اقبال یہاں ہیں، بے قرار ہو کر مزاج پر سی کے لیے پہنچ۔ محمد اقبال نے کہا جم کر بیٹھو گے یا یوں ہی جہاں گروی کرتے رہو گے؟ یہاں مخفیل کو پھر ایک نظر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مرزا صاحب جنوری ۱۹۳۸ء میں یورپ جانے سے پہلے ان کے پاس بیٹھے حال پوچھ رہے تھے کہ میاں شاہ نواز بھی آگئے۔ محمد اقبال نے کہا لو آج پھر وہی مخفیل قائم ہو گئی۔ ”اقبال کی فلسفیانہ گفتگو“ میں زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد کر کے پھر اسی پرانی انجمن میں لے گئی جس کے کبھی وہ خود روح رواں تھے۔ آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹنے لگے..... بچوں کی طرح، جو اپنی بھولی بسری شرارتؤں کو یاد کر کے لطف اٹھاتے ہیں، ہم بھی اپنی بے فکری کی زندگی کے گذشتہ واقعات یاد کرنے لگے۔ ہم تینوں کی یہ آخری صحبت تھی،<sup>۱۵۲</sup> مرزا صاحب پھر یورپ چلے گئے واپس آئے اور پھر ان سے ملے تو ان کے چہرے پر کوئی ایسے آثار نہ دیکھے جن کو دیکھ کر کہا جاسکتا کہ مفکر اسلام چند دنوں کے مہمان ہیں۔<sup>۱۵۳</sup> اپریل کی شام کو دہلی جا رہے تھے کہ صبح ریڈ یو پران کے انتقال کی خبر سنی۔ ”اس خبر سے یوں دچکا لگ جیسے کسی نے اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ چپ چاپ فرش پر بیٹھ گیا۔ تمام قومی پرداہشت ناک و حشمت طاری تھی جو زر لے کے جانے کے بعد عناصر کائنات میں نظر آتے ہیں..... یہ وہ غم تھا جس میں انسان پائے ہائے نہیں کرتا، اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے، صرف اس کی نظر پھرا جاتی ہے، روح تخلیل ہونے لگتی ہے۔“<sup>۱۵۴</sup>

۱۸۹۵ء میں سید غلام بھیک نیرنگ لا ہو رآئے۔ وطن دورانہ ضلع انبلہ۔ گورنمنٹ کالج

میں داخلہ لیا۔ چودھری جلال الدین کے توسط سے ملاقات ہوئی۔ شعرو شاعری دوستی کا ذریعہ بنی۔ ابی دوستی کہ تاجین حیات قائم رہی۔ میر صاحب انبار میں وکالت کرتے شعر کہتے، مخزن میں ان کا کلام شائع ہوتا۔ محمد اقبال کے احباب خاص میں سے تھے۔ سالہاں سال مرکزی لیجسیلیٹو اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے رہے۔ آخری زندگی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔ محمد اقبال کو خط لکھتے، ان سے ملتے مشورے لیتے۔ محمد اقبال کے بعض حالات میں نیرنگ نے لکھا ہے: ”ہم کو اتنا شعور ہی نہیں تھا کہ اس زمانے کے اقبال میں ما بعد کے اقبال کو دیکھ لیتے۔ ہم اپھیں ایک طالب علم، جس نے شاعرانہ طبیعت پائی ہے، سمجھتے تھے“ ۱۹۰۱ء میں سیالکوٹ گئے۔ محمد اقبال کے مہمان رہے۔ آفتاب اور اعجاز کو دیکھا جو ابھی بچے تھے۔ ان کے والد ماجد سے ملے۔ میر حسن کی زیارت کی۔ جھنڈے خان سے کہ محمد اقبال کے خاص دوست تھے، ملاقات ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں محمد اقبال یورپ گئے تو میر نیرنگ بھی انھیں خدا حافظ کہنے والی بچپنے۔ یورپ سے واپسی پر چنگڑ ملے میں، جہاں ان دونوں محمد اقبال کا قیام تھا، ملے تو یہ دیکھ کر کہ انھوں نے بڑا نستعلیق سوٹ پہن رکھا ہے، بہت خوش ہوئے۔ شکر کیا کہ انھوں نے لباس پہننا سیکھ لیا ہے۔ مگر سوٹ جلدی ہی اتر گیا۔ پھر وہی کرتہ اور بنیان، شانوں پر کمل، ہم نفس (حقہ) حاضر، فرش کی نشست، تین دن اسی بیست کذائی میں گزرے۔ محمد اقبال کا داماغ گوناگوں فضائل سے آراستہ، سینہ طرح طرح کی امنگوں اور عزماً سے پر، مگر رندی اور قلندری میں فرق نہ آیا۔<sup>۱۵۴</sup> اسرار خودی کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۵ء میں انارکلی میں ملنے آئے تو ریل اس وقت لاہور آئی کہ میر صاحب محمد اقبال کے یہاں پہنچے تو ابھی صحیح کی نماز کا وقت باقی تھا: ”میں پہنچا تو ایک کمرے سے تلاوت کلام اللہ کی بلند مکرناہیات شیریں اور در دلگیز آواز میرے کا نوں میں آئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ فوراً وصویکیا۔ دیکھا اقبال مصلے پر بیٹھے قرآن حکیم پڑھ رہے ہیں..... میں نے اس مصلے پر نماز پڑھی تو نماز میں ایک خاص کیفیت محسوس کی اور میں نے دل میں اس وقت کہا کہ یہ کیفیت وہی شخص یہاں چھوڑ گیا ہے جو ابھی ابھی یہاں بیٹھا ہوا کلام اللہ پڑھ رہا تھا۔ اس روز سے محمد اقبال کی روحاںیت کا قائل ہو گیا۔<sup>۱۵۵</sup> میر صاحب نے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں محمد اقبال کے طرز بودو باش کا حال، جہاں وہ کئی بار ان کے مہمان ٹھہرے، بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ”محمد اقبال بالعموم غیر متحرک رہتے لیکن قومی ضرورتوں کے موقع پر دھڑا متحرک بن جاتے۔ مثلاً ریاست الور میں مسلمانوں پر ظلم کے معاملے

میں میر صاحب نے تحریک تبلیغ کی بنادی تو اس میں دلی جوش سے شریک ہو گئے۔ میر صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۳۶ء میں مصر سے تبلیغی و فد آیا تو میر صاحب کو بڑے تفیقی مشورے دیے ۱۹۳۷ء میں حضرت مجدد کے مزار پر حاضری دی تو میر صاحب کو لکھا آپ بھی سر ہند آ جائیں۔ میر صاحب سر ہند پہنچ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک یورپین مسلم کا نفرس کے انعقاد کا خیال آیا۔ میر صاحب کو خط لکھا مگر کافرنز منعقدہ ہو سکی، الایہ کہ اگلے سال لارڈ ہیڈلے ہندستان آئے۔ میر صاحب محمد اقبال کے ساتھ شملہ سے کالا جارہے تھے، راستے میں درخواست کی قرآن کی تفسیر لکھیں۔ لیکن محمد اقبال نے معدود ری طاہر کی کئی ایک نازک مسائل چھیڑ دیے۔ دوران گفتگو میں ان پر جوش اور جذبے کی کیفیت طاری ہو گئی، مگر انہوں نے جلدی اس پر قابو پالیا۔ ۱۹۴۸ء میر صاحب کی ان سے آخری ملاقات ۱۹۴۷ء کی سردیوں میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد میر صاحب پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انتقال کیا۔

میر نیرنگ کا قیام ایک زمانے میں کوچہ ہنومان میں تھا۔ میر صاحب اس زمانے میں قانون پڑھ رہے تھے۔ اسی کوچہ میں جس کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی، ایک مکان میں رہتے۔ محمد اقبال اکثر ان سے ملنے جاتے، بلکہ شاید ایک آدھ روز انھیں کے ہاں ٹھہر بھی جاتے۔ پاس ہی محمد اقبال کے ہم جماعت مولوی ضیال الدین کامکان تھا جو متوں سندھ میں پولیس کمشنر ہے۔ پیش پا کرو اپس آئے تو اکثر محمد اقبال سے ملتے۔ میر نیرنگ اور مولوی صاحب کو اکھاڑے کا شوق تھا۔ محمد اقبال بھی کبھی کبھی لگنگوٹ کس کراکھاڑے میں اتر آتے۔ یہ شیخ عبدالقدیر کا بیان ہے۔ وہ بھی اکثر میر صاحب سے ملنے آتے۔ محمد اقبال کہتے ہیں: ”کوچہ ہنومان میں ایک ہندو پنڈت صبح سوریے گھر سے نکلتا، بڑی دلش آواز میں بھجن گاتا۔ میں یہ بھجن سنتا۔ ایک روز اس سے پوچھا تم جو بھجن گا رہے ہوئے اس کا مطلب کیا ہے: اس نے کہا مطلب وطلب تو معلوم نہیں البتہ ورد کرتا رہتا ہوں“ ۱۵۷۔

مرزا عجاز حسین سے بھی میر نیرنگ کے دوستانہ تعلقات تھے، ویسا ہی پیار اور بے تکلفی مثنوی رموز یہے خودی لکھی تو اشاعت سے قبل اس کا مسودہ میر نیرنگ کی طرح مرزا صاحب کو بھی بھیجا۔ شاید مرزا صاحب کو بھی میر نیرنگ کی طرح اسرار خودی کے بعض مطالب بالخصوص حافظ کے سلک کو سفندی سے انکار تھا۔ ۱۹۳۲-۳۳ء میں دلی میں مجھے اکثر ان کا نیاز حاصل ہوتا۔ میر صاحب نے گاندھی ارون یثاق پر، ۱۹۴۸ء جب معلوم ہوتا تھا کا گنگریں اپنی منزل مقصود

پر پنچھے والی ہے، ایک غزل کبھی جس کے ایک شعر میں یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید ایسا نہ ہو سکے۔  
میں نے یہ شعر:

یہ مانا ہاتھ میں ساغر ہے لیکن کیا بھروسہ ہے  
ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے تک

جو اس انگریزی ضرب المثل کا نہایت خوب ترجمہ ہے کہ پیالہ شراب کئی بار ہونٹوں تک آ کر  
روہ جاتا ہے،<sup>۱۵۹</sup> پڑھا تو فرمایا مرزا عجاز کی طبیعت شاعری کے لیے بڑی موزوں تھی۔ گویا انھیں  
افسوں تھا کہ مرزا صاحب نے شاعری کیوں نہیں کی۔

شیخ نذر محمد بھی اقبال کے نہایت عزیز دوستوں میں تھے۔ مخزن کے حلقة احباب میں  
شامل، کشمیری نژاد پنجابی ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے، گوجرانوالہ کے ایک علم دوست خاندان میں شیخ  
صاحب کے والد مولوی غلام رسول بہترین خطاط تھے۔ کاروبار کرتے۔ شیخ صاحب نے ۱۸۸۹ء  
میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ ان ۹ طلباء میں جو اس سال بی۔ اے میں کامیاب  
ہوئے واحد علی ہذا ضلع گوجرانوالہ کے پہلے مسلمان گرجویٹ۔ اس زمانے میں معیار تعلیم اتنا بلند  
تھا کہ بی۔ اے کے بعد کم مزید تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی۔ شیخ صاحب مکمل تعلیم میں ملازم ہو  
گئے۔ معلمی کی، ہیڈ ماسٹر بنے، ترقی کرتے کرتے انسپکٹر مدارس ہو گئے اور بیشیست انسپکٹر مدارس  
ہی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شعر و تصنیف سے دلی ذوق تھا۔ شعر کہتے۔ نذر تخلص  
کرتے۔ کلام مخزن میں چھپتا۔ کلام نذر کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہوا تو مولا نا حالی  
اور محمد اقبال نے اسے بہت سراہا۔ پیرا یہ بیان اور مضامین کی تعریف کی۔ حالی نے کہا مناظر  
قدرت کا سماں خوب باندھا ہے۔ محمد اقبال نے لکھا ہو جوانوں کے لیے یہ مجموعہ ہدایت آموز اور  
دلچسپ ثابت ہو گا۔

۱۹۰۸ء میں رسالہ زبان دہلی جو کبھی راستہ دہلوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مائل دہلوی

کے زیر اہتمام پھر سے جاری ہوا تو شیخ صاحب کو محمد اقبال کے یہ دو شعر:  
جہاں سے پلتی تھی اقبال روح قبر کی  
مجھے بھی ملتی ہے روزی اس خزینے سے  
ہمیشہ وردِ زبان ہے علیؑ کا نام اقبال  
کہ پیاس بھجتی ہے دل کی اسی گلینے سے

اس قدر پسند آئے کہ انہوں نے اس کی تقطیمیں میں گیارہ اشعار کہہ ڈالے:

پسند ہیں مجھے اقبال کے یہ دونوں شعر  
لگائے رکھتا ہوں ہر وقت ان کو سینے سے

پہلے دس اشعار تمہید میں ہیں۔ حضرت مائل نے لکھا: یہ شیخ محمد اقبال کی ایک مختصر سی نظم پر شیخ صاحب کی تقطیمیں ہے۔ محمد اقبال کی یہ مختصر سی نظم مسخرن میں شائع ہوئی۔ باقیات اقبال میں موجود ہے۔

شیخ صاحب عروض کا مطالعہ کر رہے تھے۔ محمد اقبال کو خط لکھا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ اساتذہ کا کلام دیکھتے رہیں، یوں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ شیخ صاحب باوجود تفاوت عمر اصلاح کلام میں ان سے رجوع کرتے۔ انہوں نے خود بھی شاعری میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ نوجوان اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان سے مشورہ لیتے۔ ۱۹۰۵ء میں محمد اقبال انگلستان روانہ ہوئے اور ایک روز دہلی ٹھہرے تو انہیں کے یہاں

قیام کیا۔ شیخ صاحب ہی کے ساتھ درگاہ شریف خواجہ نظام الدین میں حاضری دی۔ محمد اقبال انگلستان میں تھے کہ شیخ صاحب کا خط پہنچا۔ جواباً نظم لکھی جو ۱۹۰۶ء میں بے عنوان پیغام راز مسخرن میں شائع ہوئی۔ ابتداء اس شعر سے کی تھی:

کیوں کرنہ وہ جہان کو پیغامِ بزمِ راز دے  
غم کی صدائے دل نشیں جس کا شکستہ ساز دے

بانگ درا میں اس نظم کے کچھ اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ عنوان بھی پیغام راز کی  
بجائے مغضُ پیام ہے۔ مسخرن میں اس نظم کا اختتام یوں ہوا تھا۔ الرقم:  
پیرِ مغار فرنگ کی سے کا نشاط ہے اثر  
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

بانگ درا میں البتہ اس سے پہلے جو شعر آیا ہے باصلاح یوں بدل دیا گیا:

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا بزمِ کہن بدل گئی  
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

محمد اقبال مئے فرنگ کا مزہ چکے تھے، جان گئے تھے اس میں نشاط ہی نشاط ہے، کیف

غم نہیں ہے۔ قوم کو منے فرگ کی نہیں، خانہ ساز کی ضرورت ہے کیف غم کی دنیا بدل گئی۔ منے مجاز میں کیا رکھا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ غور کیجیے، محمد اقبال کی شاعری بدرجہ ایک پیغام کا رنگ اختیار کر رہی تھی۔

محمد اقبال انگلستان ہی میں تھے، ارادہ کیا شاعری کو ترک کر دیں۔ شیخ صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے لکھا:

تجھے خدا کی قسم نہ کر بند نغمہ برباط سخن کو  
پھر جب سن محمد اقبال کہتے ہیں، شاعری کیا ہے آرام کری میں بیٹھے مطالعے ۱۱ کا دوسرا  
نام محمد اقبال کو شکایتہ لکھا۔ ایسا نہ کہیے۔ شاعری آرام کری کے سپرد ہو گئی تو عروسِ شاعری پر کیا  
گزرے گی۔

شاعری کو کر دیا آرام کری کے سپرد  
دوستوں کو نثر کی بتلائیں سو سو خوبیاں  
پھر کہتے ہیں:

حال جب اقبال کا یہ ہے عروسِ شاعری  
کس کو دکھلایا کرے گی اپنی اب عشوہ گری  
گوجرانوالہ لاہور سے دور نہیں، محمد اقبال سے اکثر ملاقات رہتی۔ دوران علاالت میں  
شاید ان کی عیادت کو نہیں آ سکے۔ پیرانہ سالی تھی۔ وفات کی خبر سن تو بے قرار ہو گئے۔ گزری  
ہوئی صحبتوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ مرثیہ لکھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اشعار سادہ ہیں  
مگر دلی رنج و اندوہ کے ترجمان۔

شیخ صاحب نے طویل عمر پائی۔ ۹ فروری ۱۹۳۲ء کا دن تھا کہ اپنے مکان نزد منزل کی  
چھت سے گر گئے۔ جان برنا ہو سکے۔ گوجرانوالہ ہی میں مدفن ہیں۔

بیشش العلماء مولوی محمد حسین پروفیسر فارمن کرپشن کانج لاہور اور مولوی محمد حسین  
جالندھری بھی کہرتا پانموہ اخلاق تھے، اسلامی حسن کردار اور حسن سیرت کا آئینہ، لاہور ہی میں  
مقیم تھے۔ قیاس یہ ہے کہ محمد اقبال ان بزرگوں کی صحبوتوں سے بھی مستفیض ہوئے۔ مرز ارشد  
گورگانی سے تو ایک گونہ تلمذ بھی تھا، منصانہ رو باط بھی۔

۱۹۰۱ء میں مولانا نذری احمد انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے۔ نالہ یتیم سناتو

محمد اقبال کو دل کھول کر داد دی۔ ۱۹۰۲ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی جبیب الرحمن شیر وانی انجمن حمایت اسلام کی دعوت پر لاہور آئے، شیخ عبدالقادر کے یہاں مہمان ظہرے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: شیخ کی خاتقاہ اردو ادب کے اہل ذوق کا مرجع بنی ہوئی تھی۔ نیرنگ، اقبال، احمد حسین خان، خود شیخ یا رب عناصر وہاں جمع ہوتے۔ مجھ کو اس صحبت میں ان احباب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی خصوصیت حاصل ہونے کا موقعہ ملتا رہا۔ اقبال اور نیرنگ کی نظریں سنیں اور ان کے ترجم سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۰۳ء نواب صاحب سے محمد اقبال کے روابط میں ہے تکلفی کا رنگ نمایاں ہے۔ ملاقاتوں کا موقعہ تو کم تھا۔ خط و کتابت رہتی۔ نواب صاحب سخن گو تھے اور سخن سخن بھی۔ فریاد امت کے بعض اشعار پر تبصرہ کیا۔ محمد اقبال ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں: افسوس ہے اس سال آپ انجمن کے جلے میں تشریف نہ لاسکے۔ میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا گرامی، غرضیکہ محفل احباب کے سب ارکان مشیدہ موجود تھے۔ آپ ہوتے تو ایک آدھ رات خوب گزر جاتی۔ جبیب کی موجودگی میں شعراء کے لیے کافی سامان ہے، بالخصوص جب جبیب شعر فہم اور شعر گو بھی ہو۔ آگے چل کر لکھتے ہیں مولانا گرامی پوچھتے ہیں کس کو لکھ رہے ہو۔ میں کہتا ہوں جبیب کو تو آپ فرماتے ہیں میرا بھی سلام لکھ دیں۔ ۱۹۳۳ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر لٹلی می کانفرنس میں شرکت کے لیے ٹنگمری آئے تو دو روز نیرنگ کے ساتھ محمد اقبال کے مہمان رہے۔ میر نیرنگ نے پھر اس موقع پر اقبال کی روایتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ۱۹۰۰ء نواب صاحب کی شدیدیان سے آخری ملاقات تھی۔

مدارس لاہور سے بہت دور ہے۔ لیکن محمد اقبال کی شہرت ۱۹۰۰ء کے اوائل ہی میں ہندوستان بھر میں پھیل چکی تھی۔ مدارس سے ابوالمعانی محمد عبدالرحمن شاطر مولوی عبدالغنی خاں امیر کے بیٹے نواب سکندر جنگ بہادر اول شہزادہ ارکاث کے پوتے، عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کے عالم جو کبھی نواب صاحب ارکاث کے سیکرٹری اور مدراس چیف کورٹ میں مترجم رہ چکے تھے، اکثر انھیں خط لکھتے۔ ذوق سخن اور دولت علم خاندان سے ورثے میں ملی۔ عبدالغنی خاں امیر قصہ یوسف زلیخا اور ایک عربی قصیدہ صنعت عاظله یعنی غیر منقوط الفاظ میں لکھ کچکے تھے جو بہت مقبول ہوا۔ شاطر کا کلام جدید فلسفہ اور جدید سائنس کے دقیق مضامین پر مشتمل ہے۔ کارنامہ دانش کے نام سے شائع ہوا۔ شبلی نے شاطر کی قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے۔ شاطر کی فلسفیانہ نظم 'اعجاز عشق' کو خوب خوب شہرت ہوئی۔ مشاہیر علم و ادب نے اسے نہایت اچھے

الفاظ میں سراہا۔ شاطر محمد اقبال کو اپنا کلام بھیجتے۔ محمد اقبال کو توجہ تھا کہ مدراسی ہو کر ان کی زبان کسی صاف ہے۔ اشعار پر رائے زنی کرتے داد دیتے، شاطر کا کلام مخزن میں شائع ہوتا۔ ”اعجاز عشق“ کا ایک حصہ بھی شائع ہوا۔ محمد اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں: ”مولانا حامل نے جو کچھ آپ کے اشعار کی نسبت تحریر فرمایا ہے: بالکل صحیح ہے۔ میرا خود خیال تھا آپ ہندوستان<sup>۲۵</sup> کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی بہت توجہ ہوا۔“ مولانا حامل نے شاطر کے ایک شعر انتخاب کیا تھا، محمد اقبال کے علاوہ اس کے کئی ایک اور اشعار کی تعریف کی۔ لکھتے ہیں: ”آپ کا قصیدہ پنڈت مجرام کو از بر ہے۔“<sup>۲۶</sup> ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ”اکثر اشعار نہایت بلند پایا ہے اور معنی خیز ہیں۔۔۔۔۔ اشعار کا اندر وہی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نمایاں کر کے دھلا رہا ہے۔ انسان کی روح کی اصلی کیفیت غم ہے۔ خوشی ایک عارضی شے ہے۔۔۔۔۔ آپ نے فطرت انسانی کے اس گھرے راز کو خوب سمجھ لیا ہے“<sup>۲۷</sup>

شاطر ۱۹۳۳ء میں فوت ہوئے۔ سید سلیمان ندوی نے یاد رفتگان میں ان کا ذکر کیا ہے۔ حامل سے تو محمد اقبال کو گہری عقیدت تھی۔ ان سے نیازمندانہ روابط تھے۔ ان کی غیرت ملی، اسلام اور مسلمانوں کے لیے درد مندی، درویش مشی اور سادگی کے دل سے قدر دان۔ حامل کو تحریک علی گڑھ سے جو تعلق ہے، حامل نے قوم کی اصلاح و تعمیر، تعلیم کی اشاعت اور سید احمد خاں کی تائید میں جس طرح قلم اٹھایا، نظم میں، نشر میں، محتاج بیان نہیں۔ محمد اقبال نے ۱۹۳۵ء میں حامل کی ان کوششوں کا اعتراف ان کے صد سالہ جشن کی تقریب میں، جس میں انھوں نے خود بھی شرکت کی، مسددس حامل کے صدی نئے کاغذ مقدم کرتے ہوئے چند لفظوں میں کس خوبی سے کیا ہے:

آن لالہ صمرا کہ خزان دید و بیفسرد  
سید دگر او رانے از اشک سحر داد  
حامل ز نواہائے جگر سوز نیا سود  
تا لالہ شبتم زده را داغ جگر داد

محمد اقبال مسددس کے عاشق تھے۔ مسددس پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔ ۱۹۰۳ء میں حامل انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ بیان ضعیف العمری ان

کی آواز میں اتنا زور نہیں تھا کہ سامعین تک پہنچ سکے۔ لوگ مصر کے ان کا کلام انھیں کی زبان سے سنیں۔ شیخ عبدالقدیر اٹھے، کہنے لگے، جتنا کچھ سن سکتے ہیں۔ سن لیجیے، پھر اقبال ان کا کلام پڑھ کر سنائیں گے۔ حالی اپنا کلام پڑھ پکے تو محمد اقبال اٹھے۔ اول فی البدیہ یہ قطعہ پڑھا:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی  
معمول مئے حق میں ہے جامِ حالی  
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا  
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

حالی بھی محمد اقبال سے بے شفقت بزرگانہ پیش آتے۔ ان کی علمی قابلیتوں اور شاعری کے دل سے معرفت تھے۔ حالی کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ محمد اقبال کے دل کو چوٹ لگی۔ شبی حالی کے عنوان سے مرثیہ لکھا:

شبی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان  
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نور د

مولانا شبی کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ علم الاقتصاد تصنیف کی توزیب کے معاملے میں ان سے رجوع کیا شاید آر علڈ کی بدولت۔ یوں خط و کتابت کا آغاز ہوا تو نیاز مندا رہ روابط قائم ہو گئے۔ جیسے جیسے محمد اقبال کی شاعری نے ایک دعوت اور پیغام کارنگ اختیار کیا مولانا شبی کے دل میں ان کی قدر و منزلت بڑھتی چلی گئی۔ وہ کہہ ہی چکے تھے جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔ ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا مہمن ان بیوی کیشنل کافرنس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا۔ محمد اقبال کی شاندار خدمات کا اعتراف مقصود تھا۔ طے پایا کہ اقبال نے صرف اس کافرنس کے اس اجلاس کی صدارت کریں، بلکہ ان کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈالا جائے۔ یہ سرم مولانا شبی کے ہاتھوں ادا ہو۔ محمد اقبال لکھنؤ گئے، کافرنس کی صدارت کی، مولانا شبی نے ہار پہنایا، تقریر کی۔ شبی کا انتقال ۱۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ محمد اقبال نے ان کے مزار کے لیے کتبہ تحریر کیا: امام الہند والائز ادشبلی طاب ثراہ۔

خواجہ حسن نظامی خواہر زادہ حضرت خواجہ محبوب اللہ خواجہ نظام الدین اولیاء ۱۸۸۰ء میں ولی میں پیدا ہوئے۔ بڑے ذہن و فطیں، معاملہ فہم اور زیریک انسان تھے۔ اردو کے صاحب طرز ادیب، انداز بیان اچھوتا۔ محمد اقبال کہتے ہیں: اگر میں خواجہ صاحب جسی نشر لکھنے پر قادر ہوتا تو

کبھی شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بنا تا۔ ۱۹۰۳ء خواجہ صاحب نے ۱۹۰۳ء میں پنجاب آئے انہم حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوئے۔ یہی جلسہ تھا جس میں محمد اقبال نے وہ مشہور نظم جس کا عنوان ہے 'تصویر درد پڑھی'۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ مولانا ابوالکلام بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ حسن نظامی خاموش بیٹھے نظم سن رہے تھے لیکن دل کی یہ کیفیت کو نظم ختم ہوئی تو اٹھے، اپنا عمامہ اُن کے سر پر کھدیا اور کہا:

تمھارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو  
انجمن نے حسب معمول عما مے کی نیلامی کا اعلان کر دیا۔ نیلامی کی نوبت آئی تو حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر نے ایک سورپے میں خردی لیا۔ انجمن کو چندہ مل گیا۔ یہ ابتداء تھی محمد اقبال اور خواجہ صاحب کی اس گھری اور صمیم قلب سے دوستی کی جس کا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے اور جس میں کئی نشیب و فراز آئے۔ اسرار خودی کی اشاعت سے شکوہ و شکایت کا دفتر کھل گیا۔ دلوں کا رنخ پہنچا۔ لسان العصر ثالث بالغیر بنے۔ کشیدگی جاتی رہی۔ پھر وہی خلوص، وہی محبت وہی قدر دانی۔ تاحین حیات تعلقات میں فرق نہ آیا۔ خواجہ صاحب نے لکھا: ملن ساری کا برتاو اور شے ہے اور دوستی کسی اور شے کو کہتے ہیں۔ دوستی ایک ناقابل ختم ملنساری ہے اور جیسی زندگی کو اس کو ضرورت ہے مشکل سے میسر آتی ہے۔ ۱۹۰۴ء قیام پاکستان کے بعد خواجہ صاحب نے محمد اقبال کے خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقاً فنا خیس لکھے گئے۔ پاکستان کے موجوداً ول سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام کے عنوان سے شائع کیا۔ خواجہ صاحب لا ہور آتے، محمد اقبال وہی جاتے، خط و کتابت کا سلسلہ لا ہور کیا انگلستان میں بھی جاری رہا۔ اس مجموعہ خطوط میں خواجہ صاحب تمہیداً لکھتے ہیں: "انھوں نے بار بار مجھے پاکستان کا منصوبہ سنایا تھا، مگر اس منصوبے میں ابھی ہندوستان کی تقسیم کا خیال نہیں تھا، بلکہ ساری اسلامی دنیا کے اتحاد کو وہ پاکستان کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان ہندوستان میں بنایا جائے اور ساری اسلامی دنیا کا ہندوستان مرکز بن جائے"۔ مکمل دیکھیے خواجہ صاحب نے بات تو ٹھیک کہی ہے، مگر الفاظ کے دو قیچی میں لفظ تقسیم سے کس طرح پہلو بچایا ہے۔ خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی بڑی عمرت اور تنگدرستی میں گزری۔ اعزاز و اقربا ان کے مخالف تھے۔ طرح طرح سے ان کا راستہ روکتے۔ ۱۹۰۳ء میں خاندان کے کسی فرد نے ان کی موت کی خبر اڑا دی۔ ۲۲ جولائی ۱۹۰۳ء کو محمد اقبال لکھتے ہیں: "دو دفعہ پیسہ اخبار میں بھی وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لا ہور کے دوستوں کو بے

انہا تشویش ہوئی مگر قدرت خدا کی مجھے مطلق رُخ محسوس نہ ہوا اور اسی بنا پر جس دوست نے پوچھا میں نے بلا تکلف کہہ دیا کہ خبر غلط ہے الحمد للہ ایسا ہی ثابت ہوا اور میں لا ہو رکھ کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہو گیا۔<sup>۳۱۴</sup>

محمد اقبال انگلستان گئے تو کیمپر ج سے ان کو خط لکھتے۔ کسی میں پیارے نظامی، کسی میں پراسرار نظامی، کسی میں سرمست سیاح کہہ کر خطاب کیا ہے۔ انگلستان اور جرمشی میں بقول خواجہ صاحب جو علمی فتوحات ہو رہی تھیں، ان سے باخبر رکھتے: ۱۰ افروری ۱۹۰۵ء کو اندن سے لکھتے ہیں: میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، اس پر مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے، دیکھنے کو وہ حقیقت میں ایک<sup>۳۱۵</sup>۔<sup>۳۱۶</sup> انگلستان گئے تو دہلی ٹھہرے، درگاہ شریف میں حاضری دی۔ واپس آئے تو پھر دہلی میں خواجہ صاحب کے بیہاں تو شہ خانے میں احباب کا اجتماع ہوا۔ خواجہ صاحب، میر نیرنگ، شیخ محمد اکرام کے علاوہ شاید کچھ اور دوست بھی موجود ہوں۔ محمد اقبال سیالکوٹ میں تھے، خط لکھا: آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے، مگر کیا کروں، علاقے نہیں چھوڑتے، روٹی کا وسیلہ لا ہو رہے باہر نہیں نکلنے دیتا۔<sup>۳۱۷</sup> یہ خواجہ صاحب کے اس خط کا جواب تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کوئی تحریک چلا رہے ہیں۔ محمد اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں: ”آپ لوگوں کو میرا مشتاق بنا رہے ہیں، اندیشہ ہے مجھ سے مل کر انھیں مایوس ہو گی۔ آپ اپنی تحریک میں بغیر پوچھئے مجھے شریک سمجھیں۔ مگر جس درد نے کئی دونوں سے مجھے بیتاب کر کھا ہے اس کی وجہ پہلے مجھ سے سن لیجیے،<sup>۳۱۸</sup> یہ معلوم نہیں ہو سکا خواجہ صاحب کیا تحریک شروع کرنے والے تھے۔ البتہ انہوں نے میرٹ سے توحید کا اجراء کیا تو محمد اقبال نے لکھا: خدا آپ کا بھلا کرے! آپ نے ہندوستان کے پرانے بت کدے میں توحید کی شمع روشن کی ہے۔ پھر جب خواجہ صاحب نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بیداری کے پانچ اسباب گوانے اور محمد اقبال نے ان سے اتفاق کیا تو شکایہ یہ بھی لکھا کہ اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز ہے میں نے اس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے ہے، آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے اس کا دوست انہا پسند نہیں..... محمد اقبال کی دعوت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانان ہند کی بیداری میں حصہ لیا۔<sup>۳۱۹</sup>

بکلام بیدل اگر رسی مکذر ز جادہ منصفی  
کہ کسے نبی طلبذ تو صلہ دگر مگر آفرین

۱۹۱۲ء میں محمد اقبال نے لسانِ العصر کے رنگ میں کچھ مزاحیہ قطعات انہیں حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھے جو بعد میں اکبری اقبال کے نام سے شائع ہوئے۔ خواجہ صاحب نے مقدمہ لکھا۔ مقدمہ کیا ہے خواجہ صاحب کے انداز تحریر کا ایک اچھوتا اور دلآلہ ویز نمونہ ہے۔ لکھتے ہیں: ”لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام اقبال ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے اور بیسرٹر ہے اور پی ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعرگاتے، شعر بجاتے اور موقع پاتے ہیں تو شعر بھی پیدا کر لیتے ہیں..... میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی، سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ یورپیں اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی مگر آدمی بھی نہیں پایا۔ وہ ازل سے جوان ہیں اور حیاتِ ابدی کا نشان ہیں..... اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو ان دیکھی شمع کا دیوانہ ہے..... اقبال ہمیشہ آسمان پر اڑتے ہیں، زمین پر بھی آنا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں ہم ان تک کیونکر پہنچیں..... ایک دن بھری محفل کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جن کا نام اکبر ہے۔ جوالہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی بستیاں بساتے ہیں۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان نہیں۔ اکبر اشاراتِ ربانی کے حامل ہیں۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دیکھتا ہے پھر قلم سے لکھتا ہے۔ اکبر کی ہربات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے..... اقبال نے اکبر کی زبان میں جو کچھ لکھا ہے وہ اکبری اقبال ہے ..... مجھ سے کہتے ہیں کہ اس نظم پر وہ لکھوں جسے انگریزی میں ”ریویو“ کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں بجتے ہوئے دریا کی روائی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لیکھ رہے، موجودی مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے کہ کسی کا یہ کہنا کہ کشتنیاں چکرائیں گی، بادل اٹھیں گے، زمین پر مینہ بر سائیں گے، فضول ہے۔ جانے والے خود جانتے ہیں۔ یہ طوفان کس موسم کی خبر دیتا ہے۔ میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔

خواجہ صاحب محمد اقبال کو طرح طرح کے خطابات دیتے، ان کا قلمی چہرہ تیار کرتے۔ انہوں نے کہا محمد اقبال ”سرالوصال“ ہیں۔ محمد اقبال نے کہا ایسا نہ کہیں میں ”سرالفارق“ ہوں۔

میرے کیش میں گستن پیوستن سے بہتر ہے۔

خواجہ صاحب نے محمد اقبال کا قلمی چہرہ بھی تیار کیا۔ ملاحظہ ہو کیا انداز بیان ہے: ”سر و قد، گندی رنگت، پر تمکنت چہرہ، داڑھی صاف، آنکھیں ایسی نشیل کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ ہے تو دوسری میں عمر خیام کا خم خانہ۔ جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان، مسلک حق پسندی، خدمتِ مذہب، مسلمانوں کی بہبودی، مراج میں سمجھیگی، متنانت اور استقلال۔۔۔۔۔ مسلمان کی نظر میں محبوب اور ہندو کی نظر میں اپنی صاف بیانی کی وجہ سے غیر محبوب۔ ان کی قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی بہار نہ آتی۔۔۔۔۔“

محمد اقبال اسرارِ خودی لکھ رہے تھے۔ خواجہ صاحب کو لکھا: عبد القادر نے اس کے کچھ نام تجویز کیے ہیں: ”اسرارِ حیات، پیامِ سروش، پیامِ نو، آئینِ نو“ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے۔ معلوم نہیں خواجہ صاحب نے اس کا کوئی نام تجویز کیا یا نہیں، لیکن اسرارِ خودی کی اشاعت پر انھوں نے جس بحث و نزاع کا آغاز کیا اس سے مہینوں تک فلسفہ اور تصوف کی دنیا میں ایک ہلچل سی پچی رہی۔ بڑے بڑے معركہ آرامضامیں لکھے گئے۔ محمد اقبال نے سب کا جواب دیا اور اس کے معرکے میں بالآخر کامیاب ہو کر نکلے۔ خواجہ صاحب سے خط و کتابت بھی ہوئی، خواجہ صاحب ناراض تھے لیکن لسانِ العصر پیچ میں پڑے، غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ پھر وہی ملاقاتیں، وہی آنا جانا، وہی رکھ رکھاؤ۔ ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں: ”نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان میں مقیم ہیں۔ نواب صاحب کے بہت سے مدار و معتقد ہیں۔ میں نے ان الفاظ میں تعارف کرایا۔ اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپ کے سپہ سالار، شیخ ہیں تو یہ آپ کے پروانے، ڈاکٹر ہیں تو یہ آپ کے دیوانے۔ ولی عہد منگرول بھی موجود تھے، انھیں منگرول آنے کی دعوت دی ہے۔ اس سے ایک روز پہلے یادوسرے دن خواجہ صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں عازی حسین رووف پاشا کا تو سیمی خطبہ سُنا۔ محمد اقبال صدر تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے چھت روزہ منادی میں اس جلسے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں لاہور آئے تو لکھتے ہیں: ”پنجاب میں راجہ پورس کو نکست دینے والے سکندر سے رخصت ہو کر ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا۔ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر کمرے کے اندر دکھائی دیا۔ اس کا انیس حق بھی اس کے سامنے موجود تھا۔ مجھ کو یہ شخص ٹیگور اور شیکسپیر سے کئی ہزار فٹ اونچا نظر آتا

ہے۔<sup>۸۱</sup> ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء کے منادی میں ایک طویل شذرہ تغیریت میں لکھا۔ ”اقبال کے مرنے سے ہندوستان میں نہیں ایشیا بھر میں اندھیرا چھا گیا۔“<sup>۸۲</sup> کے ۱۴ اپریل کے منادی میں لکھے چکے تھے: آج ۱۴ اپریل کو صح کویہ بخُسْنی کے اسلامی دنیا کے مسلم قومی شاعر نے انتقال فرمایا..... ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہو گا..... ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلاشی نہیں ہو سکتی۔<sup>۸۳</sup> پھر کہتے ہیں: مزید یہ کہ میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب ..... نے جمادات کے دن ۱۶ صفر ۱۳۵۷ھ صح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ وہ چونکہ محب اہل بیت تھا اور تفصیلی عقاوین درکھت تھے اس لیے قدرت نے ان کو چہلم سید الشہداء علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی۔<sup>۸۴</sup> آج رات پروفیسر مرزا محمد سعید نے دلی ریڈ یو میں مرحوم کی نسبت ایک بہت اچھا مضمون سنایا۔ جس کے بعد ریڈ یو والوں نے خبریں سناتے وقت کہا مرحوم اقبال نے اپنے قدیمی نوکر علی بخش کی گود میں جان دی۔ یہ سُن کر مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اتنا اثر جو گورنر پنجاب اور سریگور اور صدر کانگرس اور مسٹر جناح کے بیانات سے بھی نہیں ہوا تھا..... میں نے تعزیت نامہ علی بخش کو بھیجا ہے۔ مرحوم کی اولاد کے پاس نہیں بھیجا۔ اولاد کے پاس خود ماتم پرسی کے لیے جاؤں گا..... میرے کانوں میں اقبال کی آواز گونج رہی تھی: علی بخش حقہ بھر لا اور اندر سے جاوید کو بلا، خواجہ صاحب سے ملا۔<sup>۸۵</sup>

۱۹۵۲ء میں جب لاہور میں یوم اقبال منایا گیا تو خواجہ صاحب کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ خواجہ صاحب بسبب پیرانہ سالی لاہور تو نہ آ سکے، مگر لاہور میں اپنے خلیفہ جناب محمد حسین کو ایک طویل خط لکھا کہ اسے اخباروں میں شائع کر دیں۔ یہ خواجہ صاحب کی محمد اقبال کے بارے میں آخری تحریر ہے۔ جس میں اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے نہایت فراخ دلی سے اپنی صفائی پیش کی ہے۔ تمام مریدوں کو تاکید کرتے ہیں کہ کلام اقبال کی روح کو سمجھیں۔ اس پر توجہ رکھیں۔ پھر ۱۹۵۱ء میں وہی کے ایک جلسے کا ذکر کیا ہے جو یوم اقبال کی تقریب پر پاکستانی ہائی کمشنر کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور جس میں اسلامی ممالک کے سفیر بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہایت طویل تھی جس میں انھوں نے ایک پر لطف بات یہ کہ کشمیری برہمنوں کا سلسلہ نسب عہد فرعون میں مصر کے سب سے بڑے مندر کے پیغمباری سے جا ملتا ہے۔<sup>۸۶</sup> خواجہ صاحب نے محمد اقبال کی خدمات کو سراہا، اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا۔ پھر محمد

اقبال کے خیالات اور تصورات کی تشریح کرتے ہوئے کہ پاکستان کیا ہے۔ محمد اقبال کے نزدیک اس کی غرض و غایت کیا تھی، کہا میری موت کا وقت قریب ہے، ممکن ہے میرے بعد میرے مریدوں میں یہ غلط فہمی باقی رہے کہ مجھ میں اور محمد اقبال میں بعض مسائل تصوف کے سبب اختلاف تھا، اس لیے میں لاہور کے جلسہ عام میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ میں اور اقبال میں کسی قسم کا کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا اور میں آج تک اقبال کے ان خیالات کا حامی ہوں جو انہوں نے بعض اہل تصوف کے خیالات ترک دنیا کے خلاف ظاہر کیے تھے۔<sup>۱۸۳</sup>

۱۹۳۵ء میں صاحبِ خم خانہ جاوید لالہ سری رام کے دولت خانے پر غالب سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس کے اگلے برس ۱۹۳۶ء میں سوسائٹی کے بڑے وسیع پیمانے پر یوم غالب منایا۔ خواجہ حسن نظامی نے محمد اقبال کو شرکت کی دعوت دی۔ یہ زمانہ ان کی علاالت کا تھا، انہوں نے لکھا: دوسال سے علیل ہوں:

خُن اے ہم نشین از من چه پُرسی  
کہ من با خوش دارم گفتگوئے  
پیغام کے لیے مرا قبہ کیا تو مرزہ ہرگوپال تفتہ کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لیے یہ دو شعر  
نازل کر کے غائب ہو گئی:

دریں محفل کہ افسون فرنگ از خود ربود او را  
نگاہے پرده سوز آور دل دانائے راز آور<sup>۱۸۴</sup>  
مئے این ساقیان لالہ رو ذوق نمی بخشد  
زفیقِ حضرت غالب ہمال پیانہ باز آور  
خواجہ عبدالصمد گروئیں بارہ مولا کشمیر، نسلًا گھکڑ، کشمیری زبان میں گھکڑ کا لفظ گروے  
بدل گیا۔ خواجہ صاحب کے بزرگ سلطان زین العابدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ اس  
خاندان کے سربراہ حضرت خال گھکڑ نے حصول تخت و تاج میں سلطان کی بڑی مدد کی تو سلطان  
پنجاب اور حضرت خان کشمیر میں ایک دوسرے کی اعانت پر کمر بستہ رہتے۔ گھکڑ خاندان کے  
ایک کشمیری بزرگ احمد خان ترک دنیا کی نیت سے پنجاب آئے۔ اتفاقاً سید شاہ روشن سے  
ملاقات ہوئی۔ انہیں کے ارشاد سے کشمیر واپس چلے گئے۔ بارہ مولا میں اقتامت اختیار کی۔  
کاروبار کرنے لگے۔ شادی کر لی۔ یوں خواجہ عبدالصمد کے آباء و اجداد بارہ مولا میں بس گئے۔

یہ بڑا صاحب ثروت خاندان تھا، علم و فضل کی دولت سے مالا مال، اہل علم کا قدر داں، نیکی اور شرافت کا نمونہ، دل میں اسلام کا درد، حب قوی کا جذب، خلوص اور ایثار۔ خواجہ صاحب کو یہ صفات ورثے میں ملیں۔ ان کی وضع داری اور مہمان نوازی میں بھی فرق نہ آیا۔ دہلی دروازے کے باہر شاہ محمد غوث کا مرزا خواجہ صاحب کے والد ماجد خواجہ عزیز گرو کا تعمیر کردہ ہے۔ وہیں دفن ہیں۔ مزار کے دروازے میں ان کے نام کی تختی لگی ہے۔ خواجہ عبدالصمد کی اسلام اور امت اسلامیہ کے لیے ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ مولانا سید انور شاہ ایسے فاضل اور بزرگ انسان جن کو حدیث میں درجہ کمال حاصل تھا، انھیں کی توجہ سے آسمان علم پر آفتاب بن کر چکے۔ مولانا نے ایک عرصہ تک دیوبند میں درس حدیث دیا۔ پھر ڈا بھیل چلے گئے۔ محمد اقبال کو ان سے دلی عقیدت تھی۔ لولا بُن کا طعن تھا۔ خواجہ صاحب لولا بُن گئے۔ یہ دلکھ کر کہ انھیں علم کی طلب ہے مگر ذرائع نہیں، مبداء فیاض سے خاص دل و دماغ لے کر آئے ہیں، ان کے لیے ہر طرح سے تعلیمی سہوتیں پیدا کرتے رہے؛ ان کی ضروریات کا خیال رکھا۔ کشمیر ہو یا کشمیر سے باہر مولانا نے اسلامی ہند کی درس گاہوں میں جس کسی کا بھی رُخ کیا خواجہ صاحب کی اعانت شامل رہی۔ اندازہ کچھی خواجہ صاحب کیسے پر جوش مسلمانان تھے، کیسے جو ہر شناس، کیسے مخیر اور باہم انسان۔ بارہ مولانا کی جامع مسجد مدت سے ویران پڑی تھی، اسے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ کشمیری مسلمانوں کی اصلاح و احوال کے لیے کشمیر ہی نہیں کشمیر سے باہر بھی طرح طرح سے کوشش رہے۔ مسلم لیگ کے اولین صدر خواجہ سلیم اللہ اور سر سید احمد خان سے خاص تعلقات تھے۔ محمد ان ایجوکیشن کا نفرنس میں ہر سال شرکت کرتے۔ ۱۹۰۸ء میں ملکتہ میں قائد اعظم محمد علی جناح سے جا ملے۔ کشمیر یوں کی حمایت میں جو بھی تحریک اٹھتی اول بارہ مولانا کا رُخ کرتی۔ خواجہ صاحب اسے خوش آمدید کرتے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے ملنے لے لی۔ وہ کشمیر یوں کی پشت پناہ تھے۔ انجمن اسلامیہ یہوں کا بالخصوص خیال رکھتے۔ اس کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے۔ خواجہ صاحب کے احباب کشمیر اور کشمیر سے باہر شامی ہندوستان میں حتیٰ کہ برماتک پھیلے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب ہر سال بارہ مولा سے کبھی روپا پنڈی کے راستے سے اور کبھی سیالکوٹ ہوتے لاہور پہنچتے۔ دہلی جاتے۔ ملکتہ کا رُخ کرتے۔ جہاں کہیں کوئی اسلامی انجمن قائم تھی اس میں شریک ہوتے۔ طبیعت میں فیضی تھی، حتیٰ اوسع مالی امداد سے دریغ نہ کیا۔ شعر کرتے، ذوق سخن بھی تھا، ادب اور علم سے دلی لگاؤ بھی۔ فارسی میں مقبل اور اردو میں صمد تخلص کرتے۔ بڑے خوش خط، شکستہ

خط بھی خوب تھا۔ کلام مخزن میں شائع ہوتا۔ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ میں میں نے بارہاں کی نظمیں سنیں، اردو اور فارسی بھی۔ آواز کرخت تھی لیکن پرزوں۔ عمامہ اور جبہ پہننے، تقریر کے لیے اٹھتے تو مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ ہاتھ میں اکثر تسبیح ہوتی۔ لوگ منتظر رہتے تو خواجہ صاحب کب تقریر کریں گے۔ جب بھی تقریر ختم کی اسے ختم کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ مالی امداد کا اعلان بھی کر دیتے۔ تقریر اشعار سے خالی نہ ہوتی۔ انجمن نصرت اسلام سری گر میں تقریر کرنے اٹھتے تو کہنے لگے:

افتتاح	الکلام	بسم	الله
الذی	لیس	فی	الوجود
قل			سوہ
الذی	لَمْ	لِيْدَ وَ	اَحَدٌ
	لَمْ		يُولَدَ
			بَعْدِ حَمْدِ خَدَا سَتْ نَعْتَ رَسُولُ
			كَهْ اَزْوَيْمَ مَقْبِلُ وَ مَقْبُولُ

اندازہ کیجیے کہ انھیں عربی و فارسی میں کیسی دستگاہ حاصل تھی۔ تخلص کیا خوب نباہا ہے۔  
شاید اسی تقریر کا خاتمہ انھوں نے اپنے اس شعر پر کیا اور کیا خوب کہا:  
مصطفیٰ ماه و صحابہ انجمن  
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

ان کا اردو میں ایک شعر ہے:

پھر بہار آئی چجن میں زخم گل آلے ہوئے  
پھر مرے داغ جگر آتش کے پر کالے ہوئے

خواجہ صاحب مسلمانوں کو سر بلند کیخانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی محبت انھیں بارہ مولا میں اطمینان سے بیٹھنے نہ دیتی۔ ایک طرح سے ہندوستان گرد تھے۔ قومی اور علمی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اس میں کشمیری اور غیر کشمیری کا سوال ہی نہیں تھا۔ شاید ہی کوئی اسلامی انجمن ہو جس کی انھوں نے مدد نہیں کی۔ انجمن حمایت اسلام، انجمن کشمیری مسلمانان، محمدان ایجو کیشنل کانفرنس، کتنی انجمنیں تھیں جن میں انھوں نے دلی سرگرمی سے حصہ لیا۔ سیالکوٹ سے گزر ہوتا تو میر حسن سے ملاقات رہتی۔ میر حسن سے گھرے روابط تھے۔ یہ کچھ میر حسن سے ملاقاتوں میں محمد

اقبال کا ذکر آتا ہوگا۔ کچھ انہیں حمایت اسلام اور انہیں کشمیری مسلمانان کے جلے تھے جن میں انھوں نے محمد اقبال کو دیکھا اور دیکھتے ہی ان کے دل و دماغ کی خوبیوں کے معترف ہو گئے۔ بارود خانہ کے میاں خاندان سے بھی خواجہ صاحب کے گھرے مراسم تھے۔ یہ ایک دوسرا ذریعہ تھا محمد اقبال سے تعارف کا۔ باہمیں تینیں برس کے گھرے تعلقات، خوب خوب ملاقاتیں رہتیں۔ خواجہ صاحب محمد اقبال پر طرح طرح سے عنایات کرتے۔ کبھی تمنہ عطا کیا، کبھی دو شالہ پہنایا۔ جب تک زندہ رہے بزرگانہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ محمد اقبال بھی انھیں اپنا بزرگ تصور کرتے۔ تعلقات میں اگر ایک طرف محبت اور قدر افروائی تھی تو دوسری طرف ادب و احترام۔ خواجہ صاحب کے جواں سال اور جواں مرگ صاحبزادے غلام حسن اٹھنس کا امتحان دینے لا ہو ر آئے۔ محمد اقبال ہی کے بہاں ٹھہرے۔ امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان دے کر واپس گئے تو بخارنے آ لیا۔ نتیجہ نکلا کامیاب ہو گئے۔ محمد اقبال نے مبارک باد کا تاریخیجا۔ غلام حسن کی لخت جگر، جوان رعناء، ہونہار، ذہین، قابل۔ غلام حسن سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ احباب پریشان، اعززا اور اقربا دل گرفتہ کہ خواجہ صاحب غلام حسن کی موت کا صدمہ کیسے برداشت کریں گے۔ خواجہ صاحب کا دل ٹوٹ گیا۔ محمد اقبال کو خبر ملی تو دلی صدمہ ہوا۔ تعزیت کا خط لکھا، تارکے بارے میں مغزرت کی۔ مرثیہ کہا۔ ۱۶ اشعار ہیں۔ مخزن میں ایک تعزیتی شذرے کے ساتھ شائع ہوا۔

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا  
وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا  
غضب ہے غلام حسن کا فراق  
کہ جینا صمد کو گراں ہو گیا  
دیا چن کے وہ غم فلک نے اسے  
کہ مقبل سرپا نفاس ہو گیا

شیخ عبدالقدیر لکھتے ہیں: ہمارے ایک عنایت فرمائیں بارہ مولا خواجہ عبدالصمد گرو ہیں۔ انھیں چند روز ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹی کی مرگ ناگہانی کا داعی اٹھانا پڑا۔ خواجہ صاحب خود عالم اور علم دوست رئیس ہیں جو فارسی زبان کے طباع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ مگر

اس رخ نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انھیں تصویرِ غم بنا رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں خواجہ صاحب رضاۓ الہی پر صابر و شاکر ہے۔ یہ ان کی قوت ایمانی تھی جس نے اس غم میں ان کا ساتھ دیا۔ شیخ صاحب نے ٹھیک کہا ہے۔ جواناں مرگ بیٹھے کے رخ نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا۔ صرف قوم کی خدمت اور اصلاح کی لگن باقی رہ گئی۔ غلام حسن ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئے۔ خواجہ صاحب ۱۹۲۱ء میں محمد اقبال بارہ مولائے۔ ان کے چہلم میں شرک ہوئے۔ چار روز قیام رہا۔

پیرزادہ محمد حسین عارف پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے اویں ایم اے، بڑے اعلیٰ پائے کے مترجم، قانون داں، ریاضی داں، فلسفی اور شاعر، مہم ضلع رہنک کے ایک معزز قریشی خاندان کے فرد۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں ڈاکٹر لائزرن کے ایما سے یونیورسٹی اور یونیٹل کالج میں اسٹینٹ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کا عہدہ ملا۔ ریاضی اور فلسفہ پڑھاتے۔ قانون سے دلچسپی تھی۔ ہائیکورٹ میں مترجم کی خدمات سر انجام دیں۔ ۱۸۸۵ء میں ایک سڑا اسٹینٹ کمشنر ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۶ء تک ڈسٹرکٹ اور سیشن نجج رہے۔ یہی زمانہ تھا جس میں محمد اقبال ان سے متعارف ہوئے۔ عارف کا علم و فضل، عارف کی شاعری اور فلسفہ سے دلچسپی محمد اقبال کو ان کی خدمت میں لے گئی۔ پیرزادہ صاحب کا کلام مخزن میں شائع ہو رہا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے اور لاہور کے مشاعرے بھی ذریعہ تعارف بننے۔ پیرزادہ صاحب کو بھی شاہزادہ میرزا عبدالغنی ارشد سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ فیروز پور میں بحیثیت سیشن نجج تعینات رہے۔ فیروز پور میں بھی محمد اقبال کا ذکر آتا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے محمد اقبال کی ان سے راہ و رسم اور یونیٹل کالج کے زمانہ مغلی ہی میں قائم ہو گئی۔ ۱۹۰۱ء میں جب پیرزادہ صاحب نے مثنوی معنوی کی حکاتوں کا مثنوی ہی کی بحر میں عقد گوہر کے نام سے ترجمہ کیا تو محمد اقبال نے اس کی ایک نہیں چھ تاریخیں کہیں۔ یہ مولانا روم سے پیرزادہ صاحب اور محمد اقبال کی عقیدت تھی جس نے انھیں ایک دوسرے کی طرف کھینچا۔ ۱۹۰۶ء میں دربار کشمیر نے پیرزادہ صاحب کی خدمات مستعار لے لیں تو پیرزادہ صاحب کشمیر چلے گئے۔ کشمیر ہائی کورٹ کی بنا رکھی، گونو ہی اس کے واحد نجج تھے۔ گویا یہ پیرزادہ صاحب کا قیام لاہور کا زمانہ تھا جس میں محمد اقبال ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد احیاناً ہی ملاقات کی نوبت آتی ہو گئی۔ پیرزادہ صاحب کشمیر کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو دہلی چلے گئے۔ طبیعت کالج میں

سکریٹری کے فرائض سرانجام دیتے۔ ولی ہی میں انتقال ہوا۔ طبیہ کالج کے احاطے میں دن ہیں۔ حکومت نے بھی پیرزادہ صاحب کی بڑی عزت افزائی کی۔ ۱۹۱۰ء میں خان بہادر کا خطاب اور ۱۹۱۱ء کے دربار میں کری عطا ہوئی۔ حکیم اجمل خاں سے ان کے گھرے مراسم تھے۔ طبیہ کالج کے انتظامی امور انھوں نے بڑی قابلیت سے سرانجام دیئے۔ ۱۹۲۸ء میں فوت ہوئے۔ ۳۰، مارچ۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مثنوی اسرار خودی کے بارے میں پیرزادہ صاحب کے تاثرات کیا تھے۔ ان کے ایک عزیز جناب فضلی نے اسرار خودی کے جواب بلکہ نہ مت میں ایک مثنوی لکھی۔ پیرزادہ صاحب نے اسے پسند کیا یا نہیں۔ البتہ محمد اقبال نے حسن نظامی کو لکھا کہ فضلی صاحب نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ پیرزادہ صاحب کی اپنی رائے اس معاملے میں کیا تھی، محمد اقبال سے کوئی خط و کتابت ہوئی یا نہیں؟ کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

داغ سے محمد اقبال کو تلمذ تھا، دلی عقیدت جس کا انھوں نے اپنے اشعار میں بار بار اظہار کیا۔ داغ ۱۹۰۵ء میں فوت ہوئے۔ محمد اقبال کی انگلستان روائی سے پہلے محمد اقبال نے داغ کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں داغ کی شوخی اور رندی کی تہہ میں جس گہری روحانیت کی جملک نظر آتی ہے۔ اس کی طرف کس خوبی سے اشارہ کیا ہے:

تحقیقی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

یوں داغ کی حقیقی شخصیت تمام و کمال ہمارے سامنے آجائی ہے، داغ، جیسا کہ صاحب خم خانہ جاوید کی روایت ہے، لاہور آئے مگر کس سن میں، ٹھیک معلوم نہیں ہو سکا۔ بیان کیا جاتا ہے ان کا قیام کسی ہندو رئیس کے یہاں رہا۔ لاہور کے قریب ہی ان کے علاقے میں کہیں مہماں ٹھہرے۔ شاگردوں نے ان کی خدمت میں حاضری دی ہوگی۔ تاریخے تو ان کے خاص تعلقات تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ داغ کے اس سفر کا حال ہمیں صاحب خم خانہ جاوید سے معلوم ہوا۔ داغ جہاں استاد تھے، لاہور میں ان کی شاعری کا غلغله تھا، شاگرد بھی بکثرت، لیکن ان کے درود لاہور کا ذکر کہیں نہیں ملتا، یا کم از کم راقم الحروف کو نہیں مل سکا۔ بہر حال ۱۸۹۵ء سے پہلے آئے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محمد اقبال کو ان سے شرف ملاقات حاصل ہوتا۔ بقول عبدالقدوس طرف یاد باقی رہ گئی۔ لیکن جہاں محمد اقبال داغ کے عقیدت مند تھے، داغ بھی

سوچتے ہوں گے کہ وہ جو کہا جاتا ہے ان من الشعر لحکمة ان کا شاگرد شاعری کی کیسی کیسی بلندیاں طے کر رہا ہے۔

DAG سے ہمارا ذہن قدرتاً امیر بینائی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں، اور یہ رقم الحروف کا ذاتی تجربہ بھی ہے، یعنی بیسویں صدی کے اوائل میں DAG اور امیر بینائی دونام ہر شخص کی زبان پر تھے۔ محمد اقبال کو امیر بینائی سے دلی عقیدت تھی۔ وہ ان سے ملے تو نہیں، شرف تلمذ بھی نہیں تھا، خط و کتابت کا موقع بھی نہیں آیا، باس ہمہ محمد اقبال کو امیر سے بڑی عقیدت تھی۔ محمد اقبال بار بار ان کا ذکر کرتے، کہتے میرا جی چاہتا ہے امیر بینائی پر انگریزی میں ایک مضمون لکھوں، ولایت کے کسی پرچے میں چھپوا کر مشرق کے اس شاعر کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف مغرب والوں سے کراؤں۔ ان کے تلامذہ کو خوط لکھتے۔ معلومات طلب کرتے۔ ۱۹۰۳ء میں فوق کے اخبار پنجہ فولاد میں لکھا ”ماہ رواں“ کے کسی اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ فنِ خن کے استاد اور ملک نظم کے باڈشاہ حضرت امیر بینائی کی لاکف ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ رقم الحروف نے ان کے اکثر تلامذہ کو متوجہ کیا ہے کہ ایسا شاعر بے نظیر اور اس کی لاکف اب تک نہ لکھی جائے۔<sup>۱۸۲</sup> پھر ان کے کلام پر اس طرح تبصرہ کیا: ”وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑا ہوا تھا۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد ہے اور ایک خاص قسم کی لے پائی جاتی ہے جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے۔“ پھر بافسوس کہتے ہیں: اگر ایسا شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانح عمر یاں نکل جاتیں۔ پھر کہتے ہیں: ”میرا مقصد حضرت امیر کی شاعری اور شاعرانہ لاکف پر بحث کرنے کا ہے۔ میں نے چند باتیں ان کے تلامذہ اور واقف کاروں سے پوچھی ہیں۔“ پھر ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”یہ مضمون انگریزی میں لکھا جائے گا اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوایا جائے گا۔“

کیا امیر بینائی لاہور آئے؟<sup>۱۸۳</sup> خیال ہے نہیں۔ آئے میں تو ۱۹۰۰ء سے بہت پہلے جس کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ روایت بھی تحقیق طلب ہے۔ امیر کا لاہور آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ہمیں اس کا کہیں ذکر نہ ملے۔ یہ صرف حکیم احمد شجاع کا بیان ہے۔<sup>۱۸۴</sup> معلوم نہیں ان کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے امیر بینائی سے محمد اقبال کی ارادت میں وہ ذرہ درد دل کا فرماتھا جو مبداء

خاص سے دونوں کو عطا ہوا۔ امیر مینائی مخدوم حضرت شاہ بینا کے خاندان سے تھے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے قرآن مجید، کتب درسیہ متداولہ، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم میں متعدد اساتذہ سے رجوع کیا۔ طب اور جنر میں بھی دستگاہ پیدا کی۔ خاندان چشتیہ صابریہ میں حضرت امیر شاہ سے بیعت ہوئے خرقہ خلافت بھی ملا۔ اسیر کے شاگرد تھے۔ غالب، آتش، ناخ، انیس اور دبیر کی آنکھیں دیکھے چکے ہے۔ زند، صبا، نیم، بحر، رشک اور دزیر سے صحبت رہتی۔ ہر صفحہ سخن میں شعر کہا۔ شاہان اودھ کا زمانہ تھا، ۲۵ برس واحد علی شاہ اختر سے وابستہ رہے۔ لکھنؤ اجڑ گیا تو نواب کلب علی خاں کی دعوت پر رام پور چلے گئے۔ داغ بھی رام پور میں موجود تھے۔ دونوں اساتذہ سخن میں دوستی اور محبت کے نہایت گھرے مراسم قائم ہو گئے۔ ایک دوسرے کی یاد سے بے قرار ہو جاتے۔ نواب صاحب کا انتقال ہوا تو امیر لکھنؤ چلے آئے۔ داغ نے دکن کا رخ کیا۔ ۱۸۹۱ء میں نظام دکن میں محبوب علی خاں لارڈ کرزن سے ملنے کلکتہ گئے تو امیر مینائی کو لکھا بنا رس آئیں اور ہم سب سے ملیں۔ شرف باریابی حاصل ہوا۔ امیر نے اپنی تصنیف امیر اللغات نذر میں پیش کی۔ دکن آنے کی دعوت دی گئی۔ نومبر ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد پہنچ۔ اٹیشن پر اکابر اور عمائد استقبال کے لیے موجود تھے۔ لیکن امیر مینائی دفعتاً بیمار ہو گئے اور ایک ہفتے کے اندر ۱۹۰۰ء کو انتقال کر گئے۔ محمد اقبال کو دلی صدمہ ہوا۔ داغ کا مرثیہ کہتے ہوئے انھیں نہیں

بھولے:

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر  
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر

تاریخ کہی: لسان صدق فی الاخرين۔ امیر مینائی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ بڑے عبادت گزار، نیکی اور پارسائی کا مجسم۔ عالم و فاضل، زبان داں، تصانیف متعدد ہیں۔ دو اور ان اشعار میں صنم خانہ عشق کو بالخصوص شہرت ہوئی۔ میر اسکول کا زمانہ تھا۔ سیالکوٹ میں ہر کہیں صنم خانہ عشق کا چرچا تھا۔ شعروخن کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میر حسن کی خدمت میں پہنچے، فرمایا: صنم خانہ عشق پڑھو اور سوچ سمجھ کر پڑھو۔ محمد اقبال کو امیر سے جو تعلق تھا اس میں شاید میر حسن کا بھی دخل تھا، صنم خانہ عشق شائع ہوا تو محمد اقبال نے کہا:

عجیب شے ہے صنم خانہ امیر اقبال  
میں بت پرست ہوں رکھ دی وہیں جبیں میں نے

لیکن محمد اقبال کے قدر انوں نے اس شعر کی تعبیر جس طرح کی اس سے سخن فہمی عالم اسفل  
کو کیا کہیے۔ معاذ اللہ۔

نادر کا کوروی سے بھی محمد اقبال کو دلی تعلق تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور، مگر ایک  
دوسرے کے قدر داں۔ ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ محمد اقبال نے کہا:  
پاس والوں کو تو اک دن دیکھنا ہی تھا مجھے  
نادر کا کوروی نے دور سے دیکھا مجھے

محمد اقبال نے نادر کو اپنا ہم نوا اور ہم صفیر پایا۔ محبت اور دوستی میں نیرنگ کے ساتھ جگہ دی:  
نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر  
ہے اسی توحید فی الشیعہ کا دعویٰ مجھے

نادر پورا نام نادر علی ہے۔ کاکوری کے ایک عبادی خاندان کے چشم و چراغ، ۱۸۶۷ء میں  
پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں ۳۳ سال فوت ہو گئے۔ افسوس ہے عمر نے وفا نہیں کی۔ خناق کا  
مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ دواؤں نے کام نہ کیا۔ جراحت کی نوبت آئی۔ خیال تھا عمل یہ  
کامیاب رہے گا۔ نادر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ سخت تکلیف میں بنتا تھا۔ نزع کی شب اُن  
کے چھوٹے بھائی شیخ شاکر علی نے معلوم نہیں کس خیال کے زیر اثر یہ مصرع پڑھا:

قفس میں مرغ بکل یوں تڑپنے کا مزا کیا ہے  
تو نادر نے فی المبدیہ دوسراء مصرع کہہ کر شعر کی تکمیل کر دی:  
نکل جانِ حزیں اس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے  
اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اُردو ادب کی محفل سوگوار ہو گئی۔ نادر سے اُردو ادب کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔  
اُنگریزی شعر امثالًا کو پر اور کیش کی نظموں کو انھوں نے جس خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا  
ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ترجمے میں اصل کارنگ پیدا کر دیا۔ محمد اقبال کو نادر  
کی موت سے دلی صدمہ ہوا۔ ایک ہم نوا اور ہم صفیر جدا ہو گیا۔ کاش نادر کی معروف فکر تی! اُن  
نادر کو اقبال سے دلی تعلق تھا۔ خط و کتابت کی نوبت تو شاید کبھی نہیں آئی۔ مسخرن کے  
توسط سے گویا باہم گفتگو ہو جاتی۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں محمد اقبال کی نظم 'شمع'، مسخرن میں شائع ہوئی تو  
نادر نے اس سے اتنا اثر قبول کیا کہ جنوری ۱۹۰۳ء میں 'شمع مزار' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ محمد

اقبال نے کہا تھا:

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع دردمند  
نادر نے شمع مزار سے خطاب کرتے ہوئے کہا:  
بیٹھی ہے کس سکوت میں شمع مزار تو  
میں بھی ایسا ہی دردمند ہوں:

اس تیرہ روز گار و پرآشوب دور میں  
دو تیرے درد مند ہیں اقبال اور میں

محمد اقبال نے لکھا تھا:

ہو شمع بزمِ عشق کہ شمع مزار تو  
ہر حال اشک غم سے رہی ہم کنار تو  
یوں نادر کو شمع مزار کا عنوان سوجہا، نظم کہہ ڈالی۔

سیالکوٹ کے نیاز مندوں سے بھی محمد اقبال کے روابط میں کوئی فرق نہ آیا۔ آغا محمد باقر سے تاجین حیات تعلقات قائم رہے۔ سیالکوٹ جاتے، ملاقاں میں ہوتیں۔ مولوی ابراہیم سے بھی دوستی قائم رہی۔ غلام قادر فضح مرحوم سیالکوٹ کے ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ شاعری تو بہت کم کی، یا شاید کی ہی نہیں البتہ نظر میں ان کے قلم نے بڑی جوانیاں دکھائی ہیں۔ تاریخ اسلام سے انھیں بالخصوص شعف تھا۔ فضح صحافی بھی تھے، طابع اور ناشر بھی۔ پنجاب پر لیں کے نام سے ایک مطبع قائم کر رکھا تھا۔ تاریخ اسلام کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالتے جس میں غزوہات نبی ﷺ اور فتوحات عہد صدقی و فاروقی کا حال بڑی تفصیل سے بڑے سلیمان اور دلنشیں انداز میں بیان کرتے۔ ان کی تحریروں سے نوجوانان اسلام میں جا بجا مجاہدین اسلام کے عزم و ہمت ان کے تاریخی کارناموں، اسلام کے لیے سرفروشی کے جذبات کی یادتا زہ ہو جاتی۔ محمد اقبال کے نزدیک یہ بھی مسلمانوں میں شعور علمی کے احیاء کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ کہتے ہیں: یہ رسالہ ہر مسلمان کے گھر پہنچنا چاہیے۔ ایسی ہی تحریروں سے قوم میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ میں اسے پڑھتا ہوں تو اکثر چشم پر آب ہو جاتا ہوں۔ فضح مرحوم ۱۹۱۲ء میں فوت ہوئے۔ ان کے صاحزادے ظفر اقبال کو تصنیف و تالیف کا مشغله درٹے میں ملا۔ میر حسن کے حلقة درس میں بیٹھے۔ ان کی شاگردی کی۔ عربی زبان میں بڑی مہارت پیدا کی۔ لا ہو رائے۔ ایم۔ اے

کیا ٹریننگ کالج میں ملازمت مل گئی۔ عربی زبان میں درسیات کی تصنیف کے علاوہ انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے لیے قرآن مجید کا نسخہ بڑی محنت سے مرتب کیا اور پھر پیچرے کے زیر اہتمام ایک دوسرا نسخہ اس انداز سے کہ قاری کو اس کی تلاوت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مولوی صاحب کی یہ خدمت لاائق صد تحسین ہیں جن کے لیے قوم ان کی شکر گزار ہے گی۔ سیالکوٹ کے ایک مولوی نواب دین صاحب نے چوک دال گرائیں میں مقبول عام کے نام سے ایک مطبع قائم کر رکھا تھا۔ ظفر اقبال اکثر وہاں جاتے۔ ایک روز کیا دیکھتے کہ حکیم الامت کا مجموعہ کلام چھپ رہا ہے۔ پروف رکھے تھے۔ ان پر نظر ڈالی تو دیکھا، ان میں غلطیاں ہی غلطیاں ہیں۔ محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پروفون کا ذکر کیا تو انھوں نے ہدایت کر دی کہ آئندہ ان کی جو بھی کتاب شائع ہو اس کے پروف مولوی ظفر اقبال دیکھیں۔

مولوی ابراہیم سیالکوٹی۔ میر حسن کے شاگرد۔ ان کے حلقة درس اور پھر کالج میں محمد اقبال کے ساتھ حصول تعلیم میں شریک۔ اوائل عمر کی دوستی، بے تکلفی، دل گئی۔ مولوی صاحب سے ہمیشہ ملاقات رہتی۔ مولوی صاحب لاہور آتے۔ محمد اقبال سیالکوٹ جاتے تو ان سے ضرور ملتے۔ مولوی صاحب بھی علمی محفلوں اور تقریروں میں اکثر محمد اقبال کا ذکر کرتے ان کی آخری علاالت میں خاص طور سے عیادت کے لیے آئے۔ دیریکٹ نشست رہی۔ گھر بار کا حال، بال بچوں کا پوچھنا، تسلی دی۔

مولوی صاحب کے خاندان میں مولوی احمد دین پال کے صاحبزادے محمد مسح پال جنھوں نے امین اور حزیں تخلص اختیار کیے اور بالآخر امین حزیں کے نام سے دنیائے سخن میں شہرت حاصل کی، ایک طرح سے محمد اقبال کے معنوی شاگرد تھے، بڑے پر گو، دل حب اسلامی سے معمور۔ محمد اقبال کے شیدائی، زمانہ ملازمت زیادہ تر گلگت میں گزرنا۔ ملازمت سے سکدوش ہو کر سیالکوٹ آئے۔ ۱۹۶۸ء میں فوت ہوئے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ محمد اقبال کو سیالکوٹ کے مشاعروں میں شریک ہوتے دیکھا۔ ان کا کلام سنا۔ میر حسن کی موجودگی میں محمد اقبال کی سکول میں نظم پڑھنے کی روایت ہمیں امین حزیں ہی سے ملی۔ امین حزیں میر حسن کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان سے اکتساب فیض کرتے۔ شعروشاعری کے سوا کوئی دوسرا شغل ہی نہیں تھا اور شعروشاعری کا بھی سب سے بڑا مقصد یہی کہ محمد اقبال کے پیغام کی ترجمانی کریں۔ ۱۹۰۲ء میں ان کی ایک غزل پیام یار لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ تعریف کی گئی تو انھیں خیال آیا کیوں

نہ محمد اقبال کی شاگردی اختیار کریں۔ محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مدعاۓ ولی عرض کیا۔ انہوں نے کہا شاعری خداداد چیز ہے۔ شعر گوئی کا جذبہ پچا ہے تو مشنخن کیے جائیے۔ اساتذہ کا کلام بغور پڑھیے۔ کان بگروں سے منوس ہو جائیں۔ زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔<sup>۱۸۹</sup> امین حزین کو شرف تلمذ توصیل نہیں ہوا لیکن یہ بھی تلمذ ہی کی ایک صورت تھی۔ عمر بھر ان کے کہنے پر عمل پیرا رہے۔ محمد اقبال سے بہت کم ملے۔ لیکن ان کے کلام، ارشادات و خطبات سے فیض حاصل کرتے رہے۔ جب بھی ملتے محمد اقبال کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو نہ ہوتا۔

### ۱۱۔ انجمن حمایت اسلام

انجمن حمایت اسلام سے محمد اقبال کے ۳۷ سالہ تعلق کی داستان طویل بھی ہے اور اہم بھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا، مسلمان حکومی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔ تو زوال بغداد اور سقوط غزنیاط کے بعد یہ سب سے بڑا المناک حادثہ تھا۔ جو اسلامی دنیا کو پیش آیا۔ مسلمانان ہند عجیب کسپرسی کے عالم میں تھے۔ وہ اس سرزی میں پر صدیوں سے حکومت کر رہے تھے۔ دفعتاً محروم ہو گئے وسط ایشیا کے مسلمانوں کی طرح وہ بھی غلامی اور حکومی کی تیخی سے نا آشنا تھے۔ غلامی اور حکومی میں یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس حالت میں جب ان کی بے لمبی انتہا کو پہنچ گئی۔ جب حکومت ان کی آزادی اور اقتدار کی طرح ان کی تہذیب اور تمدن کے ہر فرش کے ساتھ ساتھ ان کی زبان، ان کی ثقافت حتیٰ کہ مذہب تک کومنٹنے کے درپے ہے۔ جب کہ خدا شہرے ان کا وجود ملی بھی ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے وہ کیا راستہ اختیار کریں۔ غلامی پر راضی ہو جائیں۔ اسلام میں وطیت اور مغرب پرست کا پیوند لگائیں یا اپنے طرز زندگی پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ لیکن وہ کوئی بھی فیصلہ کرتے اسے عمل میں لانا آسان نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں سنچلنے میں دیر نہیں لگی۔ انہوں نے اس صورت حالات کا بغور جائزہ لیا تو بقاۓ ذات اور حصول آزادی کے مختلف راستے نظر آئے۔ ایک وہ جس کی نشان دہی سر سید نے کی۔ ایک دوسرا حکومت وقت سے کاملاً بے تعاقی، اور ایک مغرب کی تقلید میں وطیت پسندی کی راہ سے سیاسی آئینی جدو جہد کا جس کے پہلو بہ پہلو حکومت سے وفاداری، غلامی اور حکومی پر قناعت پسندی کی تلقین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ حتیٰ

کہ اس میں قرآن اور حدیث سے بھی سند لی گئی۔ بالآخر سواداً عظیم نے وہ راستہ اختیار کیا جو سر سید نے ان کے لیے تجویز کیا تھا اور جس کا مرحلہ اولیں تھا علوم جدیدہ یا محاورہ عام میں انگریزی تعلیم کا حصول۔ چنانچہ یہ مقصد تھا جس کے پیش نظر سر سید احمد خاں نے محمد ان انجوکیشنل کافرنس کے نام سے ایک انجمن قائم کی تاکہ مسلمان اس دنیا سے واقف ہوں جس کا ظہور یورپ میں ہوا، جو اغلاتاً اور ذہناً عالم انسانی پر چھار ہی تھی اور جس سے پوری پوری واقفیت کے بغیر نامکن تھا مسلمان بمقابلہ اس کے اپنے وجود ملی کا تحفظ کر سکیں۔ مگر پھر اس سلسلے میں خود سر کار انگریزی بھی کچھ اقدامات کر چکی تھی۔ سر کار انگریزی چاہتی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذہن بدلتے وہ اس کی غلامی پر راضی ہو جائیں۔ اس کا ایک راستہ تو یہی جدید تعلیم اور انگریزی زبان تھی کہ اس کی ترویج کا سلسلہ جیسے جیسے آگے بڑھا، دل و دماغ مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔ ماضی سے ان کا تعلق قائم نہیں رہے گا۔ انگریز ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قابض ہوئے۔ حالات سنبھلے تو اہل پنجاب کی خیرخواہی اور ترقی کے نام پر ۱۸۵۶ء ہی میں انجمن پنجاب لاہور قائم کی گئی جو ظاہر ہے ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم تھی اور جس میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ۱۸۶۹ء میں انجمن اسلامیہ پنجاب معرض وجود میں آئی۔ اسے پنجاب میں مسلمانوں کی سب سے پہلی قومی انجمن کہیے۔ مگر اس کا دائزہ کار بڑا محدود تھا۔ انجمن پنجاب نے تو علوم و فنون کی اشاعت، صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ پر زور دیا۔ انجمن اسلامیہ نے دینی تعلیم پر۔ لاہور کی قدیم مساجد کا انتظام و انصرام، مرمت اور دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد ہی۔ ۱۸۸۲ء میں البتہ انجمن حمایت اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ انجمن کیا تھی ایک طرح سے تحریک علی گڑھ کا ضمیمہ؛ اس لیے کہ اس کے مقاصد بھی اساسی طور پر وہی تھے جو محمد ان انجوکیشنل کافرنس کے۔ اس انجمن کا قیام بظاہر ایک اتفاقی امر تھا مگر دلچسپ اور سبق آموز۔ ہوا یہ کہ انہی دنوں میں ایک پادری وہلی دروازے کے باہر بڑی دل آزار تقریر کر رہا تھا۔ مجھے میں ایک غیور مسلمان چڑاع دین بھی، جو کسی سر کاری دفتر میں ملازم تھا۔ چڑاع دین نے یہ تقریر سینی تو اس کی حیثیت دینی نے ایسا جوش مارا کہ ایک ایک کر کے رو سائے شہر سے ملا۔ قومی غیرت کے نام پر ایک انجمن کے قیام کی تحریک کی۔ بالآخر اس کی کوششیں رنگ لائیں۔ انجمن قائم ہو گئی۔ حمایت اسلام نام رکھا گیا۔ تعلیم اور تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی کتابوں کی تصنیف و اشاعت، تبلیغ اسلام اور اسلام کے خلاف سرگرمیوں کا سد باب اس کے مقاصد ٹھہرے۔ رفتہ رفتہ انجمن حمایت اسلام مسلمانان

پنجاب کی سب سے بڑی قوی اور تعلیمی انجمن بن گئی۔ علی گڑھ کے تسبیح میں مدرسے اور کالج قائم ہوئے۔ یتیم خانے اور فلاہی ادارے کھولے گئے۔ انجمن کی یہ سرگرمیاں اس قدر مقبول ہوئیں کہ اسلامیان ہند کے ممتاز تریں رہنماء، علماء و فضلاء، بزرگان دین، ادیب، شاعر، ارباب سیاست انجمن کے جلسوں میں شرکیں ہوتے۔ حتیٰ کہ والیان ریاست، امراء و رؤسائے نے بھی اس کی سرپرستی کی۔ محمد اقبال لاہور آئے تو ان کی حب قوی انصیح انجمن کے جلسوں میں لے گئی۔ پھر جب انہوں نے انجمن کے ایک جلسے میں اپنا کلام سنایا تو سامعین پھرک اٹھے۔ اس وقت انجمن کو کیا معلوم تھا محمد اقبال اس کے جلسوں کی رونق بڑھائیں گے۔ لوگ جو حق درجوق ان کا کلام سننے آئیں گے۔ محمد اقبال کا وجود انجمن کے لیے مالی منفعت کا ذریعہ بنے گا۔ اس کی تعلیمی اور دینی سرگرمیوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو گا۔ محمد اقبال بھی نہیں جانتے تھے کہ انجمن ہی کی وساطت سے ان کا پیغام رفتہ رفتہ ملک کے طول و عرض میں پہنچ گا۔ وہ ان کے لیے ذریعہ ابلاغ ثابت ہو گئی۔ انجمن بھی اس بات پر جس قدر ناز کرے کم ہے کہ یہ اسی کا پلیٹ فارم تھا جس سے محمد اقبال نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کی ترجیمانی میں مسلمانان عالم سے خطاب کیا۔ محمد اقبال ہی کی شعلہ نوائی سے اسلامیان ہند کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی۔ ان کا شعور ملی جاگ اٹھا۔ ان عزائم اور مقاصد کی پروش ہونے لگی جن سے آگے چل کر انصیح اپنے مستقبل کی تغیریں وہ راستہ ملا جس کی نشان دہی اسلام صدیوں پہلے کرچکا تھا۔ انجمن کے لیے یہ بات کس قدر قابل فخر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خونیں کے بعد مسلمانان ہند کی ملی جدو جہد کا گزر جن مرحل سے ہوتا رہا اس میں محمد اقبال ہی نے ایک فیصلہ کرن کردار ادا کیا۔ مؤرخ اس موضوع پر قلم اٹھائے گا تو انجمن کا اس جدو جہد میں بالواسطہ یا بلاواسطہ جو حصہ ہے اس کا ذکر کیے بغیر نہ رہے گا۔ انجمن بھی نہیں بھولے گی کہ اسے یہ شرف حاصل ہوا تو محمد اقبال کی بدولت۔

۱۸۹۹ء میں نہیں تو ۱۹۰۰ء میں یقیناً محمد اقبال نے انجمن کے سالانہ جلسہ میں جوشیر انوالہ

دروازے کے مدرسے میں منعقد ہوا۔ نالہ یتیم کے نام سے وہ نظم پڑھی جسے گویا ان کی ملی شاعری کی تمہید کہنا چاہیے۔<sup>۲۹</sup> تجھ بہے اس نظم کو جو دردیتی کی حضرت بھری داستان اور المناک مرتع ہے۔ جسے سن کر مولوی نذیر احمد کہا ٹھے کہ ان کا نوں سے انیں اور دیر کے مریثے سنے ہیں مگر اس پائے کی نظم کبھی سننے میں نہیں آئی، جو اثر اس نے میرے دل پر کیا ہے وہ اس سے پہلے بھی نہیں ہوا، بانگ درا میں کیوں شامل نہیں کیا گیا بالخصوص اس لیے کہ یہ نظم آج بھی دستیاب ہو

جاتی ہے، اس کا کوئی مطبوعہ نہ بھی کسی نجی یا عام کتب خانوں میں مل جاتا ہے۔ یوں بھی محمد اقبال کی شاعری کے ارتقا میں اس نظم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ محمد اقبال کا سوانح نگار بھی جب ان کی ملی زندگی اور شاعری پر قلم اٹھائے گا تو قدرتی بات ہے کہ اس کا ذہن بار بار اس نظم کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ وجہہ کچھ بھی ہوں، اس نظم نے محمد اقبال کی شہرت کو کراچی سے رکون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دیا۔ محمد اقبال نے تیموں کی بے کسی کا نقشہ جس دل سوزی سے کھینپا تھا اس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ سامعین نے ان کی امداد کے لیے جیبیں خالی کر دیں۔ یہ انجمن کا پندرہواں سالانہ اجلاس تھا جو ۲۳ فروری ۱۹۰۰ء کو منعقد ہوا اور جس میں اگلے روز، ۲۲، فروری کو انجمن کی تیسری نشست میں، جس کی صدارت مولانا نذیر احمد نے فرمائی، محمد اقبال نے نمازِ عصر کے بعد شیخ عبدالقدار کے یکچھ کے اختتام پر یہ نظم پڑھی لوگ اس حد تک متاثر تھے کہ اسے دوبارہ پڑھوایا گیا۔ نظم چھپی ہوئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے سارے نسخے فروخت ہو گئے۔ چندہ جمع ہونے لگا۔ محمد اقبال نے بھی اپنی جیب سے پانچ روپے چندے میں دیتے۔ یہ نظم دوسرے دن پھر سُنی گئی۔ خیال فرمائیے محمد اقبال کی حمیت میں اور انجمن کے لیے دل سوزی کا یہ عالم تھا کہ اس کو چھپوا کر ساتھ لائے۔ یوں خود اپنی جیب سے چندہ ادا کرنا، سامعین کا نظموں کو سن کر ان کے چھپے ہوئے نسخے خریدنا بجائے خود انجمن کی مالی امداد کا ایک نہایت موثر ذریعہ تھا جس کی مثال محمد اقبال نے پہلے ہی دن جب وہ انجمن کے سٹھ پر آئے قائم کر دی۔ یہ محمد اقبال ہی کی پرکشش شخصیت تھی جس کی بدولت انجمن کے وقار اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ محمد اقبال ہی کی ذات سے انجمن کی رونق بڑھی۔ لوگ انجمن کے جلوسوں میں شریک ہوتے تو اس لیے کہ محمد اقبال کی کوئی نظم سنیں گے، ان کے کلام سے لطف اندوز ہوں گے۔ محمد اقبال بھی دیکھتے ہی دیکھتے انجمن پر چھا گئے۔ ان کے علم و فضل کی تعریفیں ہونے لگیں۔ انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا۔<sup>۱۹۱</sup>

۱۹۰۱ء میں محمد اقبال نے 'یتیم' کا خطاب پہلے عید سے ۱۹۰۲ء میں 'اسلامیہ کانج' کا خطاب پنجاب سے اور ایک اور نظم دین و دنیا، علی ہذا زبان حال، کے عنوان سے ایک اور نظم پڑھی۔ یہ نظم میں بڑے شوق سے سنی گئیں لیکن دوسرا میر کہ آراظم جو، پھر تجھ بھے، بانگ درا میں شامل نہیں فریاد امت، ہے جسے محمد اقبال ابر گہر باز کے نام سے لکھا رہے تھے۔ یہ نظم ۱۹۰۳ء میں پڑھی گئی۔ صدارت خان بہادر غلام احمد خاں، مشیر مال، ریاست جموں و کشمیر نے کی۔ فریاد

امت فی الحقیقت حضور رسالت مآب ﷺ کے حضور امت کی درد بھری فریاد ہے۔ یہ فریاد اور اس پر محمد اقبال کی پرورداد اور بلند اور شیریں آواز، خواجہ عبدالصمد گرو بے تاب ہو کر اٹھے از راہ قدر دانی ایک نقیری تمنخ جو کشمیر سے بنوا کر ساتھ لائے تھے، عطا کیا۔ نالہ یتیم کی طرح فریاد امت کے مطبوعہ نئے بھی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے، چندے کی بھرمار ہونے لگی۔

محمد اقبال جب اس نظم کو لکھ رہے تھے تو ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو اپنے عزیز دوست مشی سراج الدین کو لکھا: عید کا دن ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقدار بھی اٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں۔ سید بیشیر حیدر بیٹھے ہیں اور ابر گہر بار کی اصل عملت کی آمد آمد ہے..... پھر لکھتے ہیں: ابر گہر بار، ۱۹۲ شروع کرنے سے پیشتر کہ کوئی وہابی اس کے بعض اشعار پر فتویٰ نہ دے دے، چند باتیں تہمید میں بھی کہی تھیں۔ ۱۹۳ بعد میں نام بدل دیا گیا۔ یہ نظم کئی پہلوؤں سے اہم ہے جس کی تفصیل کا سردست موقع نہیں۔ نالہ یتیم کی طرح اس نظم کو بھی بانگ درا میں جگہ نہیں ملی۔

تیسرا معز کہ آر انظم ”تصویری درد“ ہے جو ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ سر شفعت صدر تھے۔ میاں فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا نذیر احمد نے بھی اس اجلاس میں شرکت فرمائی۔ یہی جلسہ تھا جس میں خواجہ حسن نظامی سے اُن کے دوستانہ مراسم قائم ہوئے اور جس میں خواجہ صاحب نے یہ کہہ کر:

تمہارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو

اپنا عمامہ ان کے سر پر کھدیا تھا۔ تصویری درد، درد وطن کی تصویر ہے، درد وطنیت کی نہیں، جیسا کہ غلطی سے استدلال کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انہم کے جلوسوں میں شاید کچھ ہندو مہر زین بھی شریک ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد اقبال کے ایک ہندو شاگرد نے اس نظم کو سننا تو اس قدر متاثر ہوا کہ وہ روپے میں اس کا ایک شعر خرید لیا۔ تصویری درد یادوسرے لفظوں میں محمد اقبال کا کلام سننے کے لیے سامعین کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ انہم کے پہلے اجلاس میں مولوی احمد دین پیغمبر دے رہے تھے مگر لوگوں نے انہیں اسے ختم کرنے کی نوبت نہ دی۔ ان کا اصرار تھا محمد اقبال اپنی نظم پڑھیں۔ مولوی صاحب کو پیغمبر نا تمام چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ تصویری درد کے لیے دوسرا دن مقرر تھا۔ ۱۹۰۵ء میں محمد اقبال یورپ چلے گئے۔ واپس آئے تو بدستور انہم کے سالانہ جلوسوں میں شرکت کرتے، اپنا کلام سناتے۔ نالہ یتیم، یتیم کا خطاب ہلال عید سے، تو اپنی اپنی جگہ پر

مسلمانوں کی زبوب حالی، یتامی اور مساکین کی کمپری کا درد انگیز نوحہ ہیں۔ فریادِ امتِ زوال سلطنت اور سببِ اقتدار کے بعد غلامی کے ہاتھوں مسلمانوں کی مغلوک الحالی، عکبت و ادبار پر امت کے دکھ درد کی فریاد۔ تصویرِ درودِ محمد اقبال کی سیاسی بصیرت، آزادی کی تڑپ، انسانِ دوستی اور دردِ ملی کا ناقابل انکار ثبوت۔ محمد اقبال یورپ سے واپس آئے تو ایک دعوت اور پیغام لے کر آئے جو کب سے ان کے دل و دماغ میں ایک واضح شکل اختیار کر رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا امت کا گزر بڑے المناک حالات سے ہو رہا ہے۔ اس پر یاس اور بے دلی کی جو کیفیت طاری ہے، اس کے قوائے علم و عمل جس طرح مضمحل ہو رہے ہیں، زندگی کے مسائل اور حقائق سے ہٹ کر دین کے نام پر جس نزاں و جداول کا شکار ہو رہی ہے، جن لا طائل اور لا حاصل بجھوں میں الجھگٹی ہے، اس سے استھنا ص کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ امت کا شعورِ ملی بیدار ہو۔ وہ اس کی رعایت سے اپنے مستقبل کی تغیر میں اس راستے پر قدم اٹھائے جو تو حیدرِ رسالت نے اس کے لیے تجویز کر رکھا ہے اور جسے ہم شریعت سے تغیر کرتے ہیں۔ محمد اقبال اس دعوت کو لے کر واپس آئے اور بتدرتیج اس راستے کی نشان دہی کرنے لگے جس سے عالمِ اسلام کیا نوع انسانی کی تقدیر و ابستہ ہے۔ وہ قوم کو ایک پیغام دے رہے تھے۔ اس پیغام کی اشاعتِ انجمن کے توسط سے ہوئی۔ شعرو شاعری کا ایک ذریعہ ابلاغ بنی۔ اپریل ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم 'شکوہ' سے گویا اس پیغام کی ابتداء کر دی۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کا یہ جلسہ اسلامیہ کالج کے ریوازِ ہوش میں منعقد ہوا۔ اس سے پہلے محمد اقبال اپنی ہر نظم چھپوا کر ساتھ لاتے لیکن 'شکوہ' چھپوا کر نہیں لائے۔ لہذا سب سے پہلے اس کی رومنائی کا سوال پیدا ہوا۔ احباب اور سماعین نے مختلف رقوم پیش کیں۔ سرزو الفقار علی نے ایک سوروپے کا اعلان کیا اور نظم انجمن کی نذر کر دی۔ شیخ عبدال قادر لکھتے ہیں: "محمد اقبال نے اپنی نظم 'شکوہ' ایسے خاص انداز میں پڑھی کہ کیف غم کا سماں جلبے پر چھا گیا۔ ان پر پھول بر سارے جارہے تھے۔ اقبال کا معمرباپ بھی سننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹھے کی کامیابی کو دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے"۔<sup>۱۹۲</sup>

خواجہ عبدالصمد کھرو نے فرطِ جذبات سے انھیں سینے سے لگایا۔ ایک نہایت تیقی دوشاں اور ہادیا<sup>۱۹۳</sup> مرا جلال الدین کہتے ہیں: "جس زمانے میں وہ 'شکوہ' لکھ رہے تھے انھوں نے حد درجِ خاموشی سے کام لیا۔ جس شام کو فقیر سید الفقار الدین کی صدارت میں یہ نظم سنانے والے تھے اسی شام اپنے والد صاحب کے ہمراہ میرے ہاں مدعو تھے۔ ہم کھانا ختم کر رہے تھے کہ انجمن

کے سیکریٹری معہ چند را کیں ہانپتے ہوئے تشریف لائے اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگے نظم کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ سامعین شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم سمجھ گئے اس مرتبہ کوئی معرکہ آر انظم ہو گی۔ ۱۹۶۷ شکوہ کی فرد کا شکوہ نہیں پوری امت کا شکوہ ہے۔ اسے تعجب ہے اور دکھ بھی کہ جب تقدیر عالم کا سر رشتہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی اس کا ایمان و یقین اور یہی اس کی زندگی کا راز تو وہ ذلیل و خوار کیوں ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ شکوہ سنانے سے پہلے وہ ایک طرح سے خود ہی اس کی جواب دے رہے تھے۔ چنانچہ نظم پڑھنے کے لیے اٹھے تو اول یہ شعر پڑھا:

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی  
اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

”جواب شکوہ“، اگرچہ انجمن کے سالانہ اجلاس کی بجائے ۲۰ نومبر کی ایک شام کو بعد نماز مغرب بیرون موچی دروازہ ایک جلسے میں پڑھا گیا جس کا اہتمام مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا اور جس سے مقصود یہ تھا کہ زمیندار ترکی امدادی فنڈ کے لیے سرمایہ جمع کیا جائے۔ نظم پہلے سے طبع شدہ تھی، ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور اس کی ساری آمدنی امدادی فنڈ میں جمع کر دی گئی۔ میں نے اس جلسے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ”شکوہ“ سے ہمارا ذہن بے اختیار جواب شکوہ کی طرف تقلیل ہو جاتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی انجمن ہی کے کسی سالانہ جلسے میں پڑھی گئی ہو گی۔

۱۹۱۶ء میں محمد اقبال نے انجمن کے ۲۷ ویں سالانہ جلسے میں ”شاعر“ کے عنوان سے وہ نظم پڑھی جو دراصل ”شکوہ“ کا جواب ہے۔ فقیر سید افتخار الدین صدر تھے۔ نظم سے پہلے محمد اقبال نے ایک مختصر سی تقریر کی اور بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا کہ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ شاعر ایک طویل نظم ہے، الہاد و نشتوں میں پڑھی گئی، مگر تخت اللفظ، اگرچہ سامعین کا اصرار تھا ترجم سے لیکن محمد اقبال نے یقین دلایا کہ اس نظم کو تخت الملفظ پڑھنا، ہی مناسب ہے۔ لوگ مان گئے۔ پہلی نشست کی صدارت فقیر سید افتخار الدین نے کی۔ دوسری نشست کی مرزا سلطان احمد نے۔ مرزا صاحب کو جو لطیفہ سو جھا تو کہنے لگے محمد اقبال بڑے ہرجائی ہو، کبھی سلطان کا ساتھ دیتے ہو، کبھی فقیر کا۔ محمد اقبال نظم پڑھنے کے لیے اٹھے تو مرزا صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فی البدیہ یہ قطعہ پڑھا:

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

ہم نشین بے ریا میں از رہ اخلاص گفت  
اے کلام تو فروغ دیدہ بنا و پیر  
درمیانِ انجم معموق ہر جائی مباش  
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر  
گفتمنش اے ہم نشین معدود می دارم ترا  
در طسم امتیاز ظاہری ہستی اسیر  
من کے شمعِ عشق را در بزمِ جان افروختم  
سوخت خود را و سامانِ دوئی ہم سوخت۔<sup>۱۹۷</sup>

قطعہ پڑھا گیا تو مکر فرمائیے، کی آوازیں بلند ہوئیں۔ محمد اقبال نے کہا: دگر نتوانم سوخت۔ خواجہ عبدالصمد اس قدر متاثر ہوئے کہ بے قابو ہو کر اٹھے، محمد اقبال کو سینے سے لگالیا، سر اور ماتھے پر بوسے دیئے، ایک ہزار روپیہ چندہ انجم کی نذر کیا۔

”شع و شاعر“ جسے محمد اقبال نے خود ہی ”شکوہ“ کا جواب لکھا ہے، ایک پیام امید ہے، ایک درس خود اعتمادی۔ محمد اقبال کہہ چکے تھے، سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا گزر ایک بڑے نازک دور سے ہو رہا ہے۔ جنگِ عظیم میں یہ حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے گئے۔ دولتِ عثمانیہ نزع کے عالم میں۔ ایک ہائی نے ناموس دینِ مصطفیٰ پیغماڑا۔ عرب و ہم برتاؤی استعمار اور شہنشاہیت کے چنگل میں آگئے۔ محمد اقبال نے غلط نہیں کہا تھا:

آگ ہے اولادِ ابراہیم<sup>۱۹۸</sup> ہے نمرود ہے

کیا کسی کو پھر کسی کا امتحانِ مقصود ہے

چنانچہ ۱۹۲۱ء کی شامِ کونمازِ مغرب کے بعد ”حضر راہ“ کے عنوان سے جو نظم پڑھی گئی اس سے یہ حقیقت کہ مسلمانوں کا گزر ایک بڑے نازک دور سے ہو رہا ہے، واضح طور پر سامنے آگئی۔ عالمِ اسلام پرفی الواقعہ نزع کی سی کیفیت طاری تھی۔ یاں و نومیدی اپنہا کو پہنچ چکی تھی۔ عالمِ اسلام کی رہی سہی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ بلادِ اسلامیہ اب پورے طور پر دولتِ یورپ کے قبضے میں تھی۔ ایک انج ز میں بھی خود مختاری نہیں تھی۔ ہر طرف مایوسی، ہر کہیں بے دلی، جلسہ شروع ہوا، جسے دیکھیئے حزن و ملال، حسرت اور یاس کی تصویر۔ منتظرِ محمد اقبال کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے نظم پڑھنا شروع کی۔ پڑھنے لگے مگر جب کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

بیچتا ہے ہائی ناموس دینِ مصطفیٰ  
تو سامعین کے دل میں دکھ درد کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کا تمام و کمال اظہار مشکل ہے۔ پھر  
جب محمد اقبال اس شعر پر پہنچ:

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ  
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز  
تو خود محمد اقبال کو بھی ضبط کا یارانہ رہا۔ اب تک اپنے آپ کو سنبھالے ایک کے بعد دوسرا بند پڑھ  
رہے تھے گریے شعر پڑھا تو دل پر قابو نہ رہا۔ تھوڑی دیر کے لیے رک گئے، آنکھیں اٹک بار  
تھیں۔ سامعین بھی اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکے۔ بعض کی چھینیں نکل رہی تھیں۔ حتیٰ کہ اس  
شعر کی نوبت آئی:

ہو گیا مانندِ آب ارزان مسلمان کا لہو  
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دنانے راز  
تو لوگ بے حال ہو گئے۔ محمد اقبال نے نظم ختم کی۔ مجمعے کی عجیب کیفیت تھی۔ حزن و ملال یاں،  
اندوہ، افسردہ دلی اور سوز و گداز کے ملے جملے جذبات لیے سوچ رہے تھے:  
کشتنی مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم

کا اشارہ کس طرف ہے۔ یہ:

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی  
یہ راز آیے ان الملوك، یہ اقوام غالب کی جادوگری جسے سلطنت کہا جاتا ہے، یہ محنت اور  
سرما یے کی کشکش میں ان کا کہنا۔

نغمہ بیداری مجبور ہے سامانِ عیش

اور یہ:

آسمانِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا  
یہ عالمِ اسلام، ترک و عرب، یہ خلافت کی خستہ حالی پر فریاد و فغاں کے بعد:  
عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی  
یہ پیش گوئی:

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج

پہلا اکیڈمی پروف دنانے راز

موجِ مختصر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

اور تسلی:

مسلم اتنی سینہ را از آرزو آباد دار  
یہ سب کیا ہے؟ کچھ سمجھے، کچھ نہیں سمجھے جو سمجھے وہ بھی بہت کم۔ انھیں کیا معلوم محمد اقبال  
دانائے راز، قوم کے آلام و مصائب پر نوح خوانی ہی نہیں کر رہے، ان پر حیات امام کا راز افشا کر رہے  
ہیں۔

اگلے برس ۱۹۲۳ء میں جب سیاست بین اقوام کا دفتار رخ بدلا، نمرود نے اولاد ابراہیم  
کے ہاتھوں پہلی زک اٹھائی، عالم اسلام کی نشانہ اثنائی کے آثار نظر آنے لگے تو محمد اقبال نے  
انجمن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۳ء میں خضراء کے بعد طلوعِ اسلام کے نام سے اپنی دوسری  
معرکہ آراظم پڑھی۔ نظم کیا ہے اسلام اور عالم اسلام کے ایک درخشندہ مستقبل کی پیش گوئی کے  
ساتھ ساتھ امت کے فریضہ ملی اور اسلام کے سیاسی، اجتماعی نصب العین کی ترجمانی۔ ادھر محمد  
اقبال نظم پڑھ رہے تھے۔ ادھر سننے والوں کے دلوں میں مسرت و شادمانی کی لہریں جوش مار رہی  
تھیں۔ ان کا ایمان تازہ ہو گیا۔

۱۹۲۳ء سے پہلے اگرچہ محمد اقبال انجمن کے جلوسوں میں کئی نظمیں پڑھ چکے تھے۔ لیکن  
۱۹۲۳ء کے بعد انھوں نے انجمن کے جلوسوں میں کوئی نظم نہیں پڑھی، گو ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۶ء تک  
کے طویل وقٹے میں کچھ نظمیں یا یوں کہیں ان کے بعض اجزاء یا کچھ اشعار پڑھ کر سنائے۔ مثلاً  
۱۹۱۷ء میں بلال، کے عنوان سے محمد اقبال وہ نظم پڑھ چکے تھے جس میں اس جبشی زادہ حقیر کی  
عظمت کو جسے موذن اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور جس کی ہر اذان کے  
ساتھ حضورؐ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں بعنوان ارتقا ایک  
چھوٹی سی نظم:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بُھنی

علی ہدا وہ نظم جس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا

ایسے ہی ۱۹۱۹ء میں جب شاہنواز نے لندن کے لاث پادری پر یہ فقرہ چست کیا کہ

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

دیکھیے بلی چو ہے کو دعوت اتحاد دے رہی ہے تو انہوں نے ارجاً وہ قطعہ پڑھا جس میں میاں صاحب کے اس فقرے کو بڑے خوب صورتی سے نظم کیا گیا ہے۔<sup>۱۹۸</sup>

۱۹۳۶ء میں البتہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے تو ضعف علالت اور لگلے کی خرابی کی وجہ سے خود تو کچھ پڑھنے سے معدور تھے، لیکن جس روایت کو وہ آپ ہی قائم کر چکے تھے اس کا تقاضا تھا کہ اس جسے میں بھی ان کا کلام پڑھا جائے۔ چنانچہ محمد صدیق نعت خواں نے ضرب کلیم کی نظم:

خودی کا سر نہاں لا اللہ الا اللہ  
اپنے خاص انداز میں نشید کی۔ صدیق بڑے جیبر الصوت تھے۔ جلوسوں میں کلامِ اقبال معمولاً  
انھیں سے سناجاتا۔

یہ انجمن کے سالانہ جلوسوں میں، جن میں معمولاً وہ اپنا کلام سناتے، ان کی آخری شمویت تھی۔ انجمن کو کیا معلوم تھا کہ اہل لاہور اس کے بعد پھر کبھی وہ آواز نہیں سنیں گے جو ۱۹۰۰ء سے ایک پیام امید اور دعوت عمل بن کر ان کے دلوں میں اتر رہی تھی۔ انھیں کیا معلوم تھا ایک ڈیڑھ سال اور انھیں کہنا پڑے گا:

جس کے آوازوں سے لذت گیراب تک گوش ہے  
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

محمد اقبال کا تعلق انجمن سے کب قائم ہوا، غالباً ۱۸۹۹ء یا اس سے پہلے۔ ۱۸۹۹ء کو انھیں انجمن کی مجلس منظمه کارکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ اس سرکنی کمیٹی میں، شامل تھے جو اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انجمن کے قواعد و ضوابط میں ترمیم و اضافہ کرے۔ ۱۹۰۵ء میں محمد اقبال یورپ چلے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ انجمن کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ ۲۰۔ فروردی ۱۹۱۰ء کو انھیں انجمن کی جزل کنسل کارکن چنا گیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو جزل سیکریٹری کا عہدہ پیش کیا گیا۔ انہوں نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ سرڑو الفقار علی اور سید محمد شاہ نے ان کے علم و فضل کی تعریف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جون ۱۹۳۲ء میں وہ انجمن کے صدر منتخب ہوئے اور جولائی ۱۹۳۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے جس سے بہ سبب علالت انہوں نے بالآخر استغفار دے دیا۔

۱۸۹۹ء سے ۱۹۳۷ء تک انجمن سے انتالیس چالیس سالہ تعلق میں محمد اقبال نے انجمن

کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ محمد اقبال کی ذات سے انجمن کی شہرت، انجمن کی نیک نای اور وقار میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ محمد اقبال نے اس کے انتظامی اور تعلیمی معاملات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ طرح طرح سے ان کی رہنمائی کی۔ یہ محمد اقبال ہی کی کشش تھی جو لوگوں کو جو حق در جو حق انجمن کے جلوسوں میں لے آتی۔ اس پر ان کے اشتیاق کا یہ عالم کہ محمد اقبال کی نظم کے لیے کوئی دوسرا وقت مقرر ہے تو اس کے باوجود لوگوں کے اصرار پر انجمن کی کارروائی روک لی جاتی۔ محمد اقبال اپنا کلام سُنّاتے۔ لوگ ان کی نظمیں سنتے، ان کے ارشادات کو حرز جان بناتے، ان کے اشعار خریدے جاتے۔ ہاتھ چندے کے لیے جیبوں کی طرف بڑھتے۔ محمد اقبال خود بھی چندہ دیتے۔ یہ انھی کی کوششیں اور دوستانہ روابط تھے جو ۱۹۱۳ء میں مہاراجہ سرکرشن پرشاد کو انجمن کے چلے میں شرکت کے لیے لاہور لے آئے۔ مہاراجہ بہادر نے پیغم خانے کے لیے گراں قدر رقم عطا کی۔

۱۹۲۹ء میں انھوں نے کوشش کی کہ نظام دکن میر عثمان علی خاں لاہور آئیں۔ انجمن کو اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرمائیں۔ انجمن کے اداروں، کالج اور مدرسوں کو دیکھیں۔ اس کی مدد کریں۔ خط و کتابت ہوتی رہی۔ اسید بندھ گئی۔ لیکن نظام لاہور نہ آ سکے۔ ۱۹۳۰ء میں البتہ نواب بہاول پورا اور نواب خیر پور انجمن کے ۳۶ ویں جلسے میں شریک ہوئے۔ محمد اقبال نے تہذیت نامہ پیش کیا۔ ۱۹۳۲ء میں جب انھیں انجمن کا صدر منتخب کیا گیا تو انھوں نے دینیات اور اٹھکیوں کی تعلیم پر بالخصوص زور دیا۔ محمد اقبال چاہتے تھے کانج کو کوئی ایسا پرنسپل مل جائے جو صاحب علم و فضل ہوا اور صاحب رسخ بھی۔ کانج کے تعلیمی معاملات سے انھیں ابتداء ہی سے ڈچپی ہی اور کیوں نہ ہوتی، جدید تعلیم کا حصول ضروری تھا۔ لیکن انھیں ہمیشہ خیال رہتا طباء اس سے کوئی خراب اثر قبول نہ کریں۔ دین سے بے گانہ نہ ہو جائیں۔

۱۹۴۰ء میں تحریک خلافت کی ابتداء ہوئی۔ طباء کی اکثریت نے اس کا ساتھ دیا تو پرنسپل ہنری مارٹن نے ان کے خلاف طرح کی تادبی احکام جاری کرنا شروع کر دیئے جس پر طباء کے ساتھ ساتھ اہل لاہور بھی مشتعل ہو گئے۔ سرکار پرست عناصر نے پرنسپل کا ساتھ دیا۔ انھیں ڈر تھا سرکار کی مخالفت سے انجمن کو نقصان پہنچ گا۔ محمد اقبال اس زمانے میں کانج کمیٹی کے سیکریٹری تھے۔ بحثیت سیکریٹری انھوں نے پرنسپل کے اقدامات کو ناپسند کیا۔ بات بڑھ گئی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں تحریک خلافت کا زور تھا۔ تحریک خلافت نے حکومت سے ترک

موالات کا راستہ اختیار کیا تو تعلیمی ترک موالات کا اقدام ضروری ٹھہرا۔ انجمن اور کالج کے لیے یہ زمانہ شدید بحران کا تھا۔ سوال یہ تھا کیا اسلامیہ کالج پنجاب یونیورسٹی سے قطع تعلق کر لے۔ سرکار سے مالی اعانت نہ لے۔ محمد اقبال نے اس پر آشوب زمانے میں جس دیانت داری اور غیر جانب داری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے، سرکار پرست عناصر سے الگ رہے، تحریک خلافت اور تعلیمی ترک موالات کے بارے میں اصولاً جو روشن اختیار کی اس کا ذکر کا یہ موقع نہیں۔ اس کا بیان آگئے گا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ محمد اقبال ان مخالف و موافق ہنگاموں میں، جو سیاسی جوش و خروش میں پیدا ہو گئے تھے، اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے۔ جو معاملہ طے کیا بڑی خوش اسلوبی سے۔

ترک موالات کی طرح ایک دوسرا واقع بھی، جس کی حیثیت نجی ہے، لیکن جو عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں قادیانی جماعت کی روشن سے پیدا ہوا، اگرچہ قابل ذکر ہے مگر اس کے ذکر کا بھی یہ موقع نہیں۔ یہ واقعہ اکثر مرزا یعقوب بیگ کی جن کا تعلق قادیان کی لاہوری شاخ سے تھا، انجمن سے علیحدگی کا ہے جسے مخفی ذاتی مخاصمت سے تعمیر کیا گیا اور اس کی ساری ذمہ داری محمد اقبال پر ڈال دی گئی، حالانکہ صورت حال یہ نہیں تھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا۔ محمد اقبال نے بہر حال عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں انجمن کی رہبری نہایت خوبی سے کی۔

پھر انجمن حمایت اسلام چونکہ مسلمانان لاہور ہی کی نہیں ایک طرح سے مسلمانان پنجاب کی قومی انجمن تھی، لہذا سرکار انگریزی مجبور تھی، اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اس نے خود تو نہیں لیکن جب چاہا سرکار پرست عناصر کے ذریعے اس کے کاموں میں مداخلت کی۔ سرکاری عناصر بھی حکومت کی خوشنودی کے پیش نظر اس کا آئلہ کار بننے رہے۔ وہ جب دیکھتے کہ محمد اقبال چاہتے ہیں انجمن سرکاری اثر سے محفوظ رہے تو رپرہ ان کے خلاف کوئی نکوئی قدم اٹھاتے جس میں افسوس ہے وہ حضرات بھی شامل ہو جاتے جن کو بظہر ان سے دوستی کا دعویٰ تھا۔ لیکن یہ ایک دوسری داستان ہے جس کا تعلق محمد اقبال سے اتنا نہیں جتنا انجمن سے۔ لہذا یہاں اسی قدر اشارہ کافی ہے۔

البتہ ایک بات ہے جو بافسوں کہنا پڑتی ہے اور وہ یہ کہ انجمن کو شاید آج تک اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ اسے اپنے مقاصد میں چتنی بھی کامیابی ہوئی اس میں محمد اقبال کا حصہ نہایت وقوع، بلکہ فیصلہ کرن ہے۔ انجمن کے لیے محمد اقبال کی ان گونا گوں خدمات کا اعتراف ضروری

ہے جو انھوں نے اس کی شہرت اور وقار، مالی اعانت اور تعلیمی سرگرمیوں کے لیے کیں۔ ظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں کے دل میں محمد اقبال کے لیے کوئی جذبہ تشكیر اور احسان مندی بھی تھا ہی نہیں۔ حالانکہ انھوں کا فرض تھا اس کا اظہار ان کی زندگی میں نہیں تو قیام پاکستان کے بعد کسی ایسی شکل میں کرتی جو اس کے شایان شان ہو۔ دیکھیے انھوں کے ذمے محمد اقبال کی طرف سے جو قرض ہے انھوں اسے کب ادا کرتی ہے۔

## ۱۲۔ مخزن

اپریل ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقدار نے مخزن کے نام سے ایک علمی ادبی مجلے کا اجراء کیا۔ مخزن لاہور اور دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ عبدالقدار پیر ستری کر کے لندن سے واپس آئے تو قانونی مشاغل میں شب و روز انہاک کے باعث مخزن کی اشاعت جاری نہ رکھ سکے۔ مخزن ۱۹۱۲ء میں بند ہو گیا۔ گودو ایک بار اس کا احیا بھی ہوا، مگر وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ علم و ادب کی جو مغل مخزن نے جماں تھی پھر اس پائے کی کوئی مغل نہ جنم سکی۔ اردو اور اردو ادب کے فروع اور اشاعت کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان میں مخزن کا نام ہمیشہ فخر سے لیا جائے گا۔ یہ عبدالقدار ہی کی بہت اور اردو سے والہانہ محبت تھی جس سے مخزن کے ذریعہ ایک ایسا حلقة علم و ادب قائم ہو گیا جو بلا امتیاز مذہب و ملت اردو ادب کی خدمت میں منہمک رہتا۔ عبدالقدار کی کوشش تھی کہ سر سید کے ہاتھوں جس ادبی تحریک کی ابتداء ہو چکی ہے، مخزن کے ذریعے اسے اور آگے بڑھائیں۔ مخزن پنجاب ہی نہیں سارے ہندوستان کا ادبی مجلہ تھا۔ مخزن کا نام اردو ادب کے ادبی رسولوں میں سر نہ رست رہے گا۔ اس سے پہلے کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا جو صحیح معنوں میں ادبی ماہناموں کے حقیقی معیار پر پورا اترتتا، یا جس نے ملک کے اطراف و اکناف سے ہندو مسلمان ارباب علم و ادب کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ مخزن ایک مثال تھی جو عبدالقدار نے قائم کی۔ وہ خود بھی ایک صاحب علم و فضل انسان تھے۔ فطرت نے انھیں شعر و سخن میں بھی ذوق سلیم عطا کیا تھا۔ صحافت کا تجربہ تھا۔ انگریزی اخبار آبرزوں کی ادارت کرچکے تھے۔ ان کے تعلقات کی دنیا بہت بڑی وسیع تھی۔ اہل علم سے روابط تھے اور ان کا خاص وصف یہ کہ علم و ادب کے فروع میں دوسروں کو بآسانی اپنا ہم نوا بنا لیتے۔ محمد اقبال کیتے عبدالقدار شیخ ”عالم گنڈہ“ ہیں۔ ”عالم گنڈہ“ کی پنجابی ترکیب محمد اقبال کی ایجاد ہے۔ ان معنوں

میں عبدالقدار کو ہر کسی کا دل مودہ لینے میں کمال حاصل تھا۔ ہندوستان میں صحافت کا فن انگلستان سے آیا۔ انگریزی رسائل و جرائد ہندوستانیوں کے لیے نمونے کا کام دیتے۔<sup>۱۹۹</sup> عبدالقدار انگریزی اور انگریزی ادب سے خوب واقف تھے، جو ہر شناس تھے، طبیعت میں وسعت اور حوصلہ تھا۔ جس کسی میں جو ہر قابل دیکھا اس کی خوب خوب بہت افزائی کی۔ محمد اقبال کے دلی دوست تھے، محمد اقبال کی شاعری اور دل و دماغ کی خوبیوں کے قدردان۔ مخزن ہی نے ہندوستان کو محمد اقبال کی شاعری سے روشناس کرایا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ محمد اقبال کی شاعری کا آفتاب مخزن اور حمایت اسلام کے افت ہی سے طلوع ہوا۔ مخزن کی ہر اشاعت میں محمد اقبال کی کوئی نہ کوئی نظم بالاتر امام شائع ہوتی اور مخزن بھی حصہ نظم میں اسے اولین جگہ دیتا۔

مخزن سے محمد اقبال کے تعلق کی داستان دراصل عبدالقدار سے ان کی دوستی اور گوناگون تعلقات کی داستان ہے۔ ان کا تعارف دوران تعلیم ہی میں ہو چکا تھا۔ مشاعروں میں بھی وہ ان کا کلام سُن چکے تھے۔ بازار حکیمان کی مغلبوں اور بزم اتحاد کی علمی اور ادبی مجلسوں میں حصہ لیتے۔ قیام بھی محمد اقبال کے پڑوس میں کوچہ جلوٹیاں میں تھا۔ تعلقات کی ابتداء جس طرح ہوئی اس کا حال خود عبدالقدار کی زبان سے سینے۔ کہتے ہیں: ”میں نے ستارہ اقبال کا طلوع دیکھا اور چند ابتدائی منازل ترقی میں اقبال کا ہم نشیں اور ہم سفر تھا۔ لاہور میں ایک بزم مشاعرہ بازار حکیمان میں امین الدین صاحب کے مکان پر ہوا کرتی تھی، ایک شب اس بزم میں ایک نوجوان طالب علم نے..... ایک سادہ سی غزل پڑھی۔

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن

آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

پھر لکھتے ہیں: ”جو انی کی دلچسپیوں میں ایک نہایت قابل یاد دلچسپی اقبال مرحوم کی دوستی سے پیدا ہوئی جس نے دور تک ساتھ دیا۔ وہ اس وقت کانج میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے شہر میں میرے مکان کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ ہماری ملاقات تو پہلے ہی ہو چکی تھی، شہر کی ہمسایگی نے ہم نشینی کے مزید موقع پیدا کر دیئے۔ میں شام کو ان کے پاس بیٹھتا۔ ان کے دو تین اور دوست عموماً وہاں موجود ہوتے۔ ایک تو ان کے استاد مولانا میر حسن کے فرزند سید محمد تقی تھے۔ ان کی دوستی پرانے تعلقات پر ہتی تھی۔ سیالکوٹ کے ایک اور صاحب سید بشیر حیدر بھی تھے جو اس وقت طالب علم تھے، مگر بعد ازاں ڈپٹی ہو گئے۔ ایک اور طالب علم سردار

عبدالغفور تھے جو ابو صاحب کہلاتے تھے۔ یہ اقبال کے مذاح تھے۔ میں جاتا تو سلسلہ شعر و تحریک شروع ہو جاتا۔ کوئی شعر یا مصیر اقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا تھا جو طرح کا کام دیتا۔ وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔ ابو صاحب کا غذ پنسل لے کر لکھنا شروع کر دیتے۔ اقبال کے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح لکھا گیا۔ ابو صاحب ایک مجلد بیاض میں اپنی پنسلی یاداشتیں صاف کر کے لکھ لیتے تھے۔ اگر ابو صاحب کا تیار کیا ہوا مسئلہ موجودہ ہوتا تو مرحوم دوست کا بہت سا کلام چھپنے سے رہ جاتا کیونکہ وہ اس زمانے میں کوئی مسودہ اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ اب زیادہ شایم اقبال کے ہاں صرف ہونے لگیں۔ یوں محمد اقبال اور عبدالقادر کے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ علمی اور ادبی سرگرمیوں نے انھیں یک جا کر دیا۔

۱۸۹۸ء میں کپتان ہارلینڈ کے ایما اور آزاد اور حالی کی کوششوں سے شاعری نے جو نیارخ اختیار کیا محمد اقبال کا ذہن بھی قدرتاً اس کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ مجلس اتحاد یا ایسی ہی کوئی اور محفل تھی جس میں انھوں نے "ہمالہ" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی اشاعت کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ لیکن محمد اقبال نظر ثانی کا عذر پیش کر دیتے۔ عبدالقادر نے مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا تو ان سے وعدہ لے لیا کہ: اس رسالے کے حصہ نظم کے لیے نئے رنگ کی نظمیں وہ مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا میں ان کے پاس گیا۔ انھوں نے اس نظم کو دینے میں پس و پیش کی۔ میں نے زبردستی وہ نظم لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں شائع کر دی۔ یوں محمد اقبال کی اردو شاعری کا پہلک طور پر آغاز ہو گیا۔<sup>۲۰۱</sup> میانگ درا میں بھی پہلی جگہ اسی نظم کو دی گئی۔ حالانکہ شیخ صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ ہمالہ سے اقبال کی اردو شاعری کا پہلک طور پر آغاز تو کیا ہوا وہ ان کی شاعری کے "ہمالہ" کا نقطہ آغاز ہے محمد اقبال نے نظموں کے علاوہ مخزن کے لیے مضامین بھی لکھے۔ عبدالقادر بیرونی کے لیے انگلستان گئے اور ۱۹۰۸ء تک وہی مقیم رہے تو اس دوران میں محمد اقبال کو باقاعدہ خط لکھتے۔ بار بار انھیں انگلستان آنے کی دعوت دیتے۔ خطاب پیارے اقبال سے ہوتا۔ ۱۹۰۲ء کو جہاز مالدیو یہ سے لکھتے ہیں: "یاد تو آپ ضرور آتے ہی تھے مگر جہاز پر بہت یاد آئے۔ ایک عرصہ سے امید ہو گئی تھی کہ ہم دونوں اکھٹے سفر کریں گے۔ مگر میری عجلت کی تیاری اور آپ کے عزم کی تعویق ..... کوشش یہ چاہیے کہ آپ وہاں میرے ہوتے ضرور آئیں ..... سست نہ ہو جانا۔ میں وہاں پہنچتے ہی آرلنڈ صاحب سے مشورہ کر کے آپ کو خط

لکھوں گا۔ اگر اس ستمبر میں نہیں..... تو مگر میں ضرور چل دینا، یہ موسم سب سے اچھا اس سفر کے لیے ہے..... ہاں چلے کی سینے۔ اس وقت جو صدمہ گھر سے رخصت ہونے ..... کا تھا اسے تو خیر ضبط کر لیا مگر راستے میں میر صاحب<sup>۳۰۳</sup> نے ایک غزل کے چند شعارات پڑھے..... اس سے رقت طاری ہو گئی۔ محمد اکرم کو کہیے یہ غزل آپ کو دکھائیں، آپ بھی اس زمین میں کچھ لکھیے:

اللہ ترا نگہبان پر دلیں جانے والے

شیدائیوں سے اپنی آنکھیں چرانے والے

میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں ابراہیم<sup>۳</sup> کی قربانی مگر اس کو اس پرانے واقعے سے کوئی نسبت نہیں..... اس وقت مجھے آپ کی نظم یاد آگئی جس میں آپ نے حضرت ابراہیم کی تصویر الفاظ میں کہیجی ہے<sup>۳۰۴</sup> ..... ابو صاحب کو میرا بہت بہت سلام کہیے..... جب اقبال ولایت میں میرے قبضے میں ہو گا اور ابو صاحب اس کے کلام کا منتظر ہو گا تو میں نقلیں بھیجا کروں گا۔ ابو صاحب کا سب سے آگے کھڑے رہنے اور چلتی گاڑی میں مجھ سے ہاتھ ملانا یاد رہے گا۔ تقی شاہ سے چلتی دفعہ ملنا ہوا مگر وہ کہیں بھول سکتے ہیں۔<sup>۳۰۵</sup> ایک دوسرے خط میں جو ۱۹۰۷ء میں رقم ہوا، لکھتے ہیں: ”سمندر کا سفر اس خوش گوار موسیم میں اور خصوصاً ایسی چاندنی کے وقت لکھتا پیارا سفر ہے۔ خیر جدہ میں تو زیادہ سے زیادہ بھی کر سکتا ہوں کہ اقبال کو بلاوں کہ آ اور دیکھے۔<sup>۳۰۶</sup> ..... ایک تیسرا خط میں جو ستمبر ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا، جب محمد اقبال لکھے تھے کہ اگلے ستمبر میں انگلستان روانہ ہوں گے، کہتے ہیں: ”اگلے ستمبر کے آپ ہی منتظر ہیں، یہاں بھی کئی لوگ منتظر ہیں اور ان میں سب سے بڑھ کر میں“۔ محمد اقبال نے ابتدا میں کوئی لیکچر دیا تھا، اس کا حال پوچھا ہے۔<sup>۳۰۷</sup> پھر جب ۱۹۰۵ء میں محمد اقبال انگلستان پہنچے تو وہاں بھی عبدالقدار کا شب و روز ساتھ رہا۔ عبدالقدار البنتہ محمد اقبال سے کچھ دن پہلے لاہور آچکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد محمد اقبال بھی آگئے۔ اب پھر مسخرن تھا اور لاہور کی محلیں، شب و روز کی ملاقاتیں، دوستی اور محبت کے گھرے جذبات۔

پھر ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خونین کے بعد جب سارا ہندوستان انگریزوں کے تصرف میں آ گیا تو کچھ بسبب محرومی اور کچھ بسبب اشتراک وطن اہل وطن میں ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو چکا تھا۔ جو صدیوں کے میں جوں اور ان کے اثرات کے باعث جو اسلامی تہذیب و تمدن سے مترب ہوئے، زبان اور ادب کے معاملے میں بڑی حد تک

مسلمانوں سے ہم آہنگ تھا۔ یہ حالات تھے جن میں مخزن کا اجراء ہوا۔ عبدالقادر انگلستان گئے۔ یہ سڑی کی۔ واپس آ کر پھر مخزن کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی۔ ادبی اور علمی سرگرمیوں اور قانونی مشاغل میں منہک ہو گئے۔ محمد اقبال بھی انگلستان گئے یہ سڑی کی۔ لیکن ان کا ذہن شروع ہی سے ایک نصب اعین پر مرکوز تھا۔ یوں طرح طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے، لہذا ان کی طبیعت میں ایک خلش تھی، ایک اضطراب اور ایک کاؤنٹ جس نے ان کے دل و دماغ کو طرح طرح سے ہلا کیا۔ یہ اضطراب اور یہ خلش دور ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ اس نصب اعین کے حصول کی کیا ضرورت ہے۔ پھر اس نصب اعین کی نوعیت جہاں روحانی، اخلاقی تھی سیاسی اور اجتماعی بھی۔ اس کا تعلق اگر سارے عالم اسلام سے تھا تو ان کے اپنے مرزو بوم سے بھی جہاں اختلاف مذہب اور اختلاف معاشرت کے علاوہ اور بھی اختلافات تھے۔ مقامی، لسانی حتیٰ کہ خود مسلمان بھی طرح طرح کی فرقہ بندیوں میں بٹ چکے تھے۔ سوال یہ تھا اس مشکل کا حل کیا ہے۔ اس قسم کے پچیدہ حالات میں اس نصب اعین کے حصول کی صورت کیا ہو گی۔ یہ مشکل حل ہو گئی تو ایک دوسرا سوال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ اس راستے میں ان کا ساتھ کون دے گا۔ کون ہم سفر ثابت ہو گا۔ قدرتاً ان کا خیال عبدالقادر کی طرف گیا۔ عبدالقادر ان کے دوست تھے۔ ان کے دل اور دماغ سے واقف۔ عبدالقادر لاہور میں تھے۔ محمد اقبال کو رفیق راہ کی تلاش تھی۔ انھوں نے عبدالقادر کو لکھا:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افت خاور پر  
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

یہ نظم بغوان عبدالقادر کے نام ۱۶ اشعار پر مشتمل ہے جسے عبدالقادر نے مخزن میں ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے لکھا: ”مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے..... خدا حضرت اقبال کے ارادوں کو برکت دے اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق فرمائے“۔<sup>۲۰۸</sup>

لیکن عبدالقادر مخزن اور مخزن سے بڑھ کر قانونی مشاغل میں الجھ گئے۔ رفتہ رفتہ سرکار سے واپسی پیدا ہوئی اور یہ واپسی بڑھی تو سیاست سے ان کا تعلق کلیتاً منقطع ہو گیا۔ محمد اقبال کی آرزوئے رفاقت پوری نہ ہو سکی۔ علم و ادب کی محفلوں اور انجمن حمایت اسلام کی

سرگرمیوں میں البتہ ان کا ساتھ رہا۔ دوستی اور محبت میں فرق نہ آیا۔ عبدالقدار نے بانگ درکا دیباچہ لکھا لیکن قانونی مصروفیات ان کے راستے میں حائل تھیں۔ وہ اس سے بہتر دیباچہ لکھ سکتے تھے۔ محمد اقبال سے عبدالقدار کی شبِ روزِ ملاقات رہتی۔ طرح طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی تا آنکہ ان مسائل پر سلسلہ گفتگو بھی بند ہو گیا۔ عبدالقدار محمد اقبال کے قدر دان تھے، بقول ان کے ارکانِ مشیدہ میں سے ایک۔ محمد اقبال ان کی مجبوریوں کو سمجھتے انگلستان میں بھی عبدالقدار اور محمد اقبال کا دوسال تک ساتھ رہا۔ کاش عبدالقدار ان ملاقاتوں اور اس زمانے کے حالات قلم بند کر سکتے۔ 'کیف غم' کے عنوان سے البتہ انھوں نے محمد اقبال کے کیف غم کی کچھ کیفیت بیان کی ہے۔ اس لحن کا ذکر کیا ہے جس میں سوز تھا، سرو تھا، جس سے سامعین پر ایک روحاںی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی محمد اقبال سے آخری ملاقات ہوئی۔ عبدالقدار لکھتے ہیں: "۱۹۳۳ء میں ہائی کورٹ کے کام سے سبک دوش ہو کر پانچ سال کے لیے اس وقت کے وزیر ہند کے مکھے میں لندن گیا تو میرے محترم دوست سر محمد اقبال بحیثیت مجموعی بخیریت تھے۔ ان کی علانوں کا دور میری غیر حاضری میں شروع ہوا اور جب میں اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر ہندوستان آیا..... ان سے ملنے گیا تو وہ ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور لحاف اوڑھے ہوئے تھے۔ مگر ان کی وسعتِ اخلاق کی وجہ سے اس حالت میں بھی مختلف ملنے والوں کا ایک گروہ ان کے قریب تھا..... ایک معزز سرکاری افسر، ایک مالک اخبار اور ایک دوایلیٹ اور چند نوجوان طالب علم۔ مرحوم مجھ سے بہت محبت سے ملے اور پہلے مجھے گلے لگایا اور اپنی چارپائی پر ہی بٹھا لیا..... ملاقاتی..... کیے بعد دیگرے اجازت لے کر رخصت لے گئے..... دیر تک با تین کرتے رہے..... انگلستان کے تمام حالات سنتے رہے..... بعض دوستوں کی بابت پوچھتے رہے..... دعوتِ دی دوسرے دن دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں..... دوسرے دن ..... یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اس وقت لیٹے ہوئے..... کرسی پر بیٹھتے تھے اور دو ایک دوست بھی موجود تھے..... چودھری محمد حسین اور مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ۔ کھانا آیا۔ اقبال صاحب خود بھی اس میں شریک ہوئے..... کھانا انھوں نے رغبت سے کھایا۔ گفتگو بھی دورانِ طعام بہت دلچسپ ہوئی۔ مخدوم میراں شاہ، اقبال مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا اس زمانے کا قطب پنجاب میں کون ہے۔ میں نے کہا یہ تو آپ کا ملکہ ہے۔ انھوں نے کہا اقبال صاحب ہی قطب پنجاب ہیں۔ میں نے کہا۔..... اس راہ سے بے خبر ہوں، البتہ اقبال کے

ہم نہیں، جن میں میں بھی شامل تھا، کبھی ان کو قطب از جانی جدید کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ غرض اس قسم کے مزاح و تفریح کے بعد وہ بزم مختصر پر خاست ہوئی۔ مگر اس سے رخصت ہوتے وقت یہ معلوم تھا کہ میں ان کو اور وہ مجھے آخري مرتبہ دیکھ رہے ہیں،<sup>۱۹۳۸</sup>

۱۹۳۸ء میں محمد اقبال اور عبدالقدار کی چالیس بچپاس برس کی رفاقت ختم ہو گئی۔ آئین قدرت بھی یہی ہے کہ رفاقتیں ختم ہو جائیں۔ لیکن محمد اقبال، عبدالقدار اور محسن یہ تین نام اس طرح لازم و ملزم ہیں کہ ایک سے دوسرے کی یادتازہ ہو جاتی ہے۔

عبدالقدار سے ابو صاحب کو جو تعلق تھا اور ابو صاحب کو محمد اقبال سے اس کا ذکر عبدالقدار کرچکے ہیں۔ ابو صاحب یعنی خان بہادر عبدالغفور رانی گجرات پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ محمد اقبال کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں تعلیم پائی۔ محمد اقبال کے کلام کے شیدائی۔ محمد اقبال سے ان کی دوستی اور ہم نہیں کی داستان بہت دلچسپ ہو گئی۔ ابو صاحب نے شاید بسبب مصروفیت اسے قلم بند نہیں کیا۔ ابو صاحب نے بانگ درا کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور کیوں نہ لیتے، عبدالقدار نے لکھا ہے محمد اقبال کا ابتدائی کلام انھیں کی کوششوں سے محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا۔ اس ابتدائی کلام کو شیخ اعجاز احمد نے بھی آگے چل کر جمع کیا، مگر جس زمانے کا عبدالقدار ذکر کرتے ہیں وہ اس زمانے میں ابھی مکتب میں بھی نہیں بیٹھے تھے۔ شیخ گلاب دین اور سید بشیر حیدر بھی ان کا کلام جمع کرتے۔ معلوم نہیں ان کی یادا شتیں کیا ہوئیں۔ رفتہ رفتہ یہ کلام تمام تر نہیں تو جزوًا کچھ محسن مگر زیادہ تر ذاتی یادا شتوں کے ذریعے منظر عام پر آتا گیا۔ چنانچہ اسی ہی ایک بیاض راقم الحروف کے عزیز دوست بشیر ضیائی نے تیار کر کھی چکی۔ انہوں نے بڑی محنت سے ان کا ابتدائی کلام جمع کیا۔ لیکن افسوس ہے اس بیاض کی مکمل نقل ۱۹۲۱ء میں ضائع ہو گئی۔ میں لکھنؤ گیا۔ تحریک ترک موالت اپنے پورے عروج پر تھی۔ چودھری خلیق الزمان اور ان کے بھتیجے بدر الزمان راقم الحروف کے ہم جماعت لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں بند تھے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کلام اقبال کی فرمائش کرچکے تھے۔ میں نے بیاض پیش کر دی۔ خیال تھا چند نوں کے بعد جائے گی لیکن مجھے بجلت علی گڑھ اور علی گڑھ سے لاہور واپس آنا پڑا۔ بیاض بھی ڈسٹرکٹ جیل میں کسی نے اڑا لیا گم ہو گئی۔ یہی بیاض ہے جسے مہر مرحوم نے عبداللہ قریشی صاحب کے مزید اضافے کے ساتھ سروہ رفتہ کے نام سے شائع کیا۔

### ۱۳۔ شاعری

محمد اقبال کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا۔ بچپن ہی سے کلام موزوں زبان سے نکل رہا تھا۔ لیکن ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۸۵ء یا شاید اس سے کچھ پہلے ہو گیا تھا۔ سیالکوٹ میں ایک چھوٹے سے مشاعرے میں شرکت اور اسکول کے زمانہ طالب علمی میں ایک نظم پڑھنے کی طرف امین حزین اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن ان مشاعروں کا زمانہ بتقین معلوم نہیں۔ نہ اسکول میں نظم پڑھنے کا۔ رسالہ زبان دہلی میں البتہ ان کی جود و غزل لیں شائع ہوئیں ان کا زمانہ ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۴ء ہے جب کہ وہ ابھی لاہور نہیں آئے تھے۔ رسالہ زبان میں انھیں شیخ محمد اقبال صاحب لکھا گیا ہے جیسے وہ ایک نو عمر شاعر ہوں۔ یہ غزل لیں نوجوانی کے زمانے میں لکھی گئیں۔ ۱۸۹۴ء میں لاہور آئے۔ چودھری جلال الدین کے ذریعے میر نیرنگ سے تعارف ہوا۔ چودھری صاحب کے ذوق ختن کی پرورش میر حسن کے فیض صحبت میں ہوئی وہ گویا محمد اقبال کے ہم درس تھے۔ انھوں نے میر نیرنگ سے محمد اقبال کی شاعری کا ذکر کیا تو انھیں تجуб ہوا کہ محمد اقبال شعر بھی کہتے ہیں۔ کہنے لگے میں ان کا نمونہ کلام دیکھنا چاہتا ہوں۔ چودھری صاحب کے پاس محمد اقبال کی ایک غزل موجود تھی، میر صاحب کے پاس لے گئے اور یوں محمد اقبال سے ان کے تعارف کا ذریعہ بنے۔ میر صاحب نے مطلع پڑھا:

بر سر زینت جو شمع محفل جانانہ ہے  
شاید اس کی زلف پیچاں کا پر پرواز ہے

اور پھر یہ شعر:

پائے ساتی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے  
چال ہے خالی کھاں یہ لغوشِ مستانہ ہے  
تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ۱۷

میر حسن ہی کی وساطت سے محمد اقبال نے داغ کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ غزل لیں اصلاح کے لیے بھیجیں، مگر کلام میں ابتداء ہی سے چنتیکی کا رنگ نمایاں تھا۔ اس زمانے میں جگہ جگہ سے طریق گلدتے شائع ہو رہے تھے۔ ان میں پیام یار بالخصوص قابل ذکر ہے۔ سیالکوٹ کے ادبی حلقوں میں باقاعدہ پہنچتا۔ یہ طریق گلدتے جن میں بیشتر کسی ایک طرح کی رعایت سے شراء کا کلام چھپتا اب نایاب ہے۔ سیالکوٹ سے بھی کئی ایک رسالے اور اخبار شائع ہوا کرتے تھے جو

افسوں ہے باوجود تلاش کے نہل سکے۔ ان رسالوں اور گلددستوں میں بھی بہت ممکن ہے محمد اقبال کا کلام شائع ہوتا ہو۔ بہر حال رسالہ زبان دہلی میں ان کی جو غزلیں ۹۳ء یا ۹۴ء میں شائع ہوئیں ان کی طرح دو اور غزلوں کا زمانہ بھی تحقیق سے معلوم ہے، دوسری جس کے اس شعر:

موتی سمجھ کے شان کریں نے چن لیے  
پران کی شاعری کا سکھ بیٹھ گیا۔

پھر ۱۸۸۶ء میں محمد اقبال نے ابوسعید محمد شعیب کے رسالہ مختصر العروض کے لیے ایک قطعہ تاریخ کہا جس کا یہ پہلا شعر یہ ہے:

مصنف جب کہ ایسا ہو رسالہ کیوں نہ ہو ایسا

گھر باری تقاضا ہے مزاج ابر نیساں کا

اور تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا: ”شاعر با کمال، ناظم عالی خیال جناب مشی محمد اقبال صاحب اقبال۔ شاگرد جناب داغ دہلوی متعلم بی۔ اے۔ کلاس گورنمنٹ کالج، لاہور۔“ ۱۷ تعارف سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ محمد اقبال کا شمار زمانہ طالب علمی ہی میں شرارے با کمال میں ہو رہا تھا۔ مولانا شعیب اس زمانے میں اور یونیٹی کالج میں عربی کے معلم تھے ایک طرح سے محمد اقبال کے بزرگوں میں شامل۔ بایس ہمہ انہوں نے محمد اقبال کا ذکر کس احترام سے کیا ہے۔ ثانیاً محمد اقبال میر حسن کے زیر ترتیب شعر کے حسن و فتح اور فن شاعری کے لوازم سے تمام و کمال واقف ہو چکے تھے۔ یہ عروض میں ان کی مہارت تھی جس کی بنا پر عربی کے ایک فاضل نے ان سے اپنے رسائل کی تاریخ کہلوائی جس میں صفت یہ رکھی گئی کہ فصاحت، بلاغت، لیاقت اور ذہانت کا دل یعنی الف لے کر مادہ تاریخ کے اعداد میں اعداد ادب کے شامل کیے۔ تاریخ ہو گئی۔

دکھا کر یہ کتاب بے بہا دل چین لیتا ہوں

وضاحت کا بلاغت کا لیاقت کا ذہانت کا

ادب کے ساتھ سالی طبع پھر یوں عرض کرتا ہوں

جزاک اللہ لکھا ہے یہ رسالہ مختصر کیسا

بہر حال ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۵ء تک انہوں نے جو کچھ کہا اس کی سنی ترتیب بجز دو چار، غزلوں کے ناممکن ہے۔ بیہاں یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جو غزلیں ۹۳ء یا ۹۴ء میں شائع ہوئیں

ممکن ہے ۹۳ء اور ۹۲ء سے پہلے کہی گئی ہوں۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کے اس دس سالہ دور کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔ دو غزلوں کا زمانہ رسالہ زبان دہلی کی بدولت معلوم ہوا۔ دو اور ایک اور کار رسالہ محسشر، عبدالقادر اور حکیم احمد شجاع کے بیانات سے ۱۳۷ مختصر العرض کی تاریخ کا قاضی افضل کے مضمون سے۔

بانگ درا میں البتہ سنی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے مختلف، حصوں بالخصوص حصہ اول میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کا پورا کلام شامل نہیں حتیٰ کہ نالہ یتیم اور فریاد اُمت، ایسی نظمیں بھی، جن کی نذر یا احمد اور حمالی نے داد دی اور جن میں اہل نظر کو مستقبل کے ایک عظیم شاعر کی جھلک نظر آ رہی تھی، بانگ درا سے خارج کر دی گئیں۔ پھر تھی اور نظمیں ہیں جن کی اہمیت کچھ کم نہیں مثلاً یتیم کا خطاب ہلال عید سے یا اسلامیہ کا لمحہ کا خطاب یا خیر مقدم یا وہ جن کے اب عنوان ہی محفوظ ہیں۔ مثلاً دین و دنیا، زبان حال۔ ان نظموں کو بھی بانگ درا میں جگہ نہ ملی۔ مصلحتیں کچھ بھی ہوں۔ یہ نظمیں میخن کے علاوہ جزو اجزاؤ کسی نہ کسی مجموعہ کلام میں شائع ہو چکی ہیں۔ محمد اقبال کی عظمت فن اور خیالات و تصورات کی بتدریج نشوونما کے مطابع میں جن کی داغ بیل بہت پہلے پڑھکی تھی اور جو رفتہ رفتہ ایک مخصوص فکر کی شکل میں واضح اور متعین ہوتے چلے گئے نہ صرف اہم بلکہ حد رجہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں تو اس سارے کلام کو اس نجح پر ترتیب دینا چاہیے کہ محمد اقبال وقتاً فوقتاً جو کچھ کہتے رہے، انھوں نے جس رنگ میں جن خیالات کا اظہار کیا اور پھر ان میں حک و اضافہ، علی ہزار دو بدلتا رہا۔ سنی اعتبار سے ہمارے سامنے آ جاتے ہم سمجھ لیں ایسا کیوں ہوا۔ ورنہ ہو یہ رہا ہے کہ ان نظموں کے بانگ درا سے اخراج کے باوجود اقبال کے تقید نگاران کے کسی شعر یا اشعار سے بعض ایسی باتوں پر استدلال کرتے ہیں جو ہرگز صحیح نہیں۔ چنانچہ سوانح نگار کو اس قسم کے غلط استدلالات سے بار بار سابقہ پڑا۔

میری رائے میں تو بانگ درا کیا بعد کے دو اویں میں بھی کہ شاعر کہنے کو بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ کلام کا انتخاب ضروری ٹھہرتا ہے جس کا اندازہ ان مسودات سے جن کو راقم الحروف نے ارمغان حجاز کی تسوید میں بارہا دیکھا اور جو کبھی منظر عام پر آئے بخوبی ہو جائے گا۔ انتخاب ضروری تھا انتخاب ہوا تو بعض عمدہ اشعار نظر انداز ہو گئے۔ وجہ کچھ بھی ہو بال جبریل کی اشاعت پر جب میں نے عرض کیا یہ شعر:

عرضہِ محشر میں میری خوب روائی ہوئی

داورِ محشر کو اپنا راز داں سمجھا تھا میں

کیا آپ نے خود ہی خارج کر دیا؟ فرمایا نہیں، اسے محفوظ کرلو۔ ایسے ہی کچھ اور اشعار ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کسی مناسب موقع پر آئے گا۔ کہنا بہر حال یہ ہے کہ شاعر کی اپنی رائے پسند اور ناپسندیدگی کے علاوہ مخصوصین اور معتقدین کے مشوروں سے وہی کچھ ہوا جو غالب سے غالب کے کلام کے ایک حصے کو بھی بسبب، عجلب یا کسی اور وجہ سے منتخب دیوان میں جگہ نہ ملی، حالانکہ اسے دیوان میں شامل رہنا چاہیے تھا جیسا کہ نسخہِ تجدیدیہ کے مطابع سے تشیم کرنا پڑتا ہے۔ بانگ درا کی صورت میں بھی یہی کچھ ہوا۔

یہاں ایک دوسری بات کی طرف بھی جس سے ایک گونہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ یا پیدا کر دی گئی، اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ ہے ان کی فارسی شاعری کا معاملہ۔ کہا جاتا ہے انھوں نے فارسی میں شعر کہنا اس وقت شروع کیا جب ایک واضح مقصد ان کے سامنے آیا۔ یعنی ۱۹۱۱ء میں، یا اس سے کچھ پہلے جب حضرت قلندر کے تیغ میں وہ اپنے والد ماجد کی فرمائش پر ایک مشنوی لکھ رہے تھے۔ حالانکہ لاہور کے ابتدائی زمانہ میں تو یقیناً سیالکوٹ کے زمانہ طالب علمی ہی میں اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک ایسی زبان میں جس سے انھیں فطری مناسبت تھی وہ ابتداء میں محض شوقیہ شعر کہتے ہوں، یا یہ فطری مناسبت آپ ہی آپ فارسی میں شعر کہلانے لگی جسے محمد اقبال ابتداء میں کوئی اہمیت نہ دیتے۔ بہت کم احباب سے ذکر کرتے۔ یوں بھی مشاعروں کی زبان اُردو تھی۔ مشاعروں میں اُردو کلام ہی سناتے۔ یہ خیال ہی نہیں تھا کہ فارسی زبان کا شاعر نہیں۔ لیکن ۱۹۰۵ء سے پہلے وہ فارسی میں نہایت اچھی غزلیں کہہ چکے تھے۔ مثلاً منشی صاحب سراج الدین کی بھیجی ہوئی انگلش یوں کے شکر یہے میں فارسی کا ایک طویل قطعہ اور وہ نظم جس کا عنوان ہے اسلامیہ کانٹ کا خطاب پنجاب سے، جسے محمد اقبال نے ۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھا اور جو اس امر کی دلیل ہے کہ ۱۹۰۳ء تک انھوں نے فارسی زبان میں شعر گوئی پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ بلا تکلف اتنی بڑی نظم کہہ ڈالی۔ لیکن یہاں تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس غلط فہمی کی ذمہ داری جس کا تعلق محمد اقبال کی فارسی شاعری سے ہے کس پر کچھ جائے۔ کیا عبد القادر پر؟ ہرگز نہیں۔ بانگ درا کے دیباچے میں وہ لکھ چکے تھے، فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہو گئی..... جس

چھوٹے سے واقعے سے ان کی فارسی گوئی کی ابتداء ہوئی وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا وہ فارسی اشعار بھی کہتے ہیں یا نہیں۔ انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر کچھ ایسا وفت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صحن اچھتے ہی مجھ سے ملے تو دو تازہ غزل لیں فارسی میں تیار تھیں۔<sup>۱۱</sup>

میرا خیال ہے شیخ صاحب بسب قلیل الفرصتی محمد اقبال کی فارسی شاعری کا معاملہ کھول کر بیان نہیں کر سکے۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا دعوت کس دوست کے یہاں تھی اور کب؟ ۱۹۰۵ء سے بہر حال پہلے۔ مسخرن، جنوری ۱۹۰۵ء میں انھوں نے محمد اقبال کی ایک نظم بعنوان 'سپاس امیر' شائع کی۔ تمہیداً لکھتے ہیں "ذیل کی نظم درج کر کے ہم ان احباب کے تقاضوں سے سکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لیے بے حد اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ فارسی نظموں عموماً مسخرن میں درج نہیں ہوتیں، تا ہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہار عقیدت شیخ صاحب صحیح کے وقت پڑھا کرتے ہیں"۔ اظہار عقیدت کا تعلق جناب امیر جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے حضرت علی مرتفعی کرم اللہ و جہہ سے ہے۔ پیام مشرق میں اس نظم کا صرف دوسرا بند شامل کیا گیا۔ مسخرن کا یہ شذرہ اس امر کا ثبوت ہے کہ محمد اقبال ۱۹۰۵ء تک فارسی میں بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ دراصل شیخ صاحب وہی کچھ کہنا چاہتے تھے جو محمد اقبال نے آگے چل کر کہا کہ فارسی زبان کو انھوں نے اپنی شاعری کے لیے اختیار کیا تو اس لیے کہ ان کی شاعری عالم اسلام کے لیے ایک پیغام کا کام دے اور یہ پیغام فارسی زبان ہی میں دیا جا سکتا تھا۔ شیخ صاحب نادانستہ یہ کہہ گئے کہ محمد اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز ایک اتفاقی امر تھا۔ شیخ صاحب کے لیے تو اتفاقی لیکن محمد اقبال بہت پہلے حتیٰ کہ سیالکوٹ ہی سے فارسی میں شعر کہہ رہے تھے۔ گویا فارسی آپ ہی آپ ان کی زبان بن رہی تھی۔

۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک محمد اقبال نے جو کچھ کہا اگر اسے ان کی شاعری کے ابتدائی دور سے تعبیر کیا جائے تو ہم اسے یہ کہہ کر بھی کہ ابتداء ہر حالت میں ابتداء ہوتی ہے ابتداء کو اتنا کے مقابلے میں کیسے لایا جا سکتا ہے، نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس ابتدائی دور میں بھی ان کا شمار

ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ گواہی رنگ سخن وہی تھا جو اس زمانے میں عام طور پر غزل کا، لیکن اس کے باوجود تکلف اور تصنیع سے خالی۔ نہ قافیہ پیائی ہے، نہ خیال آرائی۔ یہ کلام ایک ایسے نوجوان شاعر کا ہے جس نے ابھی بزم سخن میں قدم رکھا تھا۔ جس کے دل و دماغ کو شاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ جو اس کی قدرت پیانی اور حسن ادا کا آئینہ دار ہے۔ جس میں آمد ہی آمد ہے۔ آور دنیہیں ہے بیساختہ پن ہے۔ سادہ سے جذبات ہیں۔ ان میں شوٹی بھی ہے، رندی بھی مضمون آفرینی بھی۔ یہ زمانہ محمد اقبال کے عقفوں شباب کا تھا۔ محمد اقبال کا دل بھی حسن و عشق کی رنگینیوں کی طرف کھجتا۔ محمد اقبال کا گزر بھی ان مشاہدات اور تجربات سے ہو رہا تھا جو اس عمر کا خاصہ ہیں۔ وہ اپنے احساسات اور تاثرات کا اظہار غزل ہی میں کر سکتے تھے۔ پھر یہ اس زمانے ہی کی نہیں اسلامی مشرق کی صدیوں سے روشن تھی کہ ہم اپنے احوال و واردات، خیالات اور تصورات کی ترجمانی غزل میں کریں۔ شاعری گویا سمٹ کر غزل میں آگئی تھی۔ محمد اقبال نے بھی ایسا ہی کیا۔ محمد اقبال کی شاعری کا آغاز بھی غزل سے ہوا۔ لیکن ان کے فکر و وجدان کا تو اس دور میں بھی اظہار ہونے لگا تھا۔ اس دور کی غزوں میں بھی ان کا احساس ذات ابھر رہا ہے، شعور میں گہرا تی اور نظر میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ عارفانہ اور صوفیانہ مضامین کے ساتھ ساتھ وہ اشعار بھی ہیں جن کا سرچشمہ ہے ایمان و یقین، جن میں کہیں کہیں مستقبل کے شاعر کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ لیکن ابتداء بہر حال ابتداء ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ ابتداء انتہا کو پہنچ گئی۔ محمد اقبال کی شاعری کے دور اول کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

بانگ درا کا حصہ اول، ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۷ء جس سے محمد اقبال کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا نظموں پر مشتمل ہے۔ غزلیں ان کے علاوہ۔ نظموں میں کچھ بچوں کے لیے لکھی گئیں، کچھ جذبہ حب الوطنی اور کچھ مناظر فطرت کے زیر اثر۔ بعض کی نوعیت ملی ہے۔ بعض کا موضوع زندگی، انسان، کائنات کچھ اپنی ذات، کچھ اپنے احوال اور واردات کے بیان میں۔ کچھ ترجمے ہیں۔ ایسے کامیاب کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس معاملے میں نادر مرحوم ہی ان کے قریب پہنچے ہیں۔ بچوں کی نظمیں اگرچہ مانوڑ ہیں۔ بجز ایک پرندے کی فریاد کے، مگر انھیں بھی اس خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے، زبان ایسی سلیمانی اور سادہ ہے، بچوں کی نفسیات کے عین طابق کے بچے ان کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ مزے لے لے کر پڑتے ہیں۔ بڑے بوڑھے بھی لطف اندوڑ ہوتے ہیں۔ گویا ان نظموں کی وہ کیفیت نہیں جو عام طور پر بچوں کے لیے

لکھی گئی نظموں کی ہوتی ہے۔ ان میں بچوں کے اخلاق و عادات اور دل و دماغ کی پروپریٹی کے لیے اتنا کچھ موجود ہے کہ استاد چاہے تو تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ آئندہ زندگی کے لیے بھی ان کے ذہن کا رُخ بڑے بڑے عزم اور مقاصد کی طرف موڑ دے۔ مکڑا کیسا عیار ہے۔ مکھی کو خوشامد پسندی موت کے منہ میں لے گئی۔ گلہری نے سچ کہا تھا دنیا میں کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ بکری کی نصیحت بھی کیا خوب ہے کہ گائے کو محنت مشق تلو کرنا پڑتی ہے مگر اس کے عوض اس کی دلکشی بھال بھی ہو رہی ہے۔ سچ کہا ہے جس نے کہا، دکھ کے بعد سکھ۔ جگنو کی مثال سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمدردی کے معنی ہیں دوسروں کی بلا مزد خدمت، رہی دعا سوارش پاک و ہند کا شاید ہی کوئی مدرسہ ہو جہاں تعلیم سے پہلے یا کسی تقریب کی ابتداء میں اس نظم کو پڑھانہ جاتا ہو اور شاید اب بھی کہیں پڑھی جاتی ہے۔ اس کی بحر بھی کیا خوب ہے۔ دھن بھی کیسی خوب کہ بچ آپ ہی آپ اسے الا پتے ہیں۔ سننے والے لطف اٹھاتے ہیں۔

بیگم بھوپال، نواب سلطان جہاں بیگم دسترخوان پڑھتی ہیں۔ طرح طرح کے خوان نعمت سامنے رکھے ہیں۔ ان میں پرندوں کا گوشت بھی ہے۔ کچھ بھنے ہوئے پرند بھی۔ کچھ نو گرفقار پنجروں میں بند شاید پاس ہی رکھے ہیں۔ محمد اقبال کا ذکر تھا، یا نہیں معلوم کیے اور کیوں کسی کی زبان پر ”ایک پرندے کی فریاد“ کے چند اشعار آگئے۔ بیگم صاحبہ سن رہی تھیں:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرा ہوا زمانہ

گزرہ ہوا زمانہ کے یاد نہیں آتا۔ قید و بند کی بھی تو ایک ہی شکل نہیں کہ انسان پرندوں کی طرح نفس میں بند ہو۔ ایک لحاظ سے ساری زندگی قید ہی قید ہے۔ بقول مرتضیٰ غائب:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

ایک قید سے ذہن دوسری قید کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قید سے رہائی کون نہیں چاہتا۔ بیگم صاحب نے فرمایا پوری نظم سنیں گی۔ نظم سنی تو اس قدر متاثر ہوئیں کہ حکم دیا ان کے یہاں جتنے پرند ہیں سب کو آزاد کر دیا جائے۔ تتمیل حکم میں در نہیں لگی پنجروں کے درکھول دیے گئے۔ پرند پھر پھرائے باہر نکلے۔ آسمان کا رُخ کیا اور اڑ گئے۔ یہ تھا محمد اقبال کی شاعری کا ایک ادنی سما کر کشمہ۔ ۱۵

محمد اقبال نے بچوں کی نظیں کیوں لکھی۔ ان سے شاید ایسی کوئی فرمائش بھی نہیں کی گئی۔ مگر ان نظموں سے گو ماخذ ہیں جہاں خود ان کے ذہن کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ کیا بن چکے تھے

کیا بن رہے اور کیا بننا چاہتے تھے، وہاں بچوں کی تعلیم و تربیت سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم کہ ان نظموں کے ذریعے گویا اپنی سوچ ان کے دل میں ڈال رہے ہیں۔ چاہتے ہیں ان میں زندگی کا شعور پیدا ہو۔ کچھ بننے کی آرزو، عزم، مقاصد۔

وطن سے محمد اقبال کو بڑی محبت ہے۔ ہندوستان جنتِ نشان ہے۔ کیا عظیم، کس قدر وسیع، کیا خوبصورت۔ اس کی وسعتوں نے کیا کچھ اپنے اندر نہیں لے رکھا۔ بڑے بڑے دریا، طویل و عریض میدان، بلند و بالا کو ہستانی سلسلے۔ جنگل، صحراء، مرغزار۔ ہندوستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ ہندوستان میں دولت ہی دولت ہے۔ محمد اقبال نے ابھی پنجاب کے دو ایک شہروں ہی میں قدم رکھا تھا۔ ہندوستان کے اطراف واکناف میں کہیں نہیں گئے تھے۔ لیکن ان کا گزر خیال ہی خیال میں اس کے اضلاع و اقطاع سے ہو رہا تھا۔ سوچتے تھے قدرت نے اسے کیسی کیسی نعمتیں عطا کی ہیں۔ قدرت اس پر کس قدر مہربان ہے۔ یہاں کیا نہیں ہے۔ سر زبردی، شادابی، ہرے بھرے کھیت، لہلہتی ہوئی فصلیں۔ حسن مناظر فطرت کی رنگینیاں۔ ان کا تنوع، گوناں گونی، سمندر، ساحل، وادیاں اور ہمالا!

**گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں**

**گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناب ہمارا**

وطن کی محبت کس دل میں نہیں ہوتی۔ مگر ایک ایسے ملک کی محبت جو صدیوں سے ہمارا وطن ہے، جس کا ماضی بڑا عظیم تھا۔ جس کے حال نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا اس ملک کی محبت کیوں سرد پڑ گئی۔ ہمارے جذبہ حب کو کیا ہوا۔ حب الوطنی کا تقاضہ ہے، اتحاد، ارتباط، خیر خواہی، رواداری۔ لیکن یہاں تعصُّب اور تنگ دلی ہے۔ یہ وصل ہے یا ”قرب فراق آمیز“، ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، یاد نہیں۔ کیا ہیں؟

**شمشاہ گل کا بیری گل یامین کا دُمن**

**ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے**

محمد اقبال نے وطن کو اس حال میں دیکھا۔ تعصُّب، تنگ نظری اور نزاع و جدال کی اس فضَا کو جو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر کہیں چھارہ تھی تو اس کے تباہ کن متاثر کا دکھ بھرا احساس ایک ”صدائے درد“ بن کر ان کے دل سے نکلا۔  
انھوں نے بافسوس کہا:

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

کب زبان کھولی ہماری طاقتِ گفتار نے  
پھونک ڈالا جب چن کو آتش پیکار نے  
محمد اقبال کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ وطن کو آزاد، خوش حال اور فتنہ اور فساد سے  
پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا دل اس کی غلامی پر کڑھتا۔ غلامی نے اسے رہنے کے قابل نہ رکھا:  
چن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

محمد اقبال نے ”تصویر درد“ لکھی۔ خطاب اہل وطن سے ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں  
سب سے۔ ہم کیوں نہیں سوچتے ہمارا گزر کئی حالات سے ہو رہا ہے۔ زمانہ کدھر جا رہا ہے۔  
فطرت کیا چاہتی ہے۔ قوموں کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ہمارا سیاسی شعور بیدار نہ ہوا تو کیا ہو گا۔ یہ  
غفلت اور کرم ناگھی، یہ تھائق سے بے خبری جس طرح پہلے نکبت و ادبار کی طرف لے گئی بعینہ آج  
بھی خوست اور ہلاکت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہمارے لیے خطرات ہی خطرات ہیں:

چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے  
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں  
یہ غفلت اور بے خبری! تاکے کاش ہماری لگا ہیں وطن پر ہوتیں۔ ہم دیکھتے وطن کس حال  
میں ہے۔ محمد اقبال کو بافسوس کہنا پڑا

میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

”تصویر درد“ محمد اقبال کی سیاسی بصیرت محمد اقبال کی وطن دوستی، محمد اقبال کی وسیع المشربی  
کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ محمد اقبال نے انسان اور انسانیت کے نام پر، اخلاق اور روحانیت کا  
واسطہ دے کر، سیاست اور جہاں بانی کی حقیقی روح کے حوالے سے ان خیالات کو چھیڑا، ان  
قدروں کو ابھارا جن سے زندگی کا حسن قائم ہے۔ جو قوموں کی تقویم کا راز ہیں۔ جن کا تقاضا  
ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے رُگ و ریشے میں انسان کی انسان کے لیے دردمندی اور دلسوzi  
کی روح سرایت کر گئی ہو۔ جس کا خمیر محبت سے اٹھایا جائے:

شراب روح پرور ہے محبت نوع انسان کی  
محبت ہی انسان کے دکھ درد کی دوا ہے۔ محبت ہی فساد اخلاق اور آلام و اسقام روحانی کے  
لیے نستہ شفقا۔ محبت ہی ہماری نفسیاتی بیماریوں، ہمارے نزاع و جدال کا مداوا، محبت ہی وہ اکسیر  
ہے جس سے افراد ہوں، یا اقوام ان کے زنگ آ لوں قلوب میں جلا پیدا ہوتی ہے اور یہی اکسیر اہل

### وطن کی سب سے بڑی ضرورت:

محبت ہی سے پائی ہے شفا یا پار قوموں نے  
کیا ہے اپنے بخت خفته کو بیدار قوموں نے  
”تصویر درد“ ہو یا محمد اقبال کی نام نہاد قومی اور وطنی نظمیں۔ آج ان کی تعبیر کسی رنگ میں  
کی جائے یہاں اس سے بحث نہیں۔ بحث ہے تو اس امر سے کہ یہی نظمیں ہیں جن سے  
نو اجوانوں کا احساس قومی بیداری ہوا۔ ان کے دل میں حب الوطنی کے جذبات کو تحریک ہوئی۔  
یہ سوچ ابھری کہ ملت و مذہب کا امیاز اپنی جگہ پر مسلم، مگر ہندوستان کا مستقبل کسی ایسے سیاسی  
نصب اعین سے وابستہ ہے جو انسان اور انسانیت کے شایان شان ہو۔ لیکن ہم میں نزاع و  
جدال ہے کیوں؟ کیا اس کی بنا ہے، مذہب:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں یہ رکھنا  
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا  
ہندوؤں کا، مسلمانوں کا، ہر اس شخص کا عیسائی ہو، یہودی ہو، یا پارسی اس کا۔ محمد اقبال نے نیا  
شوالہ لکھا۔ روئے خحن ہندوؤں کی طرف ہے۔ ہندوؤں کو انھیں کے اخلاقی اور روحانی آدروں  
کے نام سے یاد دلایا کہ دلیش بھگت کی ریت میں اگر بھگت کے ساتھ شانتی بھی ہے تو شانتی کا تقاضا  
ہے پریت۔ دلیش بھگت نہیں بھولیں:

بھارت کے باسیوں کی کمتوں پریت میں ہے  
محمد اقبال نے ”ترانہ ہندی“ لکھا۔ کیسا دل کش، کیسا دلہ اگنیز جس کا جواب آج تک نہ ہو  
سکا۔ ”ترانہ ہندی“ نے ان خیالات اور ان جذبات کی ترجمانی کس خوبی سے کی ہے جو وطن کی  
محبت میں دلوں کو چھیڑ رہے تھے لیکن جن کے اظہار کا کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔ ”ترانہ ہندی“ کی  
اُردو تو کیا ہندوستان کی کسی زبان میں مثال نہیں ملتی۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت کبھی ایسا ہی  
ایک ترانہ ہے۔ گیت کا گیت اور ہندوستان کی عظمت، اس کی تہذیبی، ذہنی اور روحانی سر بلندی  
کی داستان۔ ہندوستان کے حسن و دل کشی کا کیا کہنا:

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا  
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا  
جس کا ماضی بڑا عظیم تھا۔ علم و حکمت کی کیسی بلندیاں تھیں جو اس نے طے نہیں کیں۔

دنیا نے اس سے کیا کچھ نہیں لیا:

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا  
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا  
جہاں ترک آئے، تاتاری آئے، ایرانی آئے۔ پارسی غریب الوطن تھے مگر کس آب و  
تاب سے چکے:

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے

پھرتاب دے کے جس نے چکائے کہکشاں سے

جہاں وحدت کی لے اٹھی۔ جس نے ناک کا گیت سنा۔ جہاں خواجہ ابی ہبیر پیغام حق لے  
کر آئے۔ جس کا مسلمانوں نے قافلہ در قفلہ رُخ کیا۔ جس سے اسلام کو بڑی توقعات ہیں:  
میر عرب<sup>۱</sup> کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

محمد اقبال نے یہ گیت کچھ ایسے میٹھے سروں میں گائے۔ ان میں کچھ ایسا خلوص اور صداقت  
تھی۔ لمحن ایسا دل کش کہ سننے والوں کے دلوں میں اتر گئے۔ محمد اقبال کی ان نظموں نے دلوں کو  
گرمایا۔ حب الوطنی کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ وہ جذبہ جس کی روح خالصًا انسانی تھی۔ لہذا ہندو  
ہوں، یا مسلمان ان نظموں کو دلی شوق سے پڑھتے۔ محمد اقبال کی حب الوطنی ہر کہیں اعتراض  
ہونے لگا۔ ان کی ہر دعیزی اور قدرو منزلت بڑھتی چلی گئی۔ شہرت کا یہ عالم کہ اطراف و  
اکناف ہند میں پھیلتے پھیلتے راس کماری تک جا چکی۔ ترانہ ہندی، ایسا مقبول ہوا کہ سرکار نظام  
کے ایک اہل کار نے اسے نیل گری کی پہاڑیوں میں چڑواہوں سے گاتے سناء۔ ۱۹۲۶-۲۷ء  
میں پنڈت مدن موہن مالویہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آئے۔ بچوں نے ان کا خیر مقدمہ تراہہ  
ہندی سے کیا۔ پنڈت جی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک شعر پڑھو متنے۔ دونوں ہاتھ آسمان کی  
طرف اٹھاتے۔ ہلا ہلا کر بار بار اشارہ کرتے؛ پڑھو، پھر پڑھو۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں: ”۳ جولائی  
۱۹۰۷ء۔ آج لندن میں ایک مذاکرے کا اہتمام تھا جس میں لندن میں مقیم بہت سے ہندوستانی  
شرکیک ہوئے کچھ خلوں اور ایک مجملے می خزن کا ذکر کیا۔ ۱۷ پھر اس مجملے کے کچھ گیت سنائے۔  
یہ حب الوطنی میں اقبال کی نظمیں تھیں جو اس نے کہا سارے شمالی ہندوستان میں پڑھی جاتی  
ہیں۔ گھر، بازار، گلی کوچے ان قومی گیتوں سے گونخ رہے ہیں۔ ان سے قومیت کا وہ احساس پیدا  
ہوا جس سے ہندوستان اس سے پہلے نا آشنا تھا۔ پریشور لال کی ان باتوں سے مجمع اس قدر

جو شی میں آیا کہ سب نے مل کر مسخرن کے ان لیتوں کو گانا شروع کر دیا۔ ہالِ اقبال کے اشعار سے گونج اٹھا۔“ یہاں اس امر کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ اس صدی کے دوسرے عشرے میں ایک جمن مصنف نے ہندوستان کے عوام سے ایک کتاب لکھی تو اس کی ابتداء محمد اقبال کی نظم ہمالہ سے کی۔ ۲۱۸ یہ محمد اقبال کے کلام کا شاید اولیں ترجمہ ہے جو کسی غیر زبان میں ہوا، جمن میں۔ اندازہ کیجیے اس جمن مصنف نے ہندوستان کا تعارف اپنے اہل ملک سے کرایا تو اسے محمد اقبال کی اس نظم سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ملی جس سے وہ اپنی کتاب کی ابتداء کرتا۔

مناظر فطرت میں محمد اقبال کے لیے بڑی کشش ہے۔ عالم فطرت کی منظر کشی یا اصلاحاً قدرتی شاعری میں ”ہمالہ“ محمد اقبال کی پہلی نظم ہے۔ محمد اقبال نے بالائے قلعے سیالکوٹ سے جب ان کی نگاہیں شمال مغربی جانب میں پھیلے ہوئے سلسلہ کوہ اور اس کی برف پوش چوٹیوں کو دیکھتیں اگرچہ خیال ہی خیال میں ہمالہ کا نظارہ کیا تھا۔ لیکن ان کی قوت تخلیہ کا یہ عالم ہے، محركات کی یہ خوبی جیسے ہمالہ اپنی ساری دل کشی اور گناہوں مناظر کو لیے ان کے سامنے ہے۔ حتیٰ کہ قاری کی آنکھوں میں بھی ہمالہ کی فلک بوس چوٹیوں، ہواوں کے طوفانوں، برف کے ریلوں، گھنے جنگلوں، سر سبز اور شاداب وادیوں، ان کی رنگین فضاؤں، پھلوں پھلوں، ندیوں اور آبشاروں کی تصویر پھر جاتی ہے۔ محمد اقبال ادھر ادھر بہتی، پھر وہ اور چٹانوں سے گلکراتی ہوئی نہروں کے سریلے گیت سنتے۔ شام کی خاموشی میں درختوں کو دیکھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے درخت کسی سوچ میں کھڑے ہیں۔ ان پر تنگر کا سماں چھار ہا ہے۔ درخت پکھ سوچتے ہوں یا نہیں، محمد اقبال ضرور سوچ رہے تھے کہ انسان کی ابتدائی زندگی کس قدر سادہ تھی۔ اس کی ابتداء شاید ہمالہ کی وادیوں سے ہوئی۔ یہ ابتدائے آفرینش میں انسان کی سادہ زندگی کا تصویر جس پر غازہ رنگ تکلف کا داغ نہ ہوا یک قدرتی مگر رومانی ساجذب ہے جو اکثر دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ محمد اقبال کا جی چاہتا تھا ہمالہ سے اس عہد کی داستان نہیں۔ ذہن بدهمت کی طرف منتقل ہو گیا:

نخ جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں شمر  
پیروان بده کی زندگی کس قدر سادہ تھی۔ آبادیوں سے دور پہاڑوں اور جنگلوں کا رخ  
کرتے۔ ہر کسی کو سادگی کا سبق دیتے۔ مگر پھر ہمایہ ہی پر کیا موقوف ہے، محفل قدرت میں ہر

کہیں حسن ہی حسن ہے:

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایان حسن  
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن

حسن کہاں نہیں ہے۔ محمد اقبال کی حساس اور فلسفہ پسند طبیعت نے جہاں کہیں حسن و  
جمال کی جھلک دیکھی ذہن میں فکر و وجدان کے دریچے کھل گئے۔ بزم قدرت کی رنگینیوں، اس  
کی زیبائی اور دل کشی کا نظارہ کیا تو خیال آیا انسان میں یہ حسن و رعنائی کہاں۔ خود ہی سمجھ گئے  
فطرت کا حسن اور زیبائی غیر کا محتاج ہے۔ انسان آزاد ہے۔ انسان اپنی حقیقت کو پالے تو سیہ  
نختی اور سیہ روزی کا شکوہ نہ کرے۔ ابر کو ہسار کو امنڈتے ہوئے دیکھا۔ پہاڑوں اور میدانوں  
پر چھا گیا۔ دشت و در میں برسا، جل تھل ہو گیا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ زندگی نام ہے فیض  
رسانی کا۔ ماہ نو پرنگاہ پڑی۔ ماہ نو کیا ہے؟ کسی خورشید کا کوئی ٹوٹا ہوا گلزار، عروس شام کی بائی،  
طشت گردوں سے شفق کا ٹپکا ہوا خون؟ نیل کے پانی میں سیم خام کی تیرتی ہوئی چھلی یا قدرت  
کے نشر نے آفتاب کی فصل کھول دی ہے۔ ماہ نو کہاں جا رہا ہے؟ ماہ نو کو نور طلب ہے۔ محمد اقبال  
بھی نور کے طالب ہیں۔ گل پر مردہ نظر آیا تو معلوم نہیں وہ کیا احساس تھا جس نے ان سے یہ

شعر کہلوایا:

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو  
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو  
یہی ذات انسانی کی ناتمامی، نارسانی، محرومی اور بے بصاعتی کی آتی جاتی کیفیات کا کوئی  
لحم۔

گل رنگین کیا خوب ہے۔ رنگ و بوكا پیکر۔ اس کے لیے کوئی پریشانی ہے، نہ عقدہ مشکل  
خود آگہی سے محروم سوزبانوں پر بھی چپ۔ گل رنگین کو جمعیت خاطر حاصل ہے۔ انسان  
جمعیت خاطر سے محروم ہے۔ تلاش و طلب میں سرگردان۔ اس کے لیے کوئی پریشانیاں ہیں، کسی  
عقدہ ہائے مشکل۔ مگر یہ پریشانیاں، یہ عقدہ ہائے مشکل ہی تو اس کی عقل و فکر کے لیے مہیز  
ہیں۔ تو سن ادراک کے لیے خرام آموز۔ آفتاب صبح بھی اگر ہنگامہ عالم کی زحمت کش نہیں تو نہ  
ہی۔ اس میں فضیلت کی کیا بات ہے۔ آفتاب بھی تو اپنے آپ سے ناخشم ہے۔ خاک آدم  
کے ایک ذرے کا ہمسر نہیں۔ انسان ہی وہ ہستی ہے جس کے سینے میں دل ہے۔ جسے نور حقیقت

کی آرزو ہے، جو ذوق طلب کا شناسا ہے، جسے راز قدرت کی جتو ہے، جس کو درستفہام ملا ہے، جسمی لاحصل سے لطف اندو ہوتا ہے۔ محمد اقبال کو عالم فطرت پر انسان کی برتری کا شعور ہے لیکن عالم فطرت میں بھی زندگی کے لیے کئی سبق ہیں۔ موج دریا کو دیکھیے۔ تنگی دریا کی شاکی، فرقہ بحر میں پریشان، بہتی چلی جا رہی ہے۔ انسان بھی بایس ہمہ وسعت و پہنائی عالم کون و مکان میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ موج دریا کی طرح منزل مقصود کی طلب میں پریشان ہے۔ صبح کا ستارا مش و قمر کا ہمسایہ ہے، مگر روز کے طلوع و غروب، گویا روز کے مرنے جینے سے نگ آ گیا ہے۔ حیات ابدی کا آرزو مند ہے۔ سوچتا ہے یہ ہوتا، وہ ہوتا، ستارا نہ ہوتا۔ بالآخر معلوم ہوا حیات ابدی کا راز ہے سوز عشق، اس سوز میں مر ٹنا۔

پھر یہ مناظر فطرت کی رنگینیاں، اس کا حسن اور دل کشی ہی تھی جس سے محمد اقبال کے فکر و وجہان کو تحریک ہوتی وہ اس کی ہرشے سے متاثر ہوتے۔ سوچنے حقیقت کیا ہے؟ اس کے کسی پہلو سے پرده اٹھاتے۔ اپنے احساسات اور جذبات کی ترجیحاتی کرتے۔ پروانے کو دیکھا، ذرا سا کیڑا اور روشنی کی تمنا، روشنی پر مر مٹا ہے۔ خیال آیا یہ تمنا تو انسان کے دل میں ہونی چاہیے۔ بچہ شمع کو تک رہا ہے۔ کس انہاک اور کس حرمت سے۔ شاید کسی دیکھی ہوئی شے کو پہچان رہا ہے۔ ذہن افلاطون کے نظریہ علم کی طرف منتقل ہو گیا کہ علم عبارت ہے یاد سے۔ انسان کو زندگی ملی۔ زندگی گویا خواب ہے خود فراموشی ہے۔ دیکھی ہوئی شے کو بھول گیا۔ اسے کھو دیا۔ اب روح اس کھوئی ہوئی شے کو تلاش کر رہی ہے۔ ورنہ شمع کیا کائنات کے ذرے ذرے میں حسن ہے۔ حسن کا جلوہ عام ہے۔ لیکن وہ نہیں تو روح کو حسن کے اس عام جلوے میں بھی آرام نہیں۔

طفل شیر خوار نے ہاتھ میں چاقو لے رکھا تھا۔ محمد اقبال نے چاقو چھین لیا کہ اسے گزندہ پہنچے۔ طفل شیر خوار نے گا۔ محمد اقبال کو تجھ ہوا یہ بچوں کو دکھ دینے والی چیزوں سے پیار، یہ شرار آرزو، یہ قید امتیاز سے آزادی، یہ ان کے کھلونے، یہ ان کا بگزنا، کوئی چھوٹی سی چیز لے کر من جانا۔ یہ تلوں، یہ باتیں بچوں ہی سے تو مخصوص نہیں، ہم بھی ایسے ہی تلوں آشنا ہیں۔ عارضی لذت کے شیدا۔ ادھر خفا ہوئے ادھر من گئے۔ حسن ظاہری پر جان دیتے ہیں۔ بچوں کی طرح کبھی گریاں، کبھی خندال ہمیں بھی طفل ناداں ہی کہیے۔ سر شام ایک پرندے کو دیکھا شاخ پر بیٹھا چپھا رہا تھا۔ جگنو نظر آیا تو اس کی طرف لپکا۔ نہیں سمجھا کہ جگنو کو چک ملی ہے تو اسے چپک۔ ادھر سوز ہے، ادھر ساز۔ سوز ساز کا حریف نہیں۔ بزم ہستی میں ہرشے دوسری سے ہم آہنگ ہے اور

یہی ہم آہنگی اس کے وجود کا سہارا۔ جگنو کیسی پیاری نظم ہے۔ زبان کی لطافت، سلاست اور رواني۔ حسن بیان، الفاظ کا دروبست، موسیقیت۔ موضوع ہے محسوسات کی وحدت، جس کے لیے کسی کیسی تشبیہات لائے ہیں۔ کیسے کیسے استعارے۔ محمد اقبال کے کمال فن کی دلیل۔ قدرت نے جگنو، ہی کوئی نہیں ہر شے کو دلیری دے رکھی ہے۔ کہیں چمک ہے، کہیں پیش، کہیں رنگیں نوائی، کہیں خاموشی، کہیں شفق کی سرخی، کہیں صبح کا بالکپن، کہیں ہوا کی پرواز، کہیں پانی کی رواني، موجودوں کی بے کلی۔ سب ایک دوسرے سے مختلف۔ ہمارے لیے وجہ امتیاز:

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری

جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسن ازل کی جھلک کھال نہیں ہے۔ یہ کہیں خن ہے، کہیں چمک۔ کہیں چمک ہے، کہیں درد کی کسک:

یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا

واس چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کمک ہے

نغمہ بوئے بلبل ہے، بوپھول کی مہک۔ وحدت کثرت میں گم ہے۔ اختلاف فریب نظر لیکن کیسا ہنگامہ زا، ایسا کیوں ہے؟ محمد اقبال جگنو کی شب تابی سے لطف اندوز ہوئے۔ اس کے لیے ایک نہیں کئی تشبیہیں لائے پھران کے فکرو وجدان نے کس خوبی سے فلسفہ اور فلسفہ سے تصوف کا رخ کیا۔ اس تصوف کا جسے فطرت سے تحریک ہوتی ہے اور جس کی تان بالآخر انسان پر ٹوٹی ہے۔

شمع بھی جگنو کی طرح ایک ایسی ہی نظم ہے۔ لیکن کہیں زیادہ بلند، کہیں زیادہ پرتا شیر اردو میں اس سے پہلے ایسی کوئی نظم شاید ہی لکھی گئی ہو۔ شاید ہی کہیں فلسفہ اور تصوف کی آمیزش اس خوبی سے ملے۔ زبان ادق نہیں مگر شاعر کا بدلہ ہوا بلب وہجہ غالب سے مشابہ ہے۔ پھر اس کا حسن بیان ہے، خیالات کی چیختگی، مضامین کی بلندی، سوز و گداز، فارسی ترکیبات، اشارات اور کنایات۔ پوری نظم اردو کی عام روش سے ہٹی ہوئی۔ عبدالقدار کو اشاعت سے پہلے ایک شذرہ لکھنا پڑا۔ مسئلہ وہی انسان کا ہے، اس کی حقیقت مبداء و منتها کا جسے محمد اقبال نے ایک نئے انداز میں چھیڑا۔ جو کچھ کہا دل کی گہرا یوں میں اتر کر اس شدت احساس اور درد و کرب کے ساتھ ہے آشوب آگئی کہیے۔ کچھ کہیے، ذات انسانی کی ناتماںی سے تعبیر کیجیے۔ خیال آیا کہیں

بات بڑھنے جائے۔ دارورون تک نہ جا پہنچے۔ شمع ۱۹۰۲ء میں لکھی گئی۔ ۱۹۰۲ء تک محمد اقبال غزل ہی لکھ رہے تھے۔ نظم کا آغاز اس سے کچھ پہلے یا ۱۹۰۰ء میں ہوا۔ محمد اقبال کا گزرو برس ہی کے اندر شاعری کی کیسی بلندیوں سے ہو رہا تھا۔

ایک آرزو بھی شمع کے ساتھ ۱۹۰۲ء ہی میں شائع ہوئی۔ عبدالقارنے نے لکھا: ”یہ دنیمیں جو ہمیں اتفاقاً دستیاب ہو گئیں طرز ادا اور بندش میں ایک دوسرا سے مختلف ہیں۔ ایک غالب مرحوم کے انداز کا نمونہ، دوسری سبک روی میں برق، سادہ الفاظ کا جامہ پہنے، اضافتوں کے زیر سے خالی..... ایک کے خیالات عمده اور دقيق..... ذہن کو فکر سے دست و گریاں ہونا پڑتا ہے۔ معانی ذہن میں آ آ کر دامن چھڑاتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں:

پیاوید گر این جا بود زبان دانے  
غريب شهر سخن ہائے گفتني دارد

ایک فلسفہ اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زن۔ دوسری تصویر کے پر لگائے کوہ و بیباں اور باغ و راغ کی سیر میں مصروف ہے..... ہم ان دونوں کو یک جا چھاپتے ہیں تاکہ مصنف کے دونوں رنگوں کا اندازہ ہو جائے۔ جب کئی لوگوں نے اقبال کی مشکل پسندی کی شکایت کی..... تو انہوں نے جواب دیا۔ ”..... جہاں خیالات دقيق اور مشکل ہوں گے وہاں زبان کا آسان ہونا دشوار ہے۔“ پھر قطع نظر اس امر سے کہ ”ایک آرزو“ کا شماراً قابل کی نام نہاد تو می اور عطنی نظموں میں بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ آخر بند میں اہل وطن کے افزاں و شفاہ کا شکوہ بخست و افسوس کیا گیا ہے۔ پوری نظم محمد اقبال کے کمال فن کا کیسا دلکش نمونہ ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ تشبیہات اور محکمات کی خوبی۔ پھر تخلی کی بلندی، قدرتی مناظر کی طرح واردات قلب کا ایک خارجی پیکر میں اظہار۔ محمد اقبال اردو شاعری کو ایک نیا پیرا یہ بیان دے رہے تھے۔

”در عشق“ بھی ایک ایسی ہی فکر انگیز نظم ہے جو بہت کچھ قطع و برید کے ساتھ بانگ درا میں شامل کی گئی۔ عشق کا تعلق محمد اقبال کے بنیادی تصورات سے ہے۔ یہ تصور بھی خودی کی طرح کب سے ان کی شاعری میں ابھر رہا تھا، لیکن خودی کی طرح رفتہ رفتہ ہی پورے طور پر مشکل ہوتا۔ محمد اقبال محسوس کرتے ہیں کہ در عشق کا ہر کوئی اہل نہیں۔ یوں کہیے کہ ہر کوئی عشق کا دعویدار ہے۔ عاشقی ایک رسم ہے، ایسی ہی عام جیسے زندگی۔ شاعری عشق و عاشقی ہی کا بیان ہے۔ ہر مرد

وزن کی اپنی اپنی داستان۔ لیکن وہ عشق جو عین زندگی ہے، کہاں ہے۔ اسے کون سمجھتا ہے۔ علم بھی اس کی کنہ کو نہیں پہنچتا۔ اس پر یہ دور غرض مندی، یہ خود نمائی۔ یہ دور عشق کے لیے سازگار نہیں:

یہ دور کلتہ چیل ہے کہیں چھپ کر بیٹھ رہ  
جس دل میں تو ملیں ہے وہیں چھپ کر بیٹھ رہ

دول، فریادِ امت کا ایک بند ہے۔ عقل اور دل اس نظم کا قطعہ بند جو محمد اقبال نے پیغام بیعت کے جواب میں بطور ایک خط کے لکھی۔ ان کے بڑے بھائی کا خیال تھا محمد اقبال کو مرزا غلام احمد کی دعوت قبول کر لینی چاہیے۔ یہ نظم طویل ہے اور اس کا جواب جو میر حامد شاہ لکھا۔ میر حسن کے رشتے میں برادرزاد جن کی محمد اقبال بے حد عزت کرتے تھے اور جن سے انھوں نے کچھ انگریزی بھی پڑھی اس سے طویل تر۔ لیکن یہ نظم جس داستان کی کڑی ہے اس کا ذکر آگئے گا۔ محمد اقبال جیسے جیسے جیسے زندگی میں آگے بڑھے، اس کے بعد دوسرا تجربہ ہوا۔ بچپن کی یاد آئی۔ کسی واقعے یا مشاہدے نے ان کے دل کو چھیڑا تو انھوں نے اپنے احوال و واردات کی ترجمانی بڑے دل نشیں انداز میں کی۔ چنانچہ بچپن میں کی یاد آگئی۔ بچپن میں ماں کی گود ہی ساری کائنات تھی۔ ہر شے نئی معلوم ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ زمین و آسان سے شناسائی بڑھی۔ بگڑتے تو زنجیر در سے دل بہل جاتا۔ پھر جب خود آگئی کا زمان آیا تو عہدِ طفلی ختم ہو گیا۔ ایک روز خفگان خاک سے گزر ہوا۔ وہیں بیٹھ گئے، سوچنے لگے جیسے ان سے خطاب کر رہے ہیں۔ کیا اس دنیا میں بھی جہاں اب ہیں وہ سب کچھ ہے جو اس دنیا میں۔ وہ کچھ کہیں تو شاید اس دنیا کا راز محل جائے۔ زہد اور رندی کی شان نزول عبد القادر بیان کر رکھے ہیں۔ ایک مولوی صاحب ہیں۔ دیکھتے ہیں محمد اقبال کی زندگی میں تضاد ہی تضاد ہے۔ نہیں سمجھتے تضاد بھی ایک طرح سے خاصہ حیات ہے۔ یوں بھی غور کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ذات انسانی ایک معما ہے۔ محمد اقبال نے غلط نہیں کہا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے  
جیسے آگے چل کر

ہے عجب مجموعہ اضداد اے اقبال تو  
آرملڈ نے انگلستان کے لیے رخت سفر باندھا تو محمد اقبال کی طبیعت کئی روز بے قرار رہی۔ نالہ فراق کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور مخزن میں اشاعت کے لیے دی تو اس تہیید

کے ساتھ کہ ”ایک روز تخلی نے آر علڈ کے مکان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے۔ یہ چونکہ ان کی مراجعت وطن پر تاثرات کا دراگنیز اظہارتھا، لہذا سے کسی جسے میں پڑھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ آر علڈ رخصت ہو گئے۔ تو دلی تاثرات کی شدت نے نظم میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔<sup>۲۹</sup> پوری نظم اس محبت اور عقیدت کے جذبات بھری تصویر ہے جو انھیں آر علڈ سے تھی۔ اس کی اشاعت بھی آر علڈ کی مراجعت کے بعد ہوئی۔ کسی الوداعی جسے میں پڑھی نہیں گئی۔ محمد اقبال نے ارادۃ ایسا کیا حالانکہ ایک نہیں کئی الوداعی جسے ہوئے۔ لوگ منتظر ہیں محمد اقبال کوئی نظم پڑھیں گے۔

”سر گزشت آدم“ فی الواقعہ سر گزشت آدم ہے۔ بد و تہذیب و تمدن سے لے کر عصر حاضر تک انسان کا گزر کیسے کیسے ادوار سے ہوا۔ تاریخ کی بھول بھلوں میں کہاں کہاں بھکتا پھرا۔ کیسے کیسے فلسفیوں نے کائنات کی گھٹی سلبھائی۔ ایک کے بعد دوسرا نظریہ قائم ہوا۔ کبھی مذہب نے اس کی رہنمائی کی، کبھی عقل نے۔ عقائد عقل سے تکرارے، بلیسا سائنس سے علم نے برق اور بھاپ پر قابو پالیا۔ عالم فطرت کی تحریر کی۔ دنیا جنت بن گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن راز ہستی کا پتہ نہ چلا۔ نہ یہ کہ خدا کہاں ہے۔ نظر مظاہر پرست تھی، مگر:

ہوئی جو پشمِ مظاہر پرست وا آخر

تو پایا خانہ دل میں اسے مکیں میں نے

آخری بند میں غزل کا سائز ہے۔ یہ بند بانگ درا میں شامل نہیں۔ مثلاً یہ شعر:

نه توڑ میرے دل درد مند کو ظالم

بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگلیں میں نے

ایک اور شعر ہے اور کیا خوب:

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی

سنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے

غزل کا انداز تھا تو مقطع بھی ہو گیا:

عجیب شے ہے صنم خانہ امیر اقبال

میں بت پرست ہوں رکھ دی وہیں جبیں میں نے

محمد عبدالرحمن خاں کہتے ہیں میں نے یہ نظم ایپٹ آباد میں ان کی زبان سے سُنی۔ مجھے

خوب یاد ہے وہ باہر گن میں بیٹھے بڑے دل کش انداز میں یہ نظم پڑھ رہے تھے۔<sup>۲۲</sup> ابرا ایک چھوٹی سی نظم بھی ایبٹ آباد ہی میں لکھی گئی۔ سر بن کی چوٹیاں گھٹاؤں سے سیاہ پوش ہو رہی تھیں۔ محمد اقبال نے اس منظر کو دیکھا تو دل جوش نشاط سے بھر گیا۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ جی چاہا پہاڑوں میں جانکلیں۔

”کنار راوی“، ایک شام کو لکھی گئی۔ محمد اقبال دریا کے کنارے کھڑے تھے۔ نگاہیں ایک طرف خواب گاہ چنتی کے میناروں پر تھیں۔ دوسرا جانب اس کشتبی پر جو سینہ دریا پر روای موجود سے لڑتی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ نظروں سے غائب ہو گئی۔

محمد اقبال نے سوچا موت و حیات کا معاملہ بھی کچھ اس کشتبی کا سما ہے کہ موت سے انسان آنکھوں سے او جھل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات فنا نہیں ہوتی۔

الجاء مسافر درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء میں پڑھی گئی۔ انگلستان جاتے ہوئے، کیسی کیسی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ۔

ٹینی سن، لانگ فیلو اور ایرسن<sup>۲۳</sup> کے ترجیحے کیا خوب ہیں۔ ترجموں پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ محمد اقبال ٹینی سن کے قائل تھے۔ ٹینی سن کی نظم عشق کو موت پر برتری حاصل ہے اس قدر پسند آئی کہ اسے اردو میں منتقل کر دیا۔ پیام صحیح کو خفتگان خاک سے استفسار کا مستزاد کیے۔ رخصت اے بزم جہاں، کو ایک آرزو کا تکملہ۔ معلوم ہوتا ہے لانگ فیلو بھی نیند کو مرگ سبک سے تعییر کرتا۔<sup>۲۴</sup> صحیح ہوتی ہے تو موت زندگی سے بدلت جاتی ہے۔ صحیح ہر شے کے لیے پیام بیداری ہے، انسان، حیوان، کائنات کے لیے ہر شے جی اٹھتی ہے۔ نہیں تو خفتگان خاک۔ وہ اس خواب گراں سے کب اٹھیں گے۔ لانگ فیلو کہتا ہے جب یہ خواب گراں سب کو آ لے گی۔ کس خوبی سے قیامت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک آرزو میں محمد اقبال کو گوشہ عزلت کی طلب تھی۔ جی چاہتا تھا عالم فطرت میں کہیں کنج تہائی مل جائے۔ اس کے حسن و دلکشی میں محو ہو جائیں۔ رخصت اے بزم جہاں، میں تہائی کی یہ آرزو رفاقت سے بدلت گئی۔ ایرسن ٹھیک کہتا ہے فطرت میں رفاقت ہی رفاقت ہے۔ پھول ہیں، بلبل ہے، شمشاد ہے۔ قمری، نرگس شہلا، سبزہ، چیشے سب انسان کے رفیق، ہم نشیں۔ فطرت میں انسان کو وہ کچھ ملتا ہے جو شہروں اور بستیوں میں میسر نہیں آتا، نہ درس گا ہوں میں:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود

گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود  
فطرت ہی اسرار ہستی کی گردہ کشا ہے۔ حقیقت کے فہم میں ہماری رہنمای۔ فطرت سے  
دوری، حقیقت سے دوری ہے۔ اپنے آپ سے دوری خود بیگانے۔

آفتاب 'گاتیری' کا ترجمہ ہے۔ رگ وید کی ایک قدیم اور مشہور دعا کا جسے سرو لیم  
جو نزد ۲۳۳ نے بڑی محنت اور کاؤش سے ڈھونڈ نکلا اور جس کے مغربی زبانوں میں کمی ترجمے کیے  
گئے۔ محمد اقبال کہتے یہ دعا اعتراف عبودیت میں ان تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم  
کے حیرت ناک مظاہرے کے مشاہدے سے اول انسان کے دل میں ہجوم کیا۔ اس قسم کی  
تحریروں کا مطالعہ علم مل و انخل کے عالموں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ ان سے انسان کے  
روحانی نمود کے ابتدائی مرحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دعا چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔  
برہمن اسے اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے پڑھتا نہیں۔ پھر کہتے  
ہیں: "زبان سنسکرت کی چیزیں گیوں کی وجہ سے اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے..... اصل  
سنسکرت میں لفظ 'سوتہ' استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہ ملا۔ ہم نے لفظ  
آفتاب رکھا ہے۔ اس سے مراد وہ آفتاب ہے جو فوق الگوسات ہے اور جس سے یہ مادی  
آفتاب کسب خیا کرتا ہے۔ قدیم قوموں نے اور نیز صوفیانے اللہ تعالیٰ کی ہستی کونور سے تعبیر کیا  
ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے اللہ نور السموات و الارض۔ ۲۳۴ شیخ محمد بن عربی  
فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔  
افلاطون الہی کے مصری بیرونوں ۲۳۵ اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ۲۳۶ ترجمے  
میں اصل الفاظ کی موسیقیت اور وہ طہمانیت آمیز اثر جو اس کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے، اردو  
زبان میں منتقل نہیں ہو سکا۔ 'گاتیری' کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سین کی طرح اشعار میں  
ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علات اور حروف صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی  
موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری  
کی بنا پر میں نے اس ترجمے کی بنا اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نزار ان اپ  
نشدہ گاتیری کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اندیشہ ہے سنسکرت دان اصحاب اس پر وہی رائے  
قائم کریں گے جو جیپ سن ۲۳۷ نے پوپ کا ترجمہ ہو مر پڑھ کر قائم کی تھی۔ شعرو خاصے ہیں  
لیکن یہ 'گاتیری' نہیں ہے۔ پھر اس شعر پر:

ہے محفل وجود کا سامان طراز تو  
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو  
یہ حاشیہ لکھا گیا ہے: ”یزدانِ قدیمِ حکماء ایران نور تصور کرتے ہیں، اس واسطے خالق  
کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا：“

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو  
زاںیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو  
سنکرست میں لفظ دیوتا کے معنی نور کے ہیں، گویا قدیم ہندو بھی دیوتاؤں کو مخلوق تصور  
کرتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہو گا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہندو منہب کو  
شرک کا مجرم گردانا صحیح معلوم نہیں ہوتا،<sup>۲۸</sup>

بانگ درا میں یہ شذرہ حذف کر دیا گیا۔ میری رائے میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن  
یہ ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ محمد اقبال کا مطالعہ جو گویا تکمیل تعلیم سے  
بھی بہت پہلے فارغ التحصیل ہو چکے تھے مذہب، فلسفہ، تصوف، ادیان عالم، تاریخ، شعر و ادب  
اور علوم و معارف میں کس خوبی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ گویا وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان  
کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ بذریعہ لیکن تیزی سے جاری تھا۔ ابن عربی کے حوالے سے سیاکلوٹ  
میں ان کے گھر کی محفلوں اور میر حسن کے درس کا خیال تازہ ہو جاتا ہے۔ املل و انخل سے شہر  
ستانی کی تصنیف کا، افلاطون الہی، اس کے مصری پیروؤں، انبیاء ایران کے ذکر سے ان  
کے ذوق علم، تحقیق و کاوش کا۔ پھر جب وہ سرودیم جونز اور گاٹیری کے مغربی زبانوں میں ترجمے  
کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سنکرست زبان کی پیچیدگیوں، سوتر، سوکت اور دیوتا ایسے الفاظ کا  
ذکر آتا ہے۔ یہ کہتے ہیں ہندو منہب کو شرک کا مجرم گردانا ٹھیک نہیں تو گمان ہوتا ہے ان  
بحثوں میں سوامی رام تیرتوہ کے ساتھ نہ سوتر رہتی ہو گی۔ گاٹیری کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو  
چکا تھا۔ محمد اقبال کے ذوق ادب نے گوارانہ کیا کہ ایسی اہم، معنی خیز اور دلکش دعا کا ترجمہ اُردو  
میں نہ کیا جائے۔

محمد اقبال کے ملی آہنگ کی ابتداء ’نالہ یتیم‘ سے ہوئی۔ ’نالہ یتیم‘ سے پہلے بھی عشق رسول کا  
جذبہ جو محمد اقبال کے دل و دماغ کا صورت گر ہے کسی نہ کسی رنگ میں شعر کا پیکرا اختیار کر لیتا۔  
’نالہ یتیم‘ میں پہلی مرتبہ اس کا اظہار دلی جوش اور عقیدت سے ہوا۔ ’فریاد امت‘ میں اور بھی

شدت اختیار کر لی۔ اگلے سال ۱۹۰۲ء میں انہوں نے بلال کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں کس لگن اور تڑپ سے کہا ہے:

تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی  
کاش وہ خود بلال ہوتے۔ بارگاہ نبوی میں حاضر رہتے۔ صح و شام دولت دیدار میسر آتی۔  
خوشہ وہ دیس کہ پیرب مقام تھا اس کا  
خوشہ وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا  
یوں محمد اقبال کی ساری شاعری رفتہ رفتہ نعمت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ وہ رسمانعت نہیں  
لکھیں گے بجز ایک کے لیکن اس رُخ بدلت دیں گے ۲۲۹

سر سید کی لوح تربت ایک طویل نظم ہے۔ بہت کچھ قطع و برید کے بعد بانگ درا میں شامل ہوئی۔ عبدالقدار کہتے ہیں ”تخیل کے کانوں نے سر سید کی قبر سے وہ صدائے پر درستی جس کی اس دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا، موقع ہو سکتی تھی..... سر سید زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا۔ اس کی لوح تربت سے وہ کلمات اصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسانے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اور جن سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس زمانے میں جب دہلی میں مہمن امجدی کیشتل کانفرنس کے جلسے زور شور سے ہوئے، ان کا شائع ہونا لطف مزید رکھتا ہے۔“ ۳۳۷ محمد اقبال نے یہ نظم شاید اس کانفرنس کی تقریب میں لکھی۔

شاعر کو سر سید کی لوح تربت کا تنبہ کہیے۔ شعر تین ہیں لیکن ان تین اشعار میں محمد اقبال نے کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ قومِ محض ایک مجموعہ افراد نہیں ہے، بلکہ جسم زندہ کی طرح ایک نمود پذیر کل۔ افراد اس کے دست و پا ہیں۔ قوم کی مادی بقا اُخیں کے ہاتھ میں ہے۔ حکومت اس کا چہرہ زیبا۔ پھر شاعر کو دیدہ بینا سے تشیہہ دیتے ہوئے کس خوبی سے حیات میں میں اس کا مقام متعین کیا ہے۔ محمد اقبال کا حقیقت پسند ذہن سیاسی، معاشی، اجتماعی تھاًق سے کبھی غافل نہیں ہوا حتیٰ کہ وہ خوب بھی قوم کے دیدہ بینا بن گئے۔

۱۹۰۱ء میں محمد اقبال نے مرزا آلب کی عظمت فن اور رفتہ تخلیل کے اعتراف میں غالب کے حضور اپنانڈ رانہ عقیدت پیش کیا۔ غالب نے گیسوئے اردو کوسنوار اگیسوئے ادب کو بھی شانہ کشی کی ضرورت ہے۔ محمد اقبال کو افسوس ہوتا ہے کہ غالب دہلی کے ایک گوشے میں آسودہ خاک ہے۔ کسپرسی کی تی کیفیت ہے۔ ادھر اس کا ہم نواگوئے ویر میں کس عزو شان سے سورہا

ہے۔ ۱۹۰۱ء کے بعد مگر، حالی کی زندگی ہی میں حالی سے کہیں بڑھ کر محمد اقبال نے غالب کی عظمت کو پہچانا۔ اسے گوئئے کے پہلو پہ پہلو لاکھڑا کیا۔ غالب سے محمد اقبال کی عقیدت عمر بھر قائم رہی۔ محمد اقبال ۱۹۰۱ء سے پہلے ہی گوئئے کا مطالعہ کر چکے تھے۔ محمد اقبال کی طرح ایک حکیم حیات..... یہ حکیم حیات کی اصطلاح بھی محمد اقبال ہی کی وضع کردہ ہے۔

داغ بظاہر ایک مرثیہ ہے جو داغ ایسے استاد کی موت پر محمد اقبال ایسے شاگرد نے لکھا، لیکن مرثیہ کیا ہے ایک چھوٹی سی مگر نہایت خوبصورت نظم، داغ کی شاعری اور داغ کی شخصیت سیرت و کردار پر ایسا بلخ اور جامع تبصرہ جس کی تفصیل میں ورق کے ورق سیاہ کرنا پڑیں گے۔ شاید داغ کا کوئی قدر ردان اس موضوع پر قلم اٹھائے۔

رہا نالہ یتیم سو محمد اقبال نے اس نظم میں یتیم کی زبان میں حضور رسالت مآب کی شان رسالت کی طرف طرح طرح سے اشارہ کرتے ہوئے:

معنی یہیں ہے تو مفہوم او ادنی ہے تو

جب یہ کھلوایا ہے:

تھی یتیم کچھ ازل سے آشنا اسلام کی  
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی

تو ذہین بے اختیار امت کی یتیم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یتیم ہی کی نہیں امت کی آبروجی حضور رحمۃ للعلمین کے دامان رحمت سے وابستگی سے قائم ہے۔ نذیر احمد نے غلط نہیں کہا تھا نالہ یتیم کو سُن کر میرے دل پر وہ اثر ہوا جو انیں اور دیگر کے مرثیوں کو سن کر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ نالہ یتیم میں شاعر کا ذہن فرد کی بجائے قوم پر مرتعکز ہے لہذا کیا تعجب ہے اس نظم کو سنتے ہوئے حاضرین نے اشک افسانی ہی نہیں زرافشانی بھی خوب خوب کی۔ انہیں حمایت اسلام کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامان رحمت سے وابستگی کا یہی جذبہ ہے جس نے محمد اقبال سے فریاد امت ایسی نظم لکھوائی۔ فریاد امت اقبال کی زبان سے امت کی فریاد بھی ہے اور امت کے لیے دل سوزی اور درد مندی میں محمد اقبال کی صمیم قلب سے نکلی ہوئی دعا بھی۔ انہیں امت کی زبول حالی کا دکھ ہے، امراء کی ہوس زر، واعظوں کے تکبر، تصب اور تنگ دلی، غفلت اور جہالت کا شکوہ کر رہے ہیں۔ قوم کی حالت ایک مریض کی ہے۔ قوم کا چجن پامال خزان ہو چکا

ہے۔ حضور رسالت مآب سے فریاد کرتے ہیں:

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے  
یہ چجن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے  
قاںلہ جس سے روائ ہو سوئے منزل اپنا  
ناقہ وہ کیا ہے وہ آوار درا کون سی ہے  
سب کو دولت کا بھروسہ ہے زمانے میں مگر  
اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

پھر فریادامت، جہاں ایک نعمت ہے جس میں محمد اقبال کا جذبہ حب رسول رہ کر ابھرتا ہے، وہاں یہ اس امر کا ثبوت بھی کہ ان کی دینی تعلیم و تربیت بڑی خوبی سے ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان ابتدائی نظموں میں بھی انہوں نے خودی کی طرح اسلام اور اسلامی الہیات، یا فلسفہ کے کسی ایسے مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کا ذکر بہت آگے چل کر آئے گا۔ مثلاً فریادامت کا ایک شعر ہے:

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل

دیکھ ناداں ذرا آپ سے غافل ہو کر

اس وقت جب یہ نظم پڑھی گئی شاید ہی کوئی سمجھتا ہو کہ یہ ابن عربی کا قول ہے 'الخالق محسوس و العالم معقول'، جس کا تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں "شے بذات" کے بارے میں کائنٹ کے نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے حوالہ دیا اور کہا کہ کائنات کے بارے میں ایک نقطہ نظر وہ بھی ہو سکتا ہے جو شیخ اکبر نے پیش کیا۔<sup>۳۲</sup>

ایک اور نظم درود، یا 'یتیم' کا خطاب ہلال عید سے، جو گویا 'نالہ یتیم' کا مستزاد ہے جس کے متعدد بند ہیں اور اب شام اور مفلسی ایسے عنوانات کے ماتحت ان کے نام نہاد غیر مطبوعہ کلام کے مجموعوں میں جزو اجزاؤ ملے ہیں، بانگ درا میں شامل نہیں۔ ایسے ہی وہ نظم بھی جس کا عنوان ہے دین و دنیا، علی ہذا اسلامیہ کا لجھ کا خطاب مسلمانان پنجاب سے، 'سپاس امیر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں لکھی گئی۔ محمد اقبال کو جناب امیر اور ائمہ اہل بیت سے والہانہ مجتب ہے۔ سپاس امیر، کا آخری بند ۱۸ اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن ان میں سے صرف ۱۳ اشعار بعنوان عشق پیام مشرق میں شامل کیے گئے۔

فکرم جو بمحجوج قدم زد  
در دیر شد و در حرم زد

پھر جناب امیر سے خطاب ہے:

عشق تو دم ربود ناگاہ  
از کار گرہ کشود ناگاہ

محمد اقبال نے اس دور میں غزل لیں بھی لکھی ہیں۔ متعدد غزل لیں بانگ درا میں شامل نہیں۔

اظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ غزل جس کا ایک شعر ہے:

ہو شفقتہ ترے دم سے چمن دھر تمام  
سیر اس باغ کی کر باد سحر کی صورت

یا جس کا مطلع ہے:

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم  
بن کر خیال غیر ترے دل میں آئیں ہم

کیوں خارج کر دی گئیں۔ بعض کا اخراج البتہ سمجھ میں آتا ہے۔ بعض منتخب شکل میں شائع کی گئیں۔ مثلاً وہ غزل جس کی روایت ہے چھوڑ دے اور جس سے یہ شعر:  
بینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ  
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

اس لیے حذف کر دیا گیا کہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ کے بارے میں انہوں نے اپنے خیالات آگے چل کر بوضاحت منضبط کیے۔ بصورت موجودہ اس شعر سے غلط فہمی کا احتمال تھا۔ محمد اقبال تو صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ انتظارِ صفاتِ حیات سے فرار اور بے عملی کا بہانہ بن جائے۔ پھر وہ اشعار بھی ہیں جن سے گویا ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء ہی میں ان کی شاعرانہ عظمت کا سکھہ دلوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ بانگ درا میں شامل نہیں لیکن قوم کے حافظے سے محفوظ ہوں گے۔ جب بھی

محمد اقبال کی شاعری کا ذکر آئے گا ناممکن ہے یہ شعر زبان پر نہ آجائے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے  
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

پھر اس دور میں غزل کا رنگ کس خوبی سے بدلا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں  
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں  
اور یہ شعرو ضربِ اشل بن گئے:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل  
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے  
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں  
اقبال کو یہ ضد ہے کی پینا بھی چھوڑ دے

بانگ درا کے حصہ اول میں غزلوں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ محمد اقبال کا رنگ تغزل  
بتدر تج بدل رہا تھا۔ محمد اقبال نے غزل کو ایک نئی جہت دی۔ ایک ایسی جہت جس میں فکر و جد ان  
اور مجازِ حقیقت سے ہم کنار ہے۔

محمد اقبال نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ ایک سر میکور تھے بیگ ۳۳۳ لیفٹینٹ گورنر جزل  
پنجاب کی اسلامیہ کالج میں تشریف آوری پر:

رہے نشاطِ فراواں کہ اختِ تقدیر  
چمک رہا ہے ابھر کر مثالِ مہر منیر  
ولیم بیل ۳۳۲ بھی گورنر صاحب کے ساتھ شریکِ محفل تھے:

یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ  
اٹھیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کی تنویر

یہ قصیدہ ایک طرح سے ذوق کی تقلید میں لکھا گیا۔ ذوق نے اپنے قصیدے کی ابتداء اس  
طرح کی ہے:

زہ نشاط اگر سمجھے اسے تحریر  
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

دوسراؤ ای بہاول پور نواب بہاول خاں کے جشنِ تاج پوشی کی تقریب پر جسے عبدالقادر نے  
مخزن میں شائع کرتے ہوئے لکھا۔ نصرت جنگ، مخلص الدولہ، حافظ الملک، ہر ہائینس  
نواب محمد بہاول خاں تیجہم عباسی کو ہرا یکیلینیسی و اسرائے و گورنر جزل بہادر کشور ہند نے خود  
اپنے ہاتھوں سے مند سلطنت پر بٹھایا۔ اس خوشی کی تقریب میں ..... ز میں بہاول پور ۲۱ نومبر

کی شام کو کثرت چاغاں سے رشک آسان بن رہی تھی..... اس مبارک تقریب پر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے ایک قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی گئی اور انھیں مدعو بھی کیا گیا..... رخصت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جانے سے مغذور رہے..... قصیدہ بھی بعد میں وصول ہوا۔ صاحبان فن دیکھیں گے کہ قصیدے کی زمین کس قدر مشکل تھی، مگر اس میں کیسے کیسے شرطی خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں اور پرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملا دیا ہے۔<sup>۳۵</sup>

گویا محمد اقبال نے یہ قصیدہ خود نہیں لکھا بلکہ لکھوا یا گیا لہذا قطع نظر قصیدے کی روشن سے اس میں غرض مندی اور تعریف و توصیف کا کوئی پہلو نہیں جسے شاعر نے یہ کہہ کر واضح بھی کر دیا ہے:

پاک ہے گردِ غرض سے آئندہ اشعار کا  
جو فلکِ رفت میں ہو لا یا ہوں وہ چون کر زمیں

اور اس کا جواز پیدا کیا تو یوں:

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی امید گاہ  
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گسترز میں  
حتیٰ کہ نواب صاحب کی مدح بھی نہیں کی۔ کہا تو یہ:  
بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پوری

اور پھر یہ:

ہے مروت کے صدف میں گوہر تنیر دل  
یہ گہر وہ ہے کرے جس پر فدا کشور زمیں  
حکمرانِ مسٹ شرابِ عیش و عشرت ہیں اگر  
آسمان کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

تشیب کی ابتداء کی یوں کی ہے:

بزمِ انجمن ہے گوچوٹا سا اک اختر زمیں  
آج رفت میں تریا سے بھی ہے اوپر زمیں

تا آنکہ پھر منظر کشی میں شاعر کی تخیل کی نزاکت اور ندرت طرح طرح سے جلوہ گر ہوتی ہے، باس ہمہ جب یہ قصیدہ شائع ہوا تو اہل زبان نے اس پر کئی ایک اعتراض کیے۔ پہنچت برج نرائن چکبست نے تو کیے بعد دیگرے اعتراضات کی بھرمار کر دی۔ ان کا حضمون رسالہ

اردوئے معلیٰ شمارہ اپریل ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ ان اعتراضات کا جواب نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے نہایت خوبی سے دیا ہے۔<sup>۲۳۶</sup> تفصیل ان اعتراضات اور ان کے جواب کی جناب رضا بیدار نے بیان کر دی ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ محمد اقبال نے گورنر پنجاب کی آمد پر جو قصیدہ لکھا وہ بھی انجمن کے مفاد کی خاطر نہ کہ اپنی ذات کے لیے کسی فائدے کے پیش نظر ہندی سیاست کے اس دور و فاداری میں سرکار اور سرکار کے نمایندوں سے اظہار و فاداری ایک امر ضروری تھا۔ بغیر اس کے کوئی انجمن زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ نواب بہاول پور کی تعریف میں بھی قصیدہ خوانی سے کام نہیں لیا۔ اس میں بھی نواب صاحب کی تعریف میں کچھ تو یہ کہ مقصود فرمائ روائی ہے رعیت پروری۔ پھر یہ قصیدہ ہو یا سر میک ور تھے یانگ کی مدح، ۱۹۰۳ء میں ہندوستان کا گزر باعتبار سیاست جس مرحلے سے ہور ہاتھا اس میں بجز اس کے وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے کہ انجمن کی مصلحتوں کا خیال رکھیں۔ رہا قصیدہ بہاول پور سودہ بہاول پور گئے بھی نہیں۔ دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ حاصل کلام یہ کہ ان قصائد کو اول تا آخر پڑھا جائے کہیں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملے گا جہاں یہ ظاہر ہو کہ شاعر کسی ذاتی غرض یا جلب منفعت کے لیے قصیدہ خوانی کر رہا ہے۔ البتہ ”مسلمانان پنجاب“ کے دل کی دھڑکن اور خواہش ان میں ضرور ملے گی۔<sup>۲۳۷</sup>

۱۹۰۵ء میں یا یوں کہیے محمد اقبال انگلستان روانہ ہوئے تو ان کی شاعری کا پہلا دور ختم ہو گیا۔ بانگ درا میں ابتدائی دور کا تو خیر تماً دور اول کا کلام بھی، غزلیں، نظمیں۔ بہت کچھ ترمیم و اصلاح اور قطع و برید کے بعد شامل کیا گیا جس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جو کلام بانگ درا سے خارج ہے اور جسے غلطی سے غیر مطبوعہ کہا جاتا ہے اسے خود شاعر نے قابل اشاعت نہیں سمجھا۔ خود اپنی رائے یا کسی کے مشورے سے یہاں اس سے بحث نہیں۔ بحث ہے تو اس امر سے کہ مفترض کہتا ہے جس کلام پر شاعر نے خود خط تنفسیں کھینچ دیا اس کی اشاعت کا کوئی جواز نہیں۔ درست، لیکن شاعر نے جس کلام کو درخواستنا نہیں سمجھا ہم تو اس سے بے اعتنائی نہیں برٹ سکتے۔ شاعر نے اپنے ابتدائی کلام کو باوجود یہ کہ اسے جہان غزل میں آج بھی نہایت اونچی جگہ سکتی ہے نوشی پر محمل کیا۔ بقول مرزاغالب۔

تکف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اسے نظر انداز کر دیا۔ یوں بھی ۱۹۰۰ء میں ان کا رنگ تھن جس طرح بدلا اس سے ہم آہنگ نہیں

پایا۔ دور اول کے کلام میں بھی جہاں کہیں زبان و بیان کے اعتبار سے کوئی خامی نظر آئی ترمیم و اصلاح کر دی۔ پست ہے تو سرے سے خارج کر دیا۔ جیسے تصویر درد کا یہ شعر:

تری تعمیر میں ضمر ہوئی افتادگی کیوں کر  
لگائی ہے مگر اس گھر کو خشت نقش پا تو نے

پھر جب نواب حبیب الرحمن خاں شروعی کو فریادامت کے بعض اشعار پر اعتراض ہوا جس پر انہوں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا تو قطع نظر اس سے شاید یہ سوچتے ہوئے کہ اس نظم میں وہ اپنے خیالات کا تمام و کمال اظہانہیں کر سکتا ہے بانگ درا میں جگہیں دی۔ فریادامت کی تمہید ضرورت سے زیادہ طویل ہے۔ کہیں کہیں غلو بھی ہے جس پر انھیں خود بھی خیال تھا کہ کوئی اعتراض نہ کر دے۔<sup>۳۸</sup>

ایک اور اہم وجہ بعض نظموں میں اصلاح و ترمیم اور قطع و برید کی یہ ہے کہ ان میں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جن کو غلط معنی پہنانے جاسکتے ہیں اور جو بادی النظر میں قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ کہنا:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی  
کچھ اسی کے دم سے قائم آن ہے انسان کی  
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں  
خونِ آبائی رُگ تن سے نکل سکتا نہیں

اظہر یہ وہی بات ہے جسے وطنیت، یا نسلی قومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں مذہب کی حیثیت فرد کے ذاتی معاملے کی رہ جاتی ہے، سیاست سے بے تعلق۔<sup>۳۹</sup> حالانکہ محمد اقبال کا کہنا یہ تھا کہ وطن اور نسل کا تسمیہ تعارف کے لیے ہے۔<sup>۴۰</sup> انھیں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ آگے چل کر اس قبیل کے اشعار کو وطنیت پسندی پر محول کیا جائے گا بعینہ:

پھر اک انوپ اُسی سونے کی مورتی ہو  
اس ہر دوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں  
زنار ہو گلے میں تشیع ہاتھ میں ہو  
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں  
اُنی ہے ایک زُگن کہتے ہیں پیت جس کو

دھرموں کے یہ بکھیرے اس آگ میں جلا دیں  
ایسے اشعار پر ایک بہم سماجی اور کثر وطن پرست تو پھر کٹ اٹھے گا۔ بافسوس کہے گا کہ  
شاعر وطنیت سے اس قدر قریب آ کر دور کیوں ہو گیا۔ لیکن شانِ حرم اور پیٹ کا اشارہ جس  
طرز فکر اور طرز عمل کی طرف ہے اسے شاید قصداً نظر انداز کر دے گا۔ شاعر زنا و ارتباً کے  
امتراج پر زور نہیں دے رہا، رواداری کی تلقین کر رہا ہے۔ جانتا ہے کہ تباہ تو در کنار خود زنا کو بھی  
یہ امتراج گوارا نہیں۔ یوں بھی سوچنے کی بات یہ ہے کہ ”نیا شوالہ“ ہندو اہل وطن کے لیے لکھا  
گیا۔ چنانچہ باعتبار زبان، ترکیبات اور اصطلاحات اس نظم کا لب و لہجہ خالص ہندو اون ہے۔ ہندو  
اہل وطن سے خطاب میں ایسا ہی لب و لہجہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ دھرموں کے بکھیروں سے گلو  
خلاصی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دھرموں کو خیر آباد کہہ دی جائے بلکہ یہ کہ دھرم نزاع و جدال کا  
ذریعہ نہ بنے، نہ ایک دوسرے کے خلاف مجاز آ رائی کا۔ یہ چیز وطن کے لیے ہندوؤں اور  
مسلمانوں دونوں کے حق میں نقصان دہ ہے۔

محمد اقبال فرقہ بندی کے خلاف تھے خواہ اس کی نوعیت سیاسی ہو یا مذہبی۔ عقین اور دل  
پیغام بیعت کے جواب میں ان کے طویل خط کا قطعہ بند بانگ درا میں تو موجود ہے لیکن پوری  
نظم اسی بنا پر کہ فرقہ بندی کو ہوانہ ملے بانگ درا سے خارج کر دی گئی۔ شاید اس لیے بھی کہ  
اس کی حیثیت نجی اور ذاتی تھی مگر جس سے سوانح نگار تو قطع نظر نہیں کر سکتا۔ بعینہ خان صاحب  
سراج الدین کی تحفہ بھیجی ہوئی انگلشتر یوں کاشکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے جو محبت بھرے  
قطعہ اردو اور فارسی میں لکھے وہ بھی اسی وجہ سے بانگ درا میں شامل نہیں کیے گئے۔ مگر سوانح  
نگار جب وہ یہ کہتے ہیں:

ہاتھ سے پہنے اگر میرے اسے وہ دربا  
ہو رموز بیدلی کی ترجمان انگلشتری

علی ہذا:

گشت اے اقبال مقبول امیر ملک حسن  
کرد وا مارا گرہ آخر زکار انگلشتری  
ان اشعار کی ”سوخی“، نوعیت کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

پھر اگرچہ مشتوی اسرار خودی کی اشاعت سے پہلے محمد اقبال نے اپنے فارسی کلام کو

کوئی اہمیت نہیں دی، اس کلام کا تعلق بھی ان کی سوانح حیات کی طرح دینی تصورات اور عقائد سے نہایت گہرا ہے۔ مثلاً ان کی وفات کے بہت بعد جب سوال پیدا ہوا کہ وہ کسی رنگ میں کیا اجرائے نبوت کے قائل تھے تو ختم نبوت کے بارے میں ان کے اس شعر سے سندی گئی:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک  
بزم را روشن ز شمع نور ایماں کردا

یہ شعر اس نظم کے ایک بند میں آیا ہے جس کا عنوان ہے اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے، اور جو ۱۹۰۲ء میں کچھ فارسی اور کچھ اردو میں لکھی گئی۔ محمد اقبال اس امر کے ختنے سے قائل تھے کہ سلسلہ نبوت حضور رسالت مآب پر ختم ہو گیا۔ آپ کے بعد اجرائے نبوت کا کسی پہلو سے کسی رنگ میں کوئی امکان نہیں۔

سپاس امیر ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی، لہذا یہ امر کہ اس کے ایک بند کو پیام مشرق میں جگہ لی اس امر کا ثبوت ہے کہ محمد اقبال کی فارسی شاعری تملماً نہیں تو جزوًا اس معیار کو پہنچ گئی تھی کہ پیام مشرق کی ترتیب میں اس منقبت کے ایک جزو کو نظر اندازنا کیا جاتا۔ محمد اقبال کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے والہانہ عقیدت تھی جس میں یہاں تک کہہ گئے:

از ہوش شدم مگر بہوشم  
یعنی کہ نصیری خوشم

یوں عقیدت میں غلوکار رنگ پیدا ہو گا۔ جناب امیر کی عظمت ذات سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن ‘نصیریت’ کا تو استعارہ بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ اقبالیات کے طالب علم کی طرح سوانح نگاران اشعار سے کیے قطع نظر کر سکتا ہے۔

‘تصویر درد’ میں بھی بہت کچھ قطع و برید کی گئی۔ اس نظم کی ’سوانح‘ اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ محمد اقبال کے ڈنی اور شعری ارتقا کے مطالعے میں ان اشعار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس سے خارج کر دیئے گئے مثلاً

وضو کے واسطے آتا ہے کعبہ لے کے زمزم کو  
الہی کون سی وادی میں میں محبو عبادت ہوں

نیز:

نجد میرا مدینہ ہے مدینہ میرا کعبہ ہے

میں بندہ اور کا ہوں امتِ شاہِ ولایت ہوں  
جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو  
مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

دور اول کے ابتدائی کلام کی طرح قصائد کو بھی بانگ درا میں جگہ نہیں ملی، جیسے آگے چل کر اس مدحیہ قطعہ کو جو مہاراجہ سر کرشن پرشاد کی مہمان نوازی کے اعتراض میں لکھا گیا۔ یہ قطعہ اگر بانگ درا میں شامل رہتا تو مضمون نہیں تھا۔ محمد اقبال اس قطعہ میں صرف اپنے جذبہ تشرک کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ مخزن میں اشاعت کے لیے بھیجا تو ایک تمہیدی شذرے کے ساتھ اور جس میں انھوں نے بوضاحت کہا ہے: ۲۳۱

شکریہ احسان کا اقبال لازم تھا مجھے

مدح پیرائی امیروں کا نہیں میرا شعار

قصیدہ بہاول پور بھی کسی مالی منفعت کی توقع میں نہیں لکھا، صرف ایک فرمائش کا پورا کرنا منظور تھا۔ یعنی نینٹ گورنر پنجاب کی مدح سرائی سے بھی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ انجمن حمایت اسلام کا مفاد ہی پیش نظر تھا۔ ۱۹۰۱ء میں البتہ محمد اقبال نے ملکہ و ٹوریا کے انتقال پر ۱۹۰۱ء اشعار کا ایک مرثیہ لکھا جو ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو مسلمانان لاہور اور پھر ۶ فروری ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ کے ایک ماتحتی جلے میں پڑھا گیا اور خود ہی اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ مگر یہ مرثیہ بھی حکومت کے ایما سے لکھا گیا۔ محمد اقبال کی شاعرانہ حیثیت مسلم تھی اور انھوں نے بہت تھوڑے دنوں میں معاشرے میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ یوں بھی اس دور و فاداری میں سارا ہندوستان بلا استثناء قیصرہ ہند کی وفات پر رنج و غم کا افہام کر رہا تھا۔ محمد اقبال کے لیے نامکن تھا کہ حکومت تو درکنار اپنے انگریز اساتذہ اور مسلمانان لاہور کی فرمائش قبول نہ کرتے۔ ۲۳۲ کچھ ایسا ہی معاملہ اس نظم کا ہے جو ۱۹۱۷ء میں محمد اقبال نے سرکار انگریزی کو جنگی امداد کے سلسلے میں لاہور کے ایک جلے میں پڑھی۔ ۲۳۳ سرکار برطانیہ کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو جو منی کے ہاتھوں اسے شکست ہو جائے۔ یہ ہندی سیاست کا دور و فاداری تھا جو ۱۹۱۹ء میں ختم ہوا اور جس میں ہندوستانی معاشرے کا ہر طبقہ عوام، خواص، راجہ، مہاراجہ، نواب حتیٰ کہ آزادی ہند کے مجاہد اعظم مہاتما گاندھی بھی سرکار کی اعانت کے لیے میدان میں اُتر آئے تھے۔ لہذا یہ نظم ہو، یا ملکہ و ٹوریا کا مرثیہ، یا مدحیہ قطعہ اور وہ قصیدے جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، ان سے محمد

اقبال کی سیرت و کردار پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ سب نظریں تقاضائے حالات لکھی گئیں ۱۹۷۷ء میں محمد اقبال کا رد کردہ کلام جس کی شناخت کی دیویان اشعار سے کم نہیں کئی پہلوؤں سے اہم ہے۔ اتنے بڑے مجموعہ کلام پر خط فتح سخنپشا محمد اقبال ہی کا کام تھا جس کی بڑی وجہ وہی ہے جسے راقم الحروف اور بیان کر آیا ہے کہ شاعری محمد اقبال کے پیغام اور دعوت کا ذریعہ ابلاغ نہیں تو وہ سارا کلام جو اس سے ہم آہنگ کی دل و دماغ کی جھلک ملتی ہے بلکہ یہ کلام ان کے سفر شعر کی نہایت دلچسپ کے واقعات زندگی اور دل و دماغ کی جھلک ملتی ہے بلکہ یہ کلام ان کے ذریعے ابلاغ اور توجہ طلب داستان بھی ہے کیا بہ اعتبار اس دعوت اور پیغام کے جس کا اس کے ذریعے ابلاغ ہوا اور کیا بحاظ شاعری کے جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے فکر و فون میں کس طرح منزل بمنزل آگے بڑھ رہے تھے تا آنکہ ان کے افکار و نظریات کی طرح ان کی شاعری بھی اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی۔ پھر یہ رد کردہ کلام ان کی شاعری کے آنے والے ادوار کی تمہید بھی ہے جس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ ان کے افکار و تصورات کس طرح تقریباً رفتہ رفتہ اپنی صحیح اور اصلی شکل میں منضبط ہوتے چلے گئے۔ ایسے ہی غور کیجیے تو ہمیں اس میں محمد اقبال کے شب و روز، ان کے اہل غم سے روابط، دوستوں سے تعلقات، ملی اور علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شخصیت اُبھرتی نظر آتی ہے۔

محمد اقبال کی شاعری کے دور اول کی ابتداء ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے بھی ان کا شمار قادر الکلام شعراء میں ہو رہا تھا۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے ہی لاہور میں شعرو شاعری کی مغلبوں کی رونق بہت کچھ ان کے دم قدم سے قائم تھی حتیٰ کہ رفتہ وہ معاصرین پر چھا گئے۔ سیالکوٹ میں بھی وہ اپنی شاعری کی ابتداء، نہایت کامیابی سے کر چکے تھے۔ عربی اور فارسی ادب، قرآن مجید کی تعلیم، میر حسن کے درس اور گھر کی صحبتوں میں شعر و ادب، فلسفہ، تصوف، الہیات اور علوم معارف سے ان کا تعارف روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اردو اور فارسی کے دیوان تو گوا نہیں از بر تھے۔ قرآن مجید کے اعجاز بیان کے ساتھ عرب جاہلیت کی شاعری ان کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی۔ عربی شاعری کے اور بھی نمونے ان کے سامنے ہوں گے۔ لاہور میں مولانا عبداللہ ڈوکی جماسہ کا درس دیتے تو اس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ عربی کے ایک فاضل کے بعد عربی کے دوسرے فاضل کے درس سے استفادہ ان کے ذوق علم اور تحقیق و طلب کی دلیل ہے۔ عربی شاعری سے انہوں نے جو مستقل اثرات قبول کیے، ان کا اظہار اگرچہ بہت آگے چل کر ہوا لیکن

یہ اثرات بہر حال ان کے ذہن پر مر تم ہو چکے تھے۔ انگریزی ادب سے بھی اگرچہ انیٹرنس اور ایف۔ اے، ہی میں لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ گورنمنٹ کالج کا زمانہ تعلیم تھا جس میں وہ اس ادب کے مطالعے میں تیری سے آگے بڑھے۔ کالج کے انگریز اساتذہ بالخصوص آرلنڈ سے تلمذ میں مغربی فلسفہ، ادب اور انگریزی شاعری کے مطالعے میں انھیں ادب اور فن کی ایک نئی دنیا نظر آئی۔ اس دنیا نے جس میں انسان، کائنات، زندگی، اس کے حقائق، تحریبات اور مشاہدات کی ترجمانی ایک نئے انداز میں ہوئی انھیں اپنی طرف کھینچا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس ادب میں بھی اظہار جذبات، خیالات اور تصورات کی بڑی دل کش مثالیں موجود ہیں۔ وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ انھوں نے انگریزی ادب سے بچوں کی نظموں کے لیے کئی مضامین اخذ کیے۔ بعض نظموں کا ترجمہ کیا۔ یوں ان کے نبوغ شعر کو اپنے اظہار کے لیے ایک نیا میدان مل گیا۔ اب اسے تحریک علی گڑھ کا اثر کہیے، یا حاملی اور آزادی نظمیں جن میں وہ انگریزی شاعری سے اثر اندازی کی جھلک دیکھ چکے تھے، ان کی طبیعت بھی نظم گوئی کی طرف مائل ہو گئی۔ یوں بھی اردو شاعری میں نظم گوئی کی تحریک عام ہو رہی تھی جو اگرچہ اردو شاعری کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اردو، فارسی، عربی، پنجابی اور مشرق کی دوسروں زبانوں میں بھی اس کی گراں قدر مثالیں موجود ہیں لیکن فرق تھا اسلوب بیان، طرز ادا، انسان اور کائنات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا۔ محمد اقبال نے بھی نظمیں لکھیں لیکن مغربی مثالوں کا تتبع نہیں کیا۔<sup>۲۷۵</sup> کہا جاتا ہے ان نظموں میں صوری اور معنوی دونوں پہلوؤں حتیٰ کہ زبان اور بیان، خیالات اور تصورات میں بھی، انگریزی ادب کا رنگ جھلک رہا ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں کہ ان کو ترجمے، تواریخ یا تصرف ہی پر محمول کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس دور میں محمد اقبال کی شاعری نے انگریزی ادب سے نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ لیکن ہم اس بات کو یوں سمجھیں گے کہ اثر پذیری سے مراد اگر اخذ و اکتساب ہے، تتبع اور تقلید تو اس کے معنی ہوں گے خوشہ چینی، زلہ ربانی۔ برکس اس کے اگر اثر پذیری عبارت ہے تحسین و اعتراف، ہم خیالی، تعلیم اور تلمذ سے تو ہر نابغہ دوسرے نوانع سے اثر پذیر ہوا۔ طفل نوآموز بھی تو جو کچھ سیکھتا ہے اپنے اساتذہ سے۔ پھر جیسے جیسے تعلیم و تحصیل میں آگے بڑھتا ہے اسلاف کے درثے کو دوسروں ہی سے حاصل کرتا ہے، دوسروں کی بدولت علم و حکمت، ادب اور فن کی دنیا میں قدم رکھتا، ان سے فیض حاصل کرتا ہے۔ لیکن بسبب اس ذہانت اور طبائی کے جو مبدأ فیاض سے اسے ملتی ہے دوسروں کے ادب و احترام، قدر و منزلت اور ان

کے بہت کچھ سکھنے کے باوجود ہنسے بے شک اثر پذیری کہہ لجیے اس کی امتیازی حیثیت قائم رہتی ہے۔ محمد اقبال نے کیا خوب لکھا ہے: ”میں اعتراف کرتا ہوں میں نے ہیگل، گوئے، میرزا غالب، عبدالقدار بیدل اور ورڈز ورٹھ سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ ہیگل اور گوئے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے سکھایا کہ مغربی شاعری کی قدر وہ کو اپنے اندر سمولینے کے باوجود اپنے جذبے اور اس کے اظہار میں مشترکیت کی روح کیسے زندہ رکھوں۔ ورڈز ورٹھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچایا“۔<sup>۱۳</sup> گویا ہیگل، گوئے، غالب، بیدل اور ورڈز ورٹھ سے بہت کچھ سکھنے کے باوجود محمد اقبال کی عبقریت میں کوئی فرق نہیں آیا جیسے غزل اور بیدل کی عبقریت میں اپنے پیش روؤں سے استفادے کے باوجود۔

بہرحال ۱۹۰۰ء میں جب محمد اقبال کی شاعری غزل کی بجائے پیش نظم پر مرکوز ہوتی گئی تو غزل کی دروں بینی نے نظم کی نبروں بینی سے مل کر شاعری کی ایک ایسی دنیا پیدا کی جس سے اردو زبان اب تک نا آشنا تھی۔ لہذا شعرو شاعری کے حقوق کو یہ دنیا کچھ اوپری اوپری نظر آتی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ وجہ ظاہر ہے اسلامی ہندوستان نے سو، ڈیڑھ سو برس کے قبی، اخلاقی انحطاط، سیاسی معاشی بد نظمی اور مصاف حیات میں شکست کے بعد عکبت واد بار کے ہاتھوں جس خیالی دنیا میں پناہ لے رکھی تھی اس کا طلسم ٹوٹا تو زندگی کے حقائق اور علم و عمل کے تقاضے کچھ نامانوس سے نظر آنے لگے۔ محمد اقبال نے بھی اگرچہ اسی دنیا میں آنکھ کھولی مگر ان کی تعلیم و تربیت جس خوبی سے ہوئی، اپنی ذہنی صلاحیتوں اور غور و فکر کی بدولت جس طرح حقائق اور واقعات کی دنیا میں قدم رکھا، اس کے شمیر اور باطن تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کے دل و دماغ میں جواہرات کام کر رہے تھے ان کا تو بھی تقاضا تھا کہ غزل کا آہنگ نظم سے بدلا جائے۔ غزل میں ان حقائق کا بیان کیسے ممکن تھا جوان کی دعوت اور پیغام کا تارو پود ہیں۔ جن کی حیثیت ملی بھی ہے، سیاسی، اجتماعی، عقلی اور فکری بھی، یوں اس حکیمانہ شاعری کی ابتداء ہوئی جس نے ایک طرف فلسفہ اور حکمت کو چھیڑا، زندگی اور اس کے حقائق سے پرده اٹھایا، ذات انسانی کے امکانات، اس کے جذبات و احساسات، آرزوؤں اور تمباویں کی ترجمانی کی۔ انسان کے لیے عالم نظرت میں جو دلکشی ہے، اس کے جمال و جلال سے جس طرح لطف انداز ہوتا ہے، سوچتا ہے، جذبات اور تاثرات میں کھو جاتا ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا طرح طرح سے

اطہار کیا۔ دوسری جانب اس کا رُخ سیاسی، اجتماعی تھائق کی طرف تھا۔ ان احوال و شنوں پر مرکوز جن سے قوم اور طلن کا گزر ہوا تھا۔ آئیے ہم ان میں سے ایک کو اس شاعری کے فکری دوسرے کو ملی آہنگ سے تعبیر کریں۔ ایک کی ابتداء ہمالہ سے ہوئی، دوسرے کی نالہ یتیم سے۔ دونوں میں اگرچہ شروع ہی سے ایک رشتہ قائم تھا، لیکن جیسے جیسے ان کی شاعری نے ایک دعوت اور پیغام کا رنگ اختیار کیا یہ دونوں آہنگ ایک دوسرے میں ملکیتاً مدغم ہو گئے۔

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دس بارہ برس کی مشق خن، یا بیوں کہیے ابتدائی دور کے بعد جس میں داغ ایسے استاد نے بھی محمد اقبال کی غزل گوئی کو سراہا، ان کی شاعرانہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ یہ کیسے ہوا کہ ان کی شاعری نے دفتاً اپنارنگ بدلا۔ غزل کی جگہ نظم نے لی اور وہ بھی اس حکیمانہ انداز میں کہ اس کی آب و تاب بڑھتی ہی جلی گئی حتیٰ کہ حسن صوری و حسن معنوی کی بلندیوں تک جا پہنچی گواہی اس کے لیے کئی اور بلندیاں باقی تھیں تو ہمیں اس پر تجھب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جو کچھ ہوا اس لینہیں کہ محمد اقبال کے دل و دماغ نے دفتاً کوئی اثر قبول کیا یا واقعات و حالات نے ان کے ذہن کا رُخ موڑ دیا۔ ہرگز نہیں۔ یہ نتیجہ تھا، جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، خیالات کے تدریجی ارتقا کا۔ بات یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت جس نئج پر ہوئی، کتب سے مدرسے اور مدرسے سے کالج میں آئے، جس خوبی سے فارغِ احصیل ہوئے۔ احوال عالم، قوموں کی زندگی، تہذیب اور تمدن، علوم و معارف کے مطالعے میں آگے بڑھے قدرتی بات تھی کہ ان کی شاعری نفس انسانی کی گہرائیوں میں جا پہنچے۔ شعور کی کہنا میں اتر جائے۔ اس وحدت کو پا لے جہاں علم اور عقل، فکر اور وجود ان، حقیقت اور مجاز ایک ہو جاتے ہیں۔ محمد اقبال غزل سے نظم کا رُخ کریں۔ غزل، بہت ہوچکی تھی اس دور میں بھی ہوئی اور ہوتی رہے گی۔ لیکن وہ غزل جوان کے فکری اور ملی آہنگ کا ساتھ دے بہت آگے چل کر ہو گی۔ رہی نظم سو محمد اقبال نہ تو فلسفہ نظم کر رہے تھے۔ نہ قوی، اخلاقی اور قدرتی مضامین جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی شاعری کے زیر اثر عام میلان تھا۔ برکس اس کے انہوں نے جو نظم کہی اس کا کوئی نمونہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ آزاد کی نظیں خشک اور شحریت سے خالی تھیں۔ حالی ایک حد تک استثناء ضرور ہیں، مگر اس حد تک نہیں کہ انہیں محمد اقبال کا پیش رو ٹھہرایا جائے۔ اردو نظم ابھی گھٹشوں کے بل چل رہی تھی۔ محمد اقبال نے اسے گھوارے سے نکالا۔ اس کی حدود قائم کیں۔ صوری اور معنوی حیثیت متعین کی۔ اسے وہ زندگی اور تو انانی، وسعت اور گہرائی بخشی کہ اردو نظم جہاں ادب میں عالمی شاعری کے

پہلو بہ پہلو جا کھڑی ہوئی۔ نادر کا کمال فن مسلم ہے۔ لیکن نادر نے پیشتر تجویں پر اتفاق کیا۔ سرو و اور محروم بھی اس میدان میں زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ گویا اردو نظم میں رفتہ جو حسن اور تنوع پیدا ہوا محمد اقبال کے زیر اثر۔ محمد اقبال کی رغبت تخلیل اور محمد اقبال کے حسن بیان نے جو نظم کو کچھ اس طرح سنوارا، اسے کچھ ایسی شان و شوکت بخشی کہ نظم کا جمالی پیکر غزل کا حریف بن گیا۔ اردو نظم محمد اقبال کی تخلیق ہے وہ اسے جس اوج کمال پر لے گئے اسے کوئی نہ پہنچ سکا۔ وہ اگر یہ کہتے:

مری قدر کر اے زمینِ خن  
تجھے بات میں آسمان کر دیا

تو غلط نہ کہتے۔ چنانچہ پانچ برس کے اس مختصر سے دور ہی پر نظر رکھیے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ محض ایک شاعر کا کلام نہیں، بلکہ ایک ایسے فلسفی، بصر اور مفکر، نوع انسانی کے ہمدرد، صاحب علم و فضل، ایک ایسے صاحب بصیرت اور حقیقت پسند سیاست دان کا جس کا دل در دانسائیت سے معمور ہے، نگاہیں سیاسی، اجتماعی احوال و شوؤن پر لگی ہیں۔ ملک و قوم کی آشنازی عالی پر مرتكز۔ جو اس سرز میں کو جس سے اس کا خمیر اٹھا، اس قوم کو جسے ایمان و یقین کی دولت ملی آزاد، شاد و آباد، کامران اور کام گارڈ کیجھے کا آرزو مند ہے۔ یوں محمد اقبال کا کلام ایک پیغام بیداری بن گیا۔ ایک درس عمل، ایک نوید امید اعتماد جس نے سننے والوں کے دلوں کو گرمایا۔ ان کے ضمیر اور باطن کو چھپھوڑا۔ انھیں خواب غفلت سے جگایا، سیاسی ہوش مندی اور غیرت ملی کا سبق دیا۔ تا آنکہ شاعر کے جذبات و احساسات، خیالات اور تصورات کا رشتہ جب حقائق سے جاملاً تو اس کی شاعری محض شاعری نہ رہی۔ قوم اور ملک کی انگلوں کی آئینہ دار، زندگی اور اس کے احوال و ارادات کی ترجمان بن گئی۔

یوں بھی محمد اقبال کی شاعری کا دور اول ایک آئینہ ہے جس میں ہم ان کے دل اور دماغ کی جھلک ہی نہیں دیکھتے۔ ہم یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے خیالات اور تصورات کا ارتقا کس خوبی سے جاری تھا۔ ہم ان کے ضمیر اور باطن سے اور زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ ان کے فکر اور وجہ ان کا رخ کس طرف ہے۔ رہا ان کا کمال فن سواہل نظر کب سے دیکھ رہے تھے کہ محمد اقبال مسلکِ خن سے پورے طور پر واقف ہیں۔ شاعری کے حسن صوری اور حسن معنوی سے کلیتاً آ گاہ۔ یہ نتیجہ تھا اس محنت اور جاں فشنائی کا جوانہوں نے اس منزل تک

پہنچنے کے لیے کی اور جس کا ان کا ابتدائی کلام ناقابل انکار ثبوت ہے۔ یوں انھیں خیالات اور تصورات ہوں، یا جذبات اور احساسات ان کی ترجمانی میں وہ قدرت حاصل ہوئی کہ ہر خیال، ہر تصور، ہر تجربہ اور مشاہدہ جس سے ان کا گزر ہوا دلی تاثرات اور کیفیات کا ایک روح پرور سرچشمہ بن گیا۔ اسلوب بیان اور حسن ادا کا یہ عالم ہے کہ افکار دماغ ہوں، یا جذبات قلب مجسم ہو کر سامنے آگئے۔ خیالات کیسے بھی اجنبی تھے، جذبات کیسے بھی نازک حقائق کیسے بھی ادق ان کا اظہار مشکل نہ رہا۔ جوان دا اختیار کیا ایسا دل کش اور دل نشین، الفاظ ایسے مناسب تر کیمیں ایسی موزوں، تشبیہیں ایسی نادر، استعارے اس قدر اچھوتے کہ جو بات کہی دل میں اترگئی۔ شاعری کے اس دور میں بھی وہ سب خصوصیات جمع ہو رہی تھیں جن کا تعلق ان کی عظمت فکر اور کمال فن میں زبان و بیان سے ہے۔ زبان میں وہی لطافت اور وہی حلوات، الفاظ میں وہی حسن اور وہی شان و شوکت، بیان میں وہی بے ساختگی اور بر جستگی، خلوص اور صداقت، سوز و گداز، اثر اور تاثیر، کیف اور سرمستی جوان کی شاعری کا طرہ اتیاز ہے۔ تخلیل ہمہ گیر ہے، تکاہ ہر شے کی تک پہنچ رہی ہے۔ ذہن فلسفہ کی گہرائیوں میں گم ہے۔ وجдан ماوراء کی سرحدوں کو چھو رہا ہے۔ شدت احساس کی یہ صورت کہ ہر لفظ میں درد کی کسک ہے۔ ہر مرے میں زندگی سانس لے رہی ہے۔ ہر شعر ایک دھڑکتا ہوا دل۔ شاعر کا فکر آفاق کی وسعتوں میں پھیل رہا، اسرار ہستی کی گرہ کشائی کے لیے بے تاب ہے۔ ایک بے چین اور بے قرار روح جس کا ذوق جتو اسے جہان ہست و بود میں کہاں کہاں نہیں لے جاتا۔ شہر میں، شہر سے دور فطرت کی تہائیوں میں جہاں کبھی اسے گوشہ عزلت کی تلاش ہے۔ کبھی نظرت اس کی رفق و جلیں۔ اس کی آنکھ کیا نہیں دیکھتی۔ کائنات، اس کا جمال و جلال، چاند، سورج، ستارے، فضائے نیکوں۔ ان میں کیا راز چھپا ہے، ان میں کیا حسن ہے، محفل قدرت میں حسن ہی حسن ہے۔ آبادی میں، ویرانے میں، صبح و شام کے مناظر، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی خاموشی میں، ہر کہیں حسن کا جلوہ عام ہے پھر بھی دل کو تسلیم نہیں ہوتی۔ حسن سے شعلہ عشق اور بھڑک اٹھتا ہے۔ عشق کا بھی ہر کوئی راز دار نہیں۔ کوئی شے ہے جو روح کو نہیں ملتی کھوئی ہے۔ زندگی نے اس پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ زندگی شاید غفلت ہے، بے ہوشی ہے، خود فرمamoشی۔ اس درد و کرب میں کبھی چاند سے خطاب ہے، کبھی پھولوں سے گنتگو، کبھی خنگان خاک سے استفسار، کبھی حیرت کے پروانہ شمع پر مرہتا ہے۔ پچھے کس محیت سے اسے تک رہا ہے۔ کبھی جگنوکی شب تابی سے کثرت

میں وحدت کا تماشائی ہر کہیں حسن ازل کی جھلک دیکھ رہا ہے۔ سوچتا ہے گل نگین زیب محفل تو ہے، شریک شورش محفل کیوں نہیں۔ مون دریا نگنی دریا سے گریز اس فرقہ بحر میں پریشان ہے۔ ستارہ صبح مضطرب کہ حیات ابدی کا راز کھلے۔ شمع جل رہی ہے مگر اپنے سوز سے بے خبر۔ شمع کی درد مندی سے خود اس کا درد مندل بھرا آیا۔ وہ اس سے کیا کہے۔ انسان جس کے لیے آگئی ایک نقاب ہے۔ جس کی نگاہ مایہ آشوب امتیاز اور جو خود اسیر فریب خیال ہے، نہیں جانتا حسن ہے یا عشق، ناز ہے یا نیاز، کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ علم ایک جیرت کدھ ہی سہی۔ آگئی ایک آشوب، عقل کے لیے ایک نہیں کئی عقدے ہیں مشکل سے مشکل تر۔ مگر یہ انسان ہی تو ہے جسے بزم ہستی میں تھا حقیقت کو طلب ہے، جو سرتاسر سوز و ساز، سرتاسر آزو، درد استفہام سے بے چین، تلاش متصل میں سرگرم و سرگردان، سمجھی اور حاصل کا لذت شناس، عقل اور فکر کی گر ہیں کھولتے، عقدہ ہائے مشکل کی کشود، ناکامیوں اور پریشانیوں میں جمعیت خاطر کا راز ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ ہے زندگی اور زندگی اسے کسی مقصد کی طرف لیے جا رہی ہے۔ مقصد کا یہی احساس جب شاعر کو اس کے داخل کی دنیا سے خارج کی دنیا میں لے آتا ہے۔ جب نفس و آفاق میں گھوم کر اس کی نگاہیں اپنے آپ پر جم جاتی ہے تو یہ سیوح دامن گیر ہو جاتی ہے کہ میں کہاں ہوں۔ زندگی کس منزل میں ہے۔ گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے وطن کی مخلوٰی اور زیوں حمال پر دکھ ہوتا ہے ملت کے انتشار اور پیش کو دیکھ کر مغموم اور اندوہ گیں ہو گیا۔ ذہن کبھی ماضی کا رخ کرتا، کبھی مستقبل کا۔ ہم کیا تھے کیا ہو گئے۔ تاریخ کا سہارا لیا تو وہ حقیقت سامنے آگئی جو قوموں کی تقویم اور تقویت کا راز ہے۔ جس سے ایک ایسی عالم گیر انسانیت کا تصور ابھرتا ہے جس کا جسم و جان، جذبہ محبت، اخوت اور مساوات سے سرسرشار ہے۔ یوں ان کے داخل اور خارج کی دنیا میں جو مطابقت پیدا ہوئی۔ دل و دماغ جس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے اس سے محمد اقبال کی حیثیت محسن ایک شاعر، ایک عظیم اور حساس فکار کی نہیں رہی جو ملی اور قومی، سیاسی اور اجتماعی حقائق کو الفاظ کے پری خانوں میں اتار رہا، افکار اور تصورات کے شیش محل تیار کر رہا تھا۔ بلکہ ایک ایسے دیدہ ور، وقت اور حالات کے نبض شناس کی جس کا دل آزادی کے لیے ترقیتا۔ جواہل وطن کی نفاق انگلیزی سے نفوران کے درمیان اتحاد و اتفاق اور صلح و آشتنی کا سفیر بن کر آیا۔ جس کا جی چاہتا تھا افسر دگی اور بے دلی کی اس فضا میں جو تعصّب اور تنگ دلی کو ہوادے رہی ہے، جس میں ایک برگشتہ بخت قوم مخلوٰی اور غلامی کے گرداب میں جا گری امید و

نشاط کا دور دورہ ہو۔ محمد اقبال کے امنگ بھرے دل میں آرزوؤں کا ہجوم تھا۔ جذبات میں یہجان  
۔ کچھ ایسا جوش اور ولہ کہ ان کے نہایا خانہ دماغ سے افکار و تصویرات کی ایک کے بعد دوسرا لہر  
اٹھتی۔ رفتہ رفتہ یہ لہریں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ ان کا رخ متعین ہونے لگا۔ شاعری ایک  
نصب العین پر مر تکن ہو گئی۔ شاعر نے اپنی منزل مقصود کو پالیا۔ یہ نتیجہ تھا اس ایمان و یقین کا اس  
ذرہ درد دل کا جس کی بدولت عشق رسول کا وہ جذبہ جو اسلام سے والہانہ عقیدت اور امت کے  
لیے درد مندی کا سرچشمہ ہے اس کے رگ و پے میں اتر گیا۔ جس کا اظہار نالہ یتیم اور فریاد  
امت ایسی نظموں میں بار بار ہوتا۔ جو بلال ایسی نظم میں ایک شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ پھر جب  
عشق و سرمستی کے اس عالم میں یہ احساس اُبھرتا کہ اس کا رشتہ حیات کس حقیقت سے وابستہ  
ہے، ہماری ہستی اور وجود کا راز کیا ہے۔ وہ ذات پاک جس نے ہمیں زندگی ایسی نعمت سے  
سر فراز فرمایا، جس کی تخلیوں سے کائنات اور اس کے ہر ذرے کو روشنی ملی، کہاں ہے۔ ہم اسے  
کہاں تلاش کریں تو اس کا حقیقت آشنا دل بے اختیار کہہ اٹھا:

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں  
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں  
پھڑک اٹھا کوئی تیری اداۓ معرفا پر  
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سارے نازنیوں میں  
جلاسکتی ہے شمع کشته کو موج نفس ان کی  
الہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

رہے شعر گوئی میں محمد اقبال کے فیضانی محات سو کیفیت ان کی یہ تھی کہ غضب کی آمد  
ہوتی۔ شعر پر شعر کہے چلے جاتے۔ ایک ایک نشست میں سیکنڑوں شعر ہو جاتے۔ ان کے  
دوست ۲۷۷ کاغذ پیش لے کر بیٹھ جاتے اور وہ اپنی ذہن میں کہے چلے جاتے۔ ”میں نے اس  
زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا دریا بہتا۔ ایک  
چشمہ اپلتا ہوا معلوم ہوتا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ اپنے اشعار  
سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے، دوسروں کو وجد میں لاتے۔ یہ عجیب  
خصوصیت ہے کہ حافظ ایسا پایا تھا کہ جتنے اشعار زبان سے نکلتے اگر وہ ایک سلسہ نظم کے ہوں تو  
سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے۔ بایس

ہمہ موزونی طبع وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر تھے،<sup>۲۸</sup> پھر بھی ابو صاحب کی فرمائش پر ایک بار تین شعر کہہ ڈالے۔<sup>۲۹</sup>

اُردو میں اپنی آخری نظم حضرت انسان ارقام فرمائی تو پلگ کے پاس ہی اٹھایا کھی ہوئی تپائی سے کسی چاک کردہ کاغذ کا ایک ایک پر زہ جس پر کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آتا تھا اٹھایا اور فرمانے لگئے لکھو، تا آنکہ پوری نظم جو سات اشعار پر مشتمل ہے، لکھوا ڈالی۔ حالانکہ شدت عوارض سے نقاہت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک لفظ پر رکنا پڑتا۔ سانس پھول جاتا۔ آواز بیٹھ جاتی۔ مجھے تعجب ہوتا انھیں یہ اشعار کیسے یاد رہ گئے ہیں۔ فرماتے فیضانی لمحات کا تعلق زیادہ تر آخ شب یا فجر سے ہوتا ہے اور ان کی شدت کا یہ عالم کہ جب تک شعر نہ ہو جائیں طبیعت کو تسلیم نہیں ہوتی۔ بعینہ جیسے ہمارے طبی اور فطری تحریکات کہ ہم انھیں روک نہیں سکتے۔ وہ اپنا تقاضا پورا کر کے رہتی ہیں۔ ارشاد ہوا ”بعض اوقات خوب میں بھی اشعار ہو جاتے ہیں، مثلاً یہ شعر:

دوزخ کے کسی طاق میں افسرده پڑی ہے  
خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلاکو

لیکن اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا“<sup>۳۰</sup>

مرزا جلال الدین کہتے ہیں ”اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ شب کی تہائی میں مرتب ہوتا۔ معمولی سے معمولی واقعات سے بھی فلسفہ کا کوئی پہلو نکال لیتے۔ ایک مرتبہ سر ذوالفقار علی، سر جو گندر سنگھ اور میں اقبال کے ساتھ نواب صاحب کی موڑ میں شالamar کی سیر کو نکلے۔ نواب صاحب کی موڑ بیش قیمت تھی۔ سر جو گندر سنگھ نے از راہ حیرت کہا نواب صاحب کی موڑ کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے۔ اقبال نے اسی فقرے پر اپنی نظم موڑ کی بنیاد رکھی اور کیا نئتہ پیدا کیا۔<sup>۳۱</sup>

ہے جادہ حیات میں ہر تیز پا خموش

پھر کہا:

شاعر کے فکر کو پر پرواز خامشی  
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

علی برادران کی رہائی میں امترس میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔<sup>۳۲</sup> جب نواب ذوالفقار علی، اقبال اور میں نواب صاحب کی موڑ میں امترس کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں باطن کر رہے تھے۔ اچاکنک اقبال پر کیفیت طاری ہونے لگی انھیں خاموش پا کرنوب صاحب نے ان کی

جانب دیکھا تو وہ کسی اور ہی دھن میں نظر آئے۔ کہنے لگے لو بھنی یہاں فکر شعر ہو رہی ہے۔.....  
چند ساعت کے بعد اقبال چوکے۔ فرمانے لگے نواب صاحب اب کہیں کیا ارشاد ہے معلوم ہوا  
بلبان اسی کی رہائی کے عنوان سے تین اشعار ابھی موزوں ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۳ پھر لکھتے ہیں  
بعض اوقات ان پر ایک معنی خیز سکوت سا چھا جاتا اور یوں دکھائی دیتا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں  
چلے گئے ہیں۔ پھر وہ یک لخت چونک پڑتے۔ گویا نیند سے بیدار ہوئے ہیں..... اس حالت  
کے ظاہر ہوتے ہی ہم سمجھ جاتے کہ ان پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہے۔ وہ شعر کی فکر میں ہے۔  
کئی مرتبہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جب اقبال کا دل کسی جذبے سے متاثر ہوتا تو وہ گردوپیش  
کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے۔ ۱۹۴۳

۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ مہینہ شاید اپریل یا مئی کا تھا۔ ایک مجلس میں اقبال، گرامی اور بمل  
تشریف رکھتے تھے۔ صاحب خانہ نے جوش اعلیٰ تھے اور نوازش تخلص کرتے ایک مصرع بر دیف  
اہل درد پڑھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے بیان کیا تھا کہ انھیں درد قلنخ کی شکایت ہے اور اس  
وقت اس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل کی فرمائش ہوئی اور اقبال نے  
بحالت درد و غزلیں اس زمین میں کیں۔ دونوں غزلوں کے مقططفے ہیں:

ارتجلاؤ ہم نے اے اقبال کہہ ڈالے یہ شعر  
تھی نوازش کو جو فکر امتحان اہل درد  
کہہ دیا اقبال اک مصرع نوازش نے جو آج  
وہ بہانہ ہو گیا بہر بیان اہل درد

مولوی عبداللہ بمل نے ایک فارسی قطعہ تہیداً ان غزلوں کے ساتھ لکھ کر بغرض اشاعت  
محزن کو بھیجا۔ یہ قطعہ فارسی میں ہے۔ دس اشعار پر مشتمل، بمل نے لکھا تھا:

یک شیے اقبال آن روح و روان اہل درد  
بود بمل با گرامی میہمان اہل درد  
میزبان از راہ شوخی مصرعہ بر جستہ خواند  
غالباً منظور بودش امتحان اہل درد  
ارتجلاؤ گفت اقبال این غزل از سوز دل  
داد سر طوفان بے تابی بجان اہل درد

گرچہ می پچید از درد شکم بر خویشن  
درد آسا آن چراغ دودمان اہل درد  
من پئے مخزن ازان محفل بخود آورہ ام  
نسخہ شور قیامت داستان اہل درد

رات کا وقت۔ بے تکلف احباب کا اجتماع۔ گرامی اور مکمل جیسے فارسی گواستاد موجود۔ اقبال درد اور تکلیف کے عالم میں قلم لے کر بیٹھے اور فی البدیہہ ۳۳ شعر کہہ ڈالے۔ دونوں غزلیں برجستہ گوئی کا نتیجہ۔ دونوں میں مسلسل روایتی طبیعت کی روایتی۔ درد کی شدت سے بے پرواہ مکملہ شعر گوئی وقت اور حالات سے بے نیاز۔ پہلی غزل کا مطلع ہے:

زندگی دنیا کی مرگ ناگہان اہل درد  
موت پیغام حیات جاوداں اہل درد

دوسری کا:

صبر ایوب وفا خو جزو جان اہل درد  
گریہ آدم سرشت دودمان اہل درد  
یہ دونوں غزلیں بانگ درا میں شامل نہیں۔ ۲۵۵

۱۸۹۰ء سے محمد اقبال کا کلام جو حسن اور دل کشی اختیار کر رہا تھا۔ ان کی زبان جس طرح منجھتی چلی جا رہی تھی اس کے باوجود اہل زبان نے اس پر متعدد اعتراض کیے۔ حالانکہ مولانا شبیل، مولانا نذری احمد، مولانا حمالی اور مرتضیٰ ارشد گورگانی ایسے اساتذہ فن انجیں دادِ تحسین دے چکے تھے۔ یہ اعتراضات تقید ہم درد کے عنوان سے شائع ہوتے اور ان کے دوست خوشی محمد ناظر بھی اس تقید کی زد میں آگئے۔ میر نیرنگ نے محمد اقبال کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ انبالوی کے نام سے مخزن میں مضامین لکھتے۔ لیکن خود محمد اقبال نے اس کا جواب نہایت خوبی سے دیا۔ جہاں کہیں زبان کے معاملے میں کوئی لغزش ہوئی اس کا اعتراض بھی خوش دلی سے کر لیا۔ لیکن انھیں دکھ تھا کہ مضمون نگار ناظر اور اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی بُنگی اڑاتا ہے۔ بھولتا ہے کہ اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہے۔ کہتا ہے پنجاب میں غلط اردو کا رواج ہونے سے یہ بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں بتلاتے غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ پھر اردو کہ ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زبان کس طرح پورے

ملک کی تحریر کر رہی ہے۔ تعجب ہے اہل زبان بھول گئے کہ محمد اقبال کو اردو سے والہانہ محبت تھی۔ انھیں کیسے اردو کی شانہ کشی کا کس قدر خیال تھا۔ اردو کی محبت ہی میں انھوں نے انگریزی میں اردو زبان پر ڈاکٹر رائٹ بر جنٹ کے مختصر مضمون کا ترجمہ لیا جو مخزن کے شمارے تمبر ۱۹۰۲ء میں چھپا اور جس کی اشاعت پر عبد القادر نے تمہید اکھا۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ اردو زبان کے بانکنین نے مغربی فضلا کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ ڈاکٹر رائٹ کا خیال تھا کہ اردو جس کی ابتداء قلعہ معلیٰ سے ہوئی پھیلتے پھیلتے ایک روز ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچ جائے گی۔ یعنی ہندوستان کی قومی زبان بن جائے گی۔ محمد اقبال بھی تو اپنے مضمون میں اس بات پر زور دے رہے تھے کہ اہل زبان کی زبان دانی ہجا، لیکن زبان کے تعصبات میں کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو صرف ایک چھوٹے سے خطے میں محدود ہو کر رہ جائے، پنجاب اور بنگال کے درمیان چند ایک شہروں میں۔

در اصل اہل زبان نے محض زبان کے تعصب میں محمد اقبال کی شاعری کو دیر تک سمجھے کی کوشش نہیں کی۔ یہ تنگ نظری ایک فطری امر ہے۔ جس کی مثالیں دوسری قوموں سے بھی مل جاتی ہیں اور اس میں ایک پہلو جواز کا بھی ہے کیونکہ اس طرح غیر اہل زبان غالطیوں سے بچتے ہیں۔ صحبت زبان میں فرق نہیں آتا۔ محمد اقبال کس صاف دلی سے کہتے ہیں: ”مجھے اساتذہ کی برابری کا دعویٰ نہیں۔ اگر اہل پنجاب مجھے، یا حضرت ناظر کو بھئے وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے جہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندازہ ہے تلقید ہم درد کے ایک ایک اعتراض کو لے کر اور پھر نہایت خوبی سے اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے مضمون کا خاتمہ یہ کہہ کر کس خوبی سے کیا کہ راقم مشہدی نے میرے دل کی بات لکھی ہے۔

نیم من در شمار بلبل اما به ایں شادم  
که من ہم در گلستان قشن مشت پرے دارم ۱۵۶

محمد اقبال کا یہ سارا مضمون نہایت سلجنچا ہوا، معلومات سے پر اور زبان کے بارے میں جن حقائق پر مبنی ہے ان سے ناقدان فن خوب خوب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میر ممتاز علی اور ابوالی صاحب کی وسعت خیال کی تعریف کرتے ہوئے بجا طور پر کہتے ہیں ”جوز زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورے اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اختراع کیے جا رہے ہوں اس کی صحت اور عدم صحت کا معیار قائم کرنا محالات میں سے ہے..... جہاں جہاں اس کا روایج ہو گا

وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تدقیقی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر نہ رہے گا۔ یہ علم الالینہ کا معلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحیت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات کسی لکھوئی یاد ہوئی کے امکان میں نہیں کہ اس کے عمل کو روک سکے۔ اگر کوئی شخص پنجابی محاورے کا لفظ استعمال کرے تو اسے کفر و شرک کا مرتكب مت سمجھو.....پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے ایک ایسی قید ہے جو اردو زبان کے اصولوں کے صریح خلاف ہے۔ مخزن میں یہ مضمون شائع ہوا تو عبد القادر نے نہایت ٹھیک لکھا کہ جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال نے کام لیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اسے اس بحث کا انتہا سمجھنا چاہیے۔<sup>۷۵۷</sup>

آگے چل کر انہوں نے زبان کے بارے میں کیا سمجھ لکھا ہے: ”میں زبان کو ایک بُت تصویر نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطلب کا ایک انسانی ذریعہ۔ زندہ زبان انسانی خیالات میں انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جب اس کی انقلابی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔“<sup>۷۵۸</sup>

”۱۹۳۳ء میں محمد اسد ملتانی مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم کے دولت کدہ دار السلام میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبان کا ذکر آیا تو فرمایا ”زبان تو اہل فخر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہل زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انھیں چکلی چوہے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لیے اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو حالات کے مطابق الفاظ تراشنا پڑنے ہیں۔“ پھر میرزا بیدل کے کلام سے خرام کا شتن کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: ”مولانا آزاد کے قاعدے میں لفظ لیزم آیا ہے (بے معنی مکدر) دہلی میں تو یہ لفظ پچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ پنجاب میں پچے کیا سمجھیں گے۔ استاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے ہیں۔“<sup>۷۵۹</sup> پھر کہتے ہیں: ”زبان میں اپنی اندر وونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات اور جذبات ادا کرنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے۔“<sup>۷۶۰</sup>

جتناب عبدالرضا بیدار نے ان مباحث کو جو اہل زبان کی طرف سے چھیڑے گئے رسالہ برہان دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۶۱ء میں جمع کر دیا ہے<sup>۷۶۱</sup> وہ کہتے ہیں لکھنؤ پہلا شہر ہے جس نے اقبال پر نکتہ چینی کا آغاز کیا۔ اس شہر نے حالی کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ مگر اقبال پر خاص طور سے لے دے ہوتی تھی۔ ویسے ادبی بحث و نظر کا سلسلہ اقبال اور حسرت موبہانی میں بھی رہا۔ لیکن

افہام و تفہیم کی حد تک دوستانہ روح کے ساتھ۔ چنانچہ علی گڑھ سے جب اردوئے معلیٰ نکلتا تھا حسرت کے اعتراض اقبال کے جواب اور پھر جواب اور پھر جواب الجواب اس میں چلتے رہتے تھے اور چونکہ مقصد تعمیری تھا اس لیے ان مذکرات کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ بعض اوقات اقبال نے حسرت کے بعض مشورے بھی قبول کیے..... اودہ پنج میں اقبال کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ممتاز حسین عثمانی اس کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے ۲۸ء کی اشاعت میں اقبال کی خامیاں نام کتاب پر ایک روپو شائع کیا گیا جو بعض کم نظر اہل زبان کی معاندانہ روش کا ایک نمونہ تھا۔ اس تحریر سے دو باتیں خاص طور پر سامنے آئیں۔ پہلی یہ کہ اقبال کی زبان کو اغلاط کا مرتكب سمجھ کر ہدف بنایا گیا۔ دوسرے یہ کہ اقبال کے کلام کے معانی اور پیغام سے تو کوئی بحث نہیں کی گئی مگر صحت و صفائی زبان پر لغویت اور بد مذاق کے ساتھ زور دیا گیا۔ گویا اقبال کی اردو میں فارسیت کے اثر کی جو پیروڑی کی گئی تھی وہ بھی اسی ذہنیت کا نتیجہ تھی۔

رضا بیدار کہتے ہیں مولانا سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور عرض کیا گیا کہ اردو تو سارے ہندوستان کی زبان ہے۔ آپ کیا یہ چاہتے ہیں اردو لکھنؤ کار پوریشن کے حدود سے باہر قدم نہ رکھے؟ انھوں نے کہا: میں نے تو اقبال کی زبان پر بہت کم گرفت کی ہے۔ ان سارے اعتراض میں چکست، بیدم وارثی، شاہ ولگیر اور منشی سجاد حسین مدیر اودہ پنج کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ۲۶۲ مولانا تو نہایت مخلص اور سچے انسان تھے۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا صحیح جس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بیہاں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ مسخرن شمارہ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں ترانہ ہندی، شائع ہوا تو مولانا حسرت مولانی نے اردوئے معلیٰ شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء میں لکھا۔ حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جا رہی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور اختیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ایسی ہی نشر میں بھی کرتے رہیں۔ مولانا نے لکھا اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحت زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑے جاتے ہیں اور فکرے چینیوں کی نکتہ چینیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نے ترانہ ہندی کے مصروع، معلوم ہے ہمیں کو درد نہان ہمارا پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا ہمارا کی بجائے اپنا ہونا چاہیے تھا۔ پھر جب اس معلوم کیا کسی کو معلوم ہے ہمیں سے بدل دیا گیا تو انھوں نے اس تبدیلی کی تعریف کی۔<sup>۲۶۳</sup>

رضا بیدار کہتے ہیں اہل زبان میں ایک طبقہ وہ بھی تھا جو محمد اقبال کی شاعری کا دل سے

قالِ تھا۔ کتنے ماہنامے تھے جن کے سرورق کو ان کے اشعار سے زینت دی جاتی۔ تمدن ۱۹۱۱ء میں شیخ محمد اکرم اور راشد الحیری کی ادارت میں جاری ہوا۔ شیخ محمد اکرم مسخرن کی ادارت کر چکے تھے۔ محمد اقبال کے احباب خاص میں سے تھے۔ محمد اقبال بے غرض تعلیم انگلستان روانہ ہوئے تو وہی میں شیخ صاحب ان کے ساتھ تھے۔ تمدن نے محمد اقبال کی ایک فارسی غزل بڑے اہتمام سے شائع کی۔ پروفیسر مرزا محمد سعید<sup>۲۶۳</sup> نے تمہیداً لکھا۔ حضرت اقبال کے اردو کلام سے ایک زمانہ مستفید ہو چکا ہے۔ لیکن یہ امر نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ جناب موصوف فارسی کلام پر بھی کما حقہ قدرت رکھتے ہیں..... ان کی طبع نیساں کا یہ ترشیح امید دلاتا ہے کہ تمدن کی کشت مضامیں آئندہ بھی ان کے ترشحات قلم سے سیراب ہوتی رہے گی۔ اردو فارسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اہل زبان کو زیادہ تر اعتراض محمد اقبال کی فارسیت پر تھا۔ مرزا صاحب نے اس اعتراض کی نفعی یہ کہ کہ اردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، نہایت خوبی سے کردی۔ زمانہ کان پور نے قومی نمبر نکالا تو محمد اقبال سے استدعا کی کہ اس کے لیے کوئی شعر عنایت کریں۔ درد عشق شاید اسی تقریب کے لیے لکھی گئی۔ شمع آگرہ کو بھی محمد اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ یہ تو خیر شعرو شاعری کا معاملہ تھا جہاں تک زبان کا تعلق ہے لکھنؤ ہی نے اگرچہ محمد اقبال کے خلاف ایک محاذ قائم کر رکھا تھا۔ مگر لکھنؤ ہی سے وصل بلگرامی نے مرقع کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تو ان سے سرورق کے لیے شعر کی درخواست کی۔ انھوں نے دو تین شعر ارسال کیے۔ وصل کو تیسرا شعر بہت پسند آیا جو مرقع کے سرورق کی زینت رہا۔ وصل نے لکھا میں جناب علامہ داکٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی بالقبہ پیر سٹرائیٹ لا لا ہور کے نام نامی سے ابتداء کرتا ہوں جنھوں نے اپنا ایک شعر خاص مرقع کے سرورق کے لیے عطا فرمایا۔<sup>۲۶۴</sup>

گویا حضرت بیدار کا کہنا ہے کہ اہل زبان کا سخن فہم طبقہ، ہر حال محمد اقبال کی شاعری کا قالِ تھا جس کی شبلی، نذرِ احمد، حائل ایسے اساتذہ نمندادے چکے تھے۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اہل زبان اور غیر اہل زبان کا نہیں تھا۔ سخن شناسی اور سخن فہمی کا تھا۔ بات ۱۹۰۵ء سے آگے نکل چکی ہے۔ لیکن یہاں اسے ناتمام چھوڑ دینا مناسب نہیں آگے چل کر تفصیل اس کا ذکر آئے گا۔ یہاں قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ شاعری اس دور میں غزل ہی میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور غزل کا رنگ وہ نہیں تھا جو محمد اقبال کی شاعری کا۔ پروہ زمانہ تو کیا اب بھی شاید اس کا انداز وہی ہے جو اس زمانے میں تھا۔ رنگ سخن ان معنوں میں نہیں بدلا جن معنوں

میں دراصل اس شعروادیت اسلامیہ محمد اقبال نے اسرار خودی میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، بل زبان کے یہاں تو زبان کی آڑ میں ان کی شاعری ہدف اعتراض بن سکتی تھی۔ غیراہل زبان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ ورنہ جہاں تک مذاق خن کا تعلق ہے معاملہ کم و بیش ایک ساتھ۔ اس صمن میں عزیز احمد کی ایک عبارت کا اقتباس بے محل نہ ہو گا تاکہ بات ادھوری نہ رہ جائے۔ ”اس میں کوئی بیک نہیں کہ بعض شاعروں کا کلام بعض قوموں کی روح حیات کو بہت متاثر کرتا رہا ہے۔ مثلاً ہومر کی شاعری یونانیوں کے لیے اور هتلر کی شاعری جرمنوں کے لیے ایک بہت بڑا قومی تھیار تھی۔ لیکن شاید ہی دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر ہو کہ ایک شاعر نے ایک قوم کو اس کے وجود سے خبردار کیا۔ اسے بقا کے طریقے بتائے۔ بقا کی جدوجہد میں اس کا ہاتھ بٹایا اور آزاد ہو کر دنیا کے نقشے پر اپنے لیے ایک جگہ محفوظ کرنے کا راستہ دکھایا۔ یہ سارا کام شاعر نے اپنی فکر، حکمت، شاعری سے کیا۔ ادب اور فون لطیفہ کی تحریک اقبال کا سب سے بڑا اور زندہ تحفہ ہے۔ اس نے ایک ملک کی تعمیر کی بنیاد رکھی ہے اور ایک قوم کو صدیوں کے بعد جگایا ہے.....“<sup>۶۶</sup> یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ محمد اقبال کی شاعری کا دور اول ہی تھا جس سے اس تحریک کا جس کی طرف عزیز احمد نے اشارہ کیا ہے، آغاز ہوا۔ محمد اقبال کے مفترض اس نکتے کو نہیں سمجھے۔ حالی، شبلی، نذری احمد البتہ سمجھ گئے تھے۔

عبدال قادر نے البتہ اپنے ہلکے شندروں میں بڑے کام کی باتیں کی ہیں۔ گویا یہ عبد القادر ہی تھے جنہوں نے مخزن کے ذریعے ان کی شاعری کا وسیع پیمانے پر تعارف کرایا۔ بالخصوص اس لیے کہ بجز ایک محمد اقبال کی شاعری پر اس زمانے میں کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ شاعری کے اس دور ہی میں محمد اقبال نے اردو غزل کو جوئی جہت دی۔ ان کے ملی اور فکری آپنگ سے اردو ادب کو جوئے نظریے ملے۔ نئے نئے رجحانات اور خیالات ابھرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا غلغله جس طرح ہندوستان میں پھیل گیا۔ ان کے ماحول اور قدردانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، نامکن تھا اس سے ان کے ہم عصر شعراء متاثر نہ ہوتے۔ عبد القادر لکھتے ہیں：“ان کی عظمت اور فضیلت دراصل اس اثر اور گھرے نقش میں مضمرا ہے جو انہوں نے اپنے زمانے کے اردو ادیبوں اور شعراء پر چھوڑا۔..... ان کی ترقی اور شہرت کے ابتدائی دور میں ان کے دو ہم عصر نادر کا کورڈی اور سرور جہاں آبادی تھے..... ان دونوں کے کلام میں اقبال کے ابتدائی رنگ اور انداز کلام کی جھلک ملتی ہے۔ اقبال کے ایک اور ممتاز ہم عصر پنڈت چکبست

لکھنوی..... ان کے بڑے ماحول میں سے تھے، ۱۸۷۳ء اس سلسلے میں شیخ صاحب نے جوش ملیح آبادی، دکن کی ممتاز شاعرہ بیشرا النساء بیشرا اور ڈاکٹر عباس علی ۱۸۷۸ء کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر نادر کا کوروئی اور سرور جہان آبادی ان سے بالخصوص متاثر تھے۔ دونوں کو ان سے بڑا اعلق خاطر اور بڑی ارادت تھی۔ نادر کا کوری نے ریفارمیشن کے زیر عنوان مسخرن کے لیے ایک نظم لکھی تو اسے اپنے ہم خیال دوست شیخ محمد اقبال صاحب کے نام نامی سے معون کیا۔ ۱۸۷۹ء محمد اقبال انگلستان میں تھے۔ سرور جہان آبادی نے ایک نظم لکھی بے عنوان 'فضائے'، بر شگال اور پروفیسر اقبال، دو بند بیس۔ پہلے بند کو برسات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس شعر پر ختم کیا ہے:

بہار آئی شفقت ہوئے گل پنجاب  
چہک چہک کہ کدھر تو ہے بلبل پنجاب

اشارة محمد اقبال کی طرف ہے۔ دوسرے بند میں یہ کہتے ہوئے کہ برسات کے لیل و نہار کا تقاضا کیا ہے۔ ان سے شکلیہ کہتے ہیں:

ترے بغیر ہیں مرغان نغمہ زن خاموش  
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش

اس نظم کی اشاعت کو چند ہی مینے گزرے تھے کہ عبد القادر نے لکھا: "ہمارے مکرم منشی درگاہ سہائے صاحب سرور جہان آبادی کی تحریک بے سود نہ ثابت ہوئی۔ شیخ محمد اقبال سے ایک غزل لکھوا کے ہی رہے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ مصروفیت کا وہی عالم ہے لیکن مجھے اندر یہ ہے حضرت سرور جنہوں نے میری خاموشی کو توڑنا چاہا، کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ اس لیے ان کی نظم کے شکریے میں سردست یہ غزل بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ عقریب کچھ اور بھی بھیجبوں گا۔" ۱۸۷۹ء پوری غزل بانگ درا حصہ دوم میں موجود ہے۔ مطلع ہے:

چک تری عیاں بکل میں آتش میں شرارے میں  
جھلک تری ہو یادا چاند میں سورج میں تارے میں

محمد اقبال کی شاعری کا غلغله ہندوستان میں دور دور تک پھیل رہا تھا۔ ان کے ماحول اور قدردانوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ان کی تعریف میں شعر کہے جاتے۔ تحریروں اور تقریروں میں خراج تحسین پیش کیا جاتا۔ ایک صاحب تھے بدral الدین قیصری۔ انہوں نے محمد اقبال کی شان میں کچھ اشعار اور ایک قطعہ فارسی میں بطور تمہید لکھا ان کی شاعری کی طرح طرح

سے تعریف کرتے ہوئے کہ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی:

از ہم خوبیں بہ رعنائی لیگانہ بودہ  
وز جمال خوش در عالم فسانہ بودہ۔  
امید ظاہر کی کہ وہ جو ہر قابل جوان ہیں مبداء فیاض سے ملا ہے اس کی بدولت آگے ہی آگے  
بڑھیں گے۔ دعا کی:

طیع تیری غیرت صد ابر نیانی رہے  
ذات تیری مظہر الطاف یزدانی رہے

قیصری نے جو کچھ کہا، جن توقعات کا اظہار کیا اپنی جگہ پر ٹھیک لیکن ایک بات ہے کہ اسے کہہ بغیر نہیں رہا جاتا اور وہ یہ کہ شاعری کے اس دور میں بھی محمد اقبال کی نظر گیر حقائق پر تھی۔ علوم و معارف میں بھی ان کا مطالعہ و سعیٰ تر ہو رہا تھا۔ فطرت انسانی کے بعض شناس تھے۔ خوب جانتے تھے وطن کے مسائل کیا ہیں۔ ان کا حل کیا ہے۔ مسلمان عکبت اور ادب اور کن پستیوں میں جاگرے ہیں۔ ان کا شعور ملی کہاں تک مضمحل ہو چکا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے انہیں خیالات اور جذبات کے زیر اثر۔ مگر اس کے باوجود ایسا بھی ہوتا کہ ان کی شاعری میں غزل کا عام رنگ لوٹ آتا۔ عقائد پر بھی کہیں کہیں روایات چھاؤنی ہیں۔ غلو بھی ہے اور جذبات میں بے اختیاطی بھی جس کا ان کے فکر اور فرہنگ حتیٰ کہ اس پیغام اور دعوت کی بحث جو ان کی شاعری کا حاصل ہے، کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تا کہ اندازہ ہو جائے ان کا ذہن کیسے کیسے خیالات اور جذبات کا آماج گاہ تھا۔ اس کا گزر کہاں کہاں ہوا اور ہو رہا تھا۔ کیسے طرح طرح کے مرحل طے کرتے ہوئے وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچے۔ پھر اس لیے بھی کہ دور اول کا یہ کلام جوان کے مطبوعہ یعنی اس کلام سے جسے بانگ درا میں جگہ دی گئی ضخامت میں دو چند بلکہ دو چند سے بھی زیادہ ہے اس امر کی دلیل ہے کہ محمد اقبال کے ذہن میں جیسا کچھ خیالات کا زور اور جذبات میں جس طرح یہجان تھا اس کے ساتھ ساتھ ان کے تصنیفے اور تر زیکے کا عمل بھی ویسی ہی شدت اور تیزی سے جاری تھا۔ وہ اس اساس سے جواب دتا ہی میں قائم ہو چکی، ہٹنے نہیں پائے، یوں ہم ان کے ضمیر اور باطن ہی سے قریب تر نہیں ہو جاتے ان کی شاعری کی تہہ تک پہنچنا بھی مشکل نہیں رہتا۔ بہر حال یہ محمد اقبال کی شاعری کا ایک عظیم دور تھا۔ آنے والے عظیم تر ادوار کی بڑی کامیاب اور امید افزائ تھیں۔

### ۱۳۔ وطنیت

بانگ درا کی بعض نظموں مثلاً تصویر درد، صدائے درد، تراہہ ہندی اور بالخصوص نیاشوالہ کی بنا پر اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ جب تک محمد اقبال یورپ نہیں گئے، اہل یورپ کے سیاسی اجتماعی حالات سے متاثر نہ ہوئے، مغرب کے افکار و آراء کا اس پہلو سے مطالعہ نہیں کیا ان کا نقطہ نظر بڑا محدود تھا۔ ہندوستان پر مرٹکز۔ وہ سمجھتے تھے ہندوستانی، ہندو ہوں یا مسلمان ایک قوم ہیں۔ ایک قوم ہی کی حیثیت سے انھیں زندہ رہنا اور اپنا مستقبل تعمیر کرنا ہے۔ وہ گویا جغرافی قومیت کے قائل تھے۔ اسلامی قومیت کا تصور ابھی ان کے ذہن میں نہیں اُبھرا تھا۔ یورپ گئے تو یورپ سے متاثر ہو کر اسلامی قومیت کا تصور اپنے ساتھ لائے۔ اب اسے عالم گیر انسانیت کہیے یا عالم اسلام کی وحدت یا امت کا یہ تصور کہ وہ ایک سیاسی اجتماعی بینیت ہے، جغرافی حدود و ثقور سے آزاد، رنگ و خون کے انتیازات سے بالاتر، بالفاظ دیگر یہ حقیقت کہ اسلامی قومیت کی اساس ہے تو حیدور سالت، سمجھ میں آئی تو اس میں میر حسن کے ہاتھوں ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی دخل تھا نہ اسلامی تعلیمات میں ان کے مطالعے اور فکر و نظر، نہ سرسید کے سیاسی مسلک کی پیروی کا جن کا کہنا تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک قوم ہیں۔ تھا تو استاد ان فرنگ سے اثر پذیری کا جو خوب بھی نہیں جانتے تھے اسلامی تعلیمات کیا ہیں۔ اسلام کا سیاسی ملی نصب العین کیا۔ رہے یورپ کے سیاسی اجتماعی حالات، سیاست و اجتماع میں اہل فرنگ کے نظریات محمد اقبال دوران تعلیم ہی میں یا یوں کہیے اس سے پہلے کہ یورپ جائیں ان سے واقف ہو چکے تھے۔ لہذا یہ خیال کہ شروع شروع میں وہ جغرافی قومیت کے قائل تھے، اسلامی قومیت کا تصور بعد میں اُبھرا، غلط ہے۔ حقیقت سے اتنا ہی دور جیسے ایک قطب سے دوسرا انھوں نے زندگی کے کسی دور میں بھی وطنی قومیت کا نظر یہ قبول نہیں کیا۔ نہ کبھی ہندوستانی قومیت کی جس کا آگے چل کر متحده قومیت کی شکل میں پرچار کیا گیا، حمایت کی۔ ان کا ذہن اسلامی تھا۔ وہ اسلام کی عالم گیر دعوت سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کی حب الوطنی اور انسان دوستی کی طرح ان کی سیاسی بصیرت نے ان سے جو نظمیں لکھوائیں ان کی غلط تعبیر کی گئی۔ ان کو وہ معنی پہنانے کے جوان سے نہیں نکلتے۔ ان میں کچھ تملک کے بدلتے ہوئے حالات کا دخل تھا، کچھ ارباب سیاست کا جو سمجھتے تھے کہ ان نظموں کی تعبیر اگر وطنیت کے رنگ میں کی گئی تو

اس سے ان کے عوام کو تقویت پہنچے گی۔ کچھ یہ بات کہ اہل قلم کو ایک موضوع بحث مل گیا۔ انھوں نے نہیں سوچا یہ نظمیں کب اور کن حالات میں لکھی گئیں۔ اس زمانے میں جب محمد اقبال حب الوطنی کے گیت گارہے تھے ملک کی سیاسی اجتماعی فضا کیا تھی۔ خیالات اور صورات کا کیا عالم تھا۔ انھوں نے جب کہا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا  
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستان ہمارا

تو کیا وطن پرستی کے جوش میں؟ اس خیال کے ماتحت کہ مسلمان ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ان کا وطن ہے۔ انھیں چاہیے عالم اسلام سے قطع نظر کر لیں، یا اس لحاظ سے کہ دوسرے اقطاع عالم کی طرح انھیں بھی ہندوستان سے وہی نسبت ہے جو اہل وطن کو وطن سے ہوا کرتی ہے۔ وطن کس کو عزیز نہیں ہوتا۔ اس کے حسن و خوبی کا کون ذکر نہیں کرتا۔ خواہ اس کے سیاسی نظریات کچھ ہوں۔ ہندوستان کیا مسلمانوں کا وطن نہیں تھا۔ ہندوستان بھی مسلمانوں کا ایسے ہی وطن تھا جیسے دوسروں کا۔ وہ بھی اہل وطن کے ہم زبان ہو کر کہہ سکتے تھے:

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

محمد اقبال نے وطن کی محبت میں کئی نظمیں لکھیں۔ ۱۸۵۷ء میں سلب اقتدار کے بعد جب ایسا معلوم ہوتا تھا مسلمانوں کا اس ملک میں کوئی ٹھکانہ نہیں، انھوں نے یہ نظمیں اگر جذبہ و طبیت کے ماتحت لکھی ہوتیں تو غور طلب امر یہ ہے کہ ان نظموں میں اگرچہ قطع و برید کی گئی۔ بعض ایسے اشعار جن سے غلط فہمی کا اندازہ تھا، حذف کر دیئے گئے۔ بایں ہمہ بانگ درا میں ان کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ نظمیں دور و طبیت کی یاد گار ہیں۔ گویا ان کی موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ نظمیں وطنی قومیت کے زیر اثر نہیں لکھی گئیں بلکہ یہ وطن کی محبت اور وطن کے لیے دل سوزی تھی جس نے ان سے یہ نظمیں کھلاوائیں۔ ان کا لاب و لہجہ سیاسی ہے۔ روح اخلاقی اور انسانی حتیٰ کہ تصویر درد کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے جیسے یہ نظم آج ہی لکھی گئی۔ ان کا محرك کبھی نہیں پدلا۔ نہ اس مقصد میں فرق آیا جو ان میں کافر ماتھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آگے چل کر اس باب میں جو کچھ کہا گیا اس کا لاب و لہجہ مختلف ہے۔ نظم کی جگہ پیشتر نہ لے لی ہے۔ ورنہ ان کے سیاسی افکار کو دیکھیے۔ ضرب کلیم، جاوید نامہ اور پس چہ باید کرد، اسے اقوام شرق پر نظر رکھیے ان سب میں انھیں خیالات کا اعادہ ہو رہا ہے جن کا انہمار ان نظموں

میں ہوا۔ چنانچہ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اہل وطن کو آج بھی اعتراض ہے۔<sup>۱۸۵</sup> رہی یہ بات کہ نظمیں کن حالات میں لکھی گئیں۔ ان کا محکم کیا تھا، اس کے پیچے کیا خیال کام کر رہا تھا۔ سود یکھنا چاہیے کہ محمد اقبال نے جن نظموں میں بار بار وطن کی محبت پر زور دیا۔ اہل وطن کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارا۔ اختلاف مذہب کی بنا پر نزاع و فساد سے روکا تو اس لیے نہیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وطن کی بنابرایک قوم پیدا کی جائے۔ برکس اس کے یہ محمد اقبال کا اسلامی ذہن تھا۔ یہ ان کا شعور ملی تھا، سیاسی بصیرت، انسان اور انسانیت کا پاس کردار اغور سے کام لیجھتا معلوم ہو جائے گا کہ ان نظموں میں ایک شعر کی بجائے ایک ایسا دیدہ و رور حقیقت بین سیاست دان کا دل و دماغ کارفرما ہے جسے نوع انسانی سے محبت ہے، جسے غلامی اور مخلوقی کا دکھ ہے، جس کا دل آزادی کے لیے تڑپ رہا ہے۔ جو خوب جانتا ہے کہ جب قومیں تعصب اور تنگ نظری کے ہاتھوں سطح انسانیت سے گر جائیں تو مذہب، اخلاق، سیاست اور جہاں بانی کی حقیقی روح گپل دیتی ہیں۔ محمد اقبال دیکھ رہے تھے کہ اہل وطن نے محض اختلاف مذہب کی بنا پر نفرت اور مخاصمت کا جو حصار قائم کر رکھا ہے انھیں اور زیادہ ذلت اور پستی کی طرف لے جائے گا۔ حالانکہ وہ ایک ہی خطے میں بس رہے ہیں۔ اس سرزی میں کے باشندے ہیں جو ہندوستان کے نام سے اقوام عالم میں اُبھری۔ جس کی شان و شوکت کا دُنیا بھر میں شہرہ تھا۔ لیکن ہم تعصب اور تنگ دلی کا شکار ہو گئے۔ ہمارے دل چھوٹے تھے۔ نگاہیں محدود۔ ہمیں صرف اپنا وجود نظر آتا تھا اور کچھ نظر نہ آتا۔ ہمارا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھائیں۔ ہم ایک دوسرے کو کچھ اڑتے تو خوش ہوتے۔ اختلاف مسلک و مشرب نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے فتح حاصل کی تو سمجھے میدان مار لیا، بازی جیت لی۔ بھول گئے ہماری جیت جیت نہیں ہے، ہار ہے، بالآخر جو پایا تھا کھو دیا۔ سب کچھ ہار کر غلامی اور مخلوقی کے گڑھے میں جا گرے۔

۱۸۵ء میں رہا سہا اقتدار بھی جاتا رہا۔ سوال یہ تھا ماضی میں تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب ہندوستان کا مستقبل کیا ہے۔ ہمیشہ کی غلامی اور مخلوقی یا پھر سے آزادی اور اشتراکی زندگی۔ وہ تفرقہ اور انتشار جاری رہے جس کی بدلت ہمیں نکبت اور ادبار نے آ لیا یا اسے محبت اور رواداری، اتحاد اور اتفاق سے بدلت دیں۔ یہ محمد اقبال کی سیاسی بصیرت تھی، ان کا اخلاقی اور انسانی ضمیر جس نے اہل وطن جن کا سیاسی شعور مردہ ہو چکا تھا، ملی روح خوابیدہ انھیں بروقت

متعبیہ کیا کہ ماضی سے درس عبرت لیں۔ اقوام و امم کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ حالات کو دیکھیں زمانہ بدل چکا۔ کیوں نہ اپنے ضمیر اور باطن کو جھوڑیں۔ مذہب کی تعلیم کیا یہی ہے کہ ایک دوسرے سے یہ رکھیں۔ سیاست کا تقاضا یہی ہے کہ آئے دن برسر پر خاش رہیں۔ آزاد تھے تو ہوس اقتدار میں باہم لڑتے رہے۔ لیکن اب مکومی ہے۔ اب بجزخ و آشی کوئی چارہ کار نہیں یہ بات سمجھنے کی تھی انہوں نے کہا اور نہایت ٹھیک کہا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو  
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

محمد اقبال کوئی سطح بین اور مصلحت شناس سیاست دان نہیں تھے کہ نظر بر حالات اہل وطن کو حب الوطنی میں اتحاد و اتفاق کا سبق دیتے۔ محمد اقبال کی نگاہیں تاریخ پر تھیں۔ سیاسی اجتماعی حقوق کے ساتھ ساتھ اس تبدیل شدہ صورت حالات پر جو سرکار برطانیہ کی بدولت پیدا ہوئی۔ ہندوستان کی زمام اقتدار اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک ہی آئین، ایک ہی حکومت اور ایک ہی علمداری تھی جس کے ماتحت زندگی بس رکھ رہے تھے، پھر جب اختلاف عقائد، نسل اور زبان حتیٰ کہ بعد مسافت کے باوجود ان کا حال ایک تھا، جیسے ماضی ایک۔ جب صدیوں کے میں جوں نے انھیں طرح طرح سے وابستہ کر رکھا تھا۔ جب ایک نہیں کئی رشتے ان کے درمیان کام کر رہے تھے۔ کیسی کیسی ہم آہنگیاں تھیں جو سیاست اور معیشت تو درکنار روز مرہ کی زندگی عادات اور اطوار حتیٰ کہ رسم و رواج میں انھیں ورثے میں ملیں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ ہے، لڑکہ بھی ایک رہے۔ اس لیے کہ ان کا تعلق ایک ہی سر زمین سے تھا۔ ماضی کی طرح مستقبل بھی اسی سر زمین سے وابستہ۔ ذرا آج سے ایک صدی بیشتر ۱۸۵۷ء سے کوئی نصف بعد کے ہندوستان کا تصور کیجیے جب محمد اقبال نے وطن کی محبت میں اہل وطن کو محبت اور افتخار کا سبق دیا۔ جب وہ ایک ہی سلطنت کے زیر نگین تھے۔ جب ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آئین و قانون اور حکمرانی کی جو صورت تھی باعتبار اس کے اصلاح احوال کا کوئی امکان تھا تو یہی کہ اب ہم سمجھیں میدان سیاست میں ہم ایک دوسرے کے حلیف ہیں حریف نہیں ہیں۔ یونہی وطن کے لیے کسی روشن مستقبل کی توقع کی جا سکتی تھی۔ یہ گویا محمد اقبال کی سیاسی بصیرت تھی جس نے ان سے یہ نظمیں کھلاوائیں۔ ان کا لب والجہ وطنی ہے، روح سیاسی۔ وہ خوب جانتے تھے جب تک ضمیر انسانی خلوص و صداقت سے بے بہرہ ہے۔ سیاست ہو یا

معاشرت، انسان کا انسان سے حسن سلوک، کوئی نصب اعین اس میں کامیابی ممکن نہیں۔ ہاں الفاظ ہوں گے۔ نوع انسانی کی محبت ہو، یا انسان کی انسان کے لیے خیرخواہی یہ سب دعوے جسد بے جان ہو کر رہ جائیں گے۔ سیاست مردہ ہو گی یا جارحیت پر اتر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ محمد اقبال کی ان نظموں میں جذبہ حب الوطنی کے ساتھ ساتھ وہی اخلاقی روح کا بھی کارفرما ہے جو منتهاً انسانیت ہے اور جو انھیں اسلام سے درٹے میں ملی۔ پھر قطع نظر اس مسئلے کے اخلاقی پہلو سے جو ہندوستان کو بسببِ مکونی اور غلامی درپیش تھا۔ قطع نظر اس شدید سیاسی اجتماعی صدمے سے جو ۱۸۵۷ء میں اہل وطن کو پہنچا حالات کا تقاضا تھا کہ ان کے اذہان و قلوب میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہو۔ وہ تبدیلی جس پر محمد اقبال زور دے رہے تھے اور جس کا بھی خواہان وطن کو ہندو ہوں یا مسلمان ہر ایک کو بخوبی احسان تھا۔ جب ہی تو اہل سیاست کی زبان پر اس وقت ایک ہی لفظ تھا اور وہ اتحاد۔ اس لیے کہ سب ایک ہی وطن میں بس رہے تھے۔ ایک ہی صیاد کے تختیر، ایک ہی فڑاک میں بندھے ہوئے۔ باہم مل کر ہی اس سے گلو خلاصی کر سکتے تھے۔ محمد اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے محبت اور یگانگت کے ان الفاظ میں جو سب کی زبان پر تھے اور جس کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں تھا، خلوص اور صداقت کا رنگ بھرا تا کہ مذہب اور اخلاق کی حقیقی روح بیدار ہو۔ اہل وطن ایک دوسرے کی طرف اتحاد اور تعاوون کا ہاتھ بڑھائیں۔ سیاسی سوچ بوجھ سے کام لیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ملک کی نضال عصوب اور ننگ نظری کے باعث جس طرح زہر آسودہ ہوتی رہی اس میں فرق نہ آیا تو انجمام وہی ہو گا جو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اب اسے محمد اقبال کی سیاسی بصیرت کہہ لیجیے، جذبہ حب الوطنی، انسان اور انسانیت کا وہ تصور جس سے اس کا شرف قائم ہے، جو چاہے کہہ لیجیے۔ یہ وطن پرستی اور وطنیت، یا قومیت کا مادی اور جغرافی تصور ہرگز نہیں تھا جو ان کے ذہن میں کارفرما تھا۔ وہ جب دیکھتے ہندوستان قفرمذلت میں جاگ رہے۔ احسان ذات سے بے بہرہ، بھخن، اختلاف عقائد اور تمیز ملت و آئین کے نام پر نفرت اور کلدورت کا شکار ہو رہا ہے۔ اس نے زمانے سے کوئی سبق نہیں سیکھا تو انھیں دکھ ہوتا۔ بھی ماپس ہو کر کہتے:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیط آب گگا تو مجھے

کبھی بافسوں:

سر زمینِ اپنی قیامت کی نفاقِ آنگیز ہے  
وصل کیسا، یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے  
وہ سوچتے اہلِ وطن سے کہیں تو کیا کہیں:

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں  
اس چین میں آہ لطف نغمہ پیرائی نہیں

ان کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ نظر ان قدرروں پر جو حسن سیاست اور معاشرت کی  
جان ہیں۔ وہ چاہتے تھے ذہن انسانی ان آلاتشوں سے پاک ہو جائے جن سے انسانیت کا چہرہ  
داغ دار ہو رہا ہے۔ ان کا جی اہلِ وطن کی نفاقِ آنگیزی پر کڑھتا۔ انھوں نے ان سلبی قوتوں کی  
نمدت کی جو تعصّب اور تنگِ دلی کے پردے میں نفرت اور عداوت کو جنم دیتی ہیں۔ انھوں نے  
سیاست کا رشتہ اخلاق اور روحانیت سے جوڑا۔ نوع انسانی کی محبت اور عالمگیر اخوت کے ان  
ہمہ گیرروابط اور قدرروں کی ترجیمانی کی جو معاشرے کا تارو پود ہیں۔ جن کی بدولت تہذیب و  
تمدن کا وجود قائم ہے۔ چنانچہ ان کی یہی نظمیں جن کی تعبیر غلطی سے وطنیت کے رنگ میں کی گئی  
انسان کے لیے ہمدردی اور دل سوزی کی آئینہ دار ہیں۔ خدمتِ خلق کا جذبہ رہ کر ان کے دل  
میں اُبھرتا۔ کنج تہائی میں بھی جب دنیا کی محفلوں سے اکتا کرسب سے الگ ہو بیٹھے ان کا جی  
چاہتا تھا کہ اس حالت میں بھی دوسروں کے کام آئیں:

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم  
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

فریب وریا کی اس دنیا سے دور جا کر جس میں غرضِ مندی ہی غرضِ مندی ہے، دامن  
فطرت میں پناہ لی تو جب بھی خیال آتا کہ ان کے دکھ درد سے شاید دوسروں کے دل میں بھی  
خدمتِ خلق کا جذبہ جاگ اُٹھے:

ہر دردِ مندِ دل کو رونا میرا رلا دے  
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اندریں صورت اگر محمد اقبال نے ہندوستان کو اپنا وطن کہا۔ اس کی عظمت رفتہ، حسن اور  
دل کشی کی تعریف کی۔ اہلِ وطن کے جذبہِ حبِ الوطنی کو اُبھارا۔ اس کی محبت کے گیت  
گائے۔ اس کی آزادی اور استخلاص کی آرزو میں ایسی ولوہ آنگیز نظمیں لکھیں جن کی مثال

ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے وطن پرست اور انقلابی کے یہاں بھی نہیں ملتی تو اس لیے نہیں کہ ان کا ذہن وطنی قومیت پر مرتکز تھا۔ عالمگیر انسانیت کا تصور ہنوز پیدا نہیں ہوا تھا۔ شعور ملیٰ بیدار ہوا تو یورپ کی آب و ہوایں۔ حالانکہ ان کے نام نہاد وطنی اور قومی آہنگ میں ان کا ملیٰ اور فکری آہنگ اسی شدت سے کام کر رہا ہے جیسے آگے چل کر اس نے ایک دعوت اور پیغام کی شکل اختیار کی۔ یہاں یہ کہنا برا بے محل ہو گا کہ اس زمانے میں تو ان کے یہاں عالمگیر انسانیت یا اسلام کی ملی وحدت کا اظہار واضح الفاظ میں نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ عالمگیر انسانیت اور اسلام کی ملی وحدت، ہی کا شعور تھا جس سے ان کا ذہن ہندوستان کی طرف منتقل ہوا۔ اس لیے کہ ہندوستان ان کا وطن تھا اور وطن بھی کیسا جہاں اسلام کا ایک ماضی تھا۔ جہاں ماضی کی طرح ان کے نزدیک ایک مستقبل بھی۔ لیکن مسلمان اس وطن میں اکیلے نہیں تھے۔ ان کے پہلو بہ پہلو اور لوگ بھی تو بس رہے تھے۔ انھیں کی طرح ایک قوم۔ وہ ان کے وجود ملی، ان کے ماضی اور طریق زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب اشتراک وطن اور اشتراک احوال نے انھیں باہم دگروابستہ کر رکھا تھا تو اہل وطن کے لیے بجز اس کے کوئی راستہ ہی نہیں تھا کہ باہم محبت اور الافت سے رہنا سیکھیں۔ لہذا جب انھوں نے کہا:

آمل کے غیرت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں  
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

تو غیریت سے ان کا اشارا اس غیریت کی طرف تھا جس کی رعایت سے اہل وطن انھیں بیگانہ سمجھتے تھے۔ دوئی کا یہی نقش تھا جسے محمد اقبال ملیا میٹ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے اور جس میں ان کا خطاب مسلمانوں سے اتنا نہیں تھا جتنا ہندو اہل وطن سے۔ نیاشوالہ بھی انھیں کے لیے لکھا گیا۔ وہی اس دوئی کے ذمہ دار تھے جو اس ملک کی تباہی کا باعث ہوئی کہ انھوں نے صدیوں کی ہمسایگی اور روابط کے باوجود مسلمانوں کو بیگانہ سمجھا جیسے ان کا اس سرز میں پر کوئی حق نہیں تھا۔ مانا کہ اس نظم کے بعض اشعار جن کو بجا طور پر حذف کر دیا گیا، کھلتے ہیں۔ لیکن ہمیں بہوں چاہیے نظم کی زبان نثر سے مختلف ہوتی ہے۔ فرط جذبات میں شاعر کبھی کبھی جادہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔ گوایا بھی نہیں ہوا اس لیے کہ اس نظم میں اسے جو کچھ کہنا تھا اہل وطن ہی کی زبان سے کہنا تھا۔ لہذا یہ خیال کر نیاشوالہ اس لیے لکھا گیا کہ ہندو ہوں یا مسلمان مذہب کو خیر آباد کہہ دیں۔ وطن کے نام پر ایک قوم بن جائیں قطعاً غلط ہے۔ یوں بھی ہندی سیاست کے

اس دور میں جغرافی قومیت کا تصورا بھرا ہی نہیں تھا۔ باعتبار وطن البتہ ہر کوئی ہندوستانی کہلاتا اس لیے کہ قانوناً ہر کسی کی قومیت (نیشنلٹی) خواہ اس کا عقیدہ کچھ بھی ہواں کے وطن ہی سے متعین ہوتی ہے۔ پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان ظہموں کے پہلو ب پہلو جن کی بنابر کہا جاتا ہے وہ شروع شروع میں جغرافی قومیت کے قائل تھے وہ نظمیں بھی ہیں جن کی روح سرتاسر اسلامی ہے۔ خطاب قوم اور ملت سے ہے تو یہاں شاید یہ کہا جائے کہ مان لیا انھیں مذہب کی خالص منظور نہیں تھی۔ مگر کیا وہ اسے ایک اخلاقی قوت تصور نہیں کرتے تھے جو انسان کے لیے بجزلہ جان کے ہیں اور جس سے ان کی آن قائم ہے جیسا کہ صدائے درد میں انھوں نے کہا ہے۔ وہ شاید وحدت ادیان کی بنابر ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ راجہ رام موہن رائے اور ان کے اتباع میں برہمنو مناج کا خیال تھا۔ یا جیسے آگے چل کر مسلمانوں کے اندر بھی عقیدہ وحدۃ الوجود کے حوالے سے متحد قومیت کا جواز پیدا کیا گیا۔ مگر یہ خیال بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ وحدت ادیان تو ایک مذہبی اور اخلاقی تصور ہے۔ سیاست سے بے تعلق۔ سیاست میں لے آئیے جب بھی اس سے وطنی قومیت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے محمد اقبال کا نقطہ نظر اخلاقی تھا، مذہبی روح سے سرشار تو سیاسی بھی۔ وہ ایک اصولی بات بھی کہہ رہے تھے۔ انھوں نے جس اتحاد و اتفاق، محبت اور اخوت کا سبق دیا۔ جس انداز سے جذبہ حب الوطنی کو اُبھارا تو کیا اس لیے کہ وطن کی محبت ایک طبعی اور فطری امر ہے یا اس لیے کہ یہ تقاضائے سیاست ہی نہیں تھا، تقاضائے انسانیت بھی۔ انھیں مذہب کی نفعی منظور تھی، نہ کسی قوم اور ملت کے جدا گانہ وجود کی۔ یہ کہنا کہ اس زمانے میں تو انھیں خیال بھی نہیں تھا کہ مسلمانوں کا بھی دوسری قوموں کی طرح اپنا ایک جدا گانہ سیاسی وجود ہے صحیح نہیں۔ بلکہ ایسا ہی غلط جیسے آگے چل کر یہ کہا گیا کہ کہنے کو تو انھوں نے وطنی قومیت کی بجائے اسلامی قومیت کا تصور پیش کیا۔ لیکن آزادی ہند کی جدوجہمد سے گھبرا کر پھر وطنی قومیت پر آگئے۔ اس پر ہندی اسلامی ریاست کا پرده ڈال دیا۔ عامگیر انسانیت کی دعوت لے کر اٹھے۔ لیکن آخر الامر یہ دعوت اسلام میں محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ خیالات غلط ہیں سرتاسر غلط مگر ان سے بحث کا یہ موقعہ نہیں۔ افسوس تو ان کے تقدید نگاروں پر ہے جو ان کی نام نہاد وطنی ظہموں کی حقیقی روح کو سمجھے، نہ اس زمانے پر نظر رکھی جس میں یہ نظمیں کہی گئیں۔ نہ یہ دیکھا ان کا پس منظر کیا ہے۔ بس ایک رائے تھی کہ قائم کر لی۔ انھوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ محمد اقبال کی فکر وطن اور جذبہ حب الوطنی کی تھیں اسلامیت ہی کا

جذبہ کا فرمایا ہے۔ انھیں ہندوستان اس لیے بھی عزیز تھا کہ ہندوستان بھی ایک اسلامی سر زمین اسلام تھا اور ہے۔ ہندی مسلمانوں کا شمار بھی امام اسلامیہ کی طرح ایک ہی امت اسلام میں ہوتا ہے۔ محمد اقبال اس سر زمین میں اپنے مستقبل سے کیسے غالب رہ سکتے تھے، لیکن ان معنوں میں نہیں کہ دوسروں بالفاظ دیگر اہل وطن کا مستقبل نظر انداز کر دیں۔ انھیں دکھ ہوتا وطن میں کچھ ایسی تحریکیں بھی اُبھر رہی ہیں جن کے متاثر ہوتا اور اہل وطن کے حق میں ایچھے نہیں ہوں گے۔ جن سے تعصباً اور تنگ دلی کی بوآتی ہے جن سے نزع و فساد پیدا ہو گا۔ جس میں کسی کا فائدہ نہیں، سب کا نقصان ہے۔ انھیں صرف مسلمانوں کی بہتری منظور نہیں تھی۔ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے خیر خواہ تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ عالمگیر انسانیت کا تصور ان کے ذہن میں بہت آگے چل کر اُبھر ایسا ہی غلط ہے جیسے یہ کہنا کہ جذبہ حب الوطنی کے معنی ہیں جذبہ ملی کی نفی۔ وہ جب کہتے ہیں ”مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیڑ رکھنا“ تو اس لیے کہ یہی توہر مذہب کی تعلیم ہے۔ وہ یہ کہاں کہہ رہے تھے کہ سیاست کے خاطر مذہب کو خیر باد کہہ دی جائے۔

در اصل ہم بھولتے ہیں کہ حب الوطنی ایک طبعی اور فطری امر ہے۔ کون ہے جسے اپنے مرز و بوم سے محبت نہیں ہوتی، جو اس کے حسن و دل کشی اور شان و شوکت کی تعریف نہیں کرتا۔ وطن آزاد نہیں، وطن کے حالات اصلاح پذیر نہیں تو قوم کی حالت کیسے بہتر ہو سکتی ہے۔ پھر جب آئیں و قانون کی لافت، یا ایک غیر قوم کی عملداری میں، یا وطن کی نسبت سے ہندوؤں اور مسلمانوں، غرضیکہ جملہ اہل وطن کو ایک قوم تصور کیا جاتا تھا۔ محمد اقبال نے بھی اگر وطن کی رعایت سے اہل وطن کو ایک قوم سمجھا، انھیں دوسری قوموں کی طرح صلح و آشتی سے مل جل کر رہنے کا سبق دیا تو کیا غلط کیا۔ ایسی نظمیں لکھیں جن کا لب والجہ وطن کی نسبت سے توبے شک قوی ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ جغرافی قومیت کے قائل تھے۔ اس سے کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ ہی خواہاں وطن کی طرح وہ بھی اہل وطن کو دعوت اتحاد دے رہے تھے۔ محمد اقبال کے رفقاء عبدال قادر اور ان کے دوست بلکہ مخزن کا پورا حلقة بھی اسی نقطہ نظر سے اتحاد پر زور دیتا۔ لفظ قوم کا ان کے نزدیک کوئی دوسرا مفہوم تھا ہی نہیں۔ سرسید بھی جن کی سیاسی بصیرت اور دورانہ میشی نے ابتداء ہی میں دیکھ لیا تھا کہ سرکار انگریزی کو اس ملک میں جس جمہوری نظام کا نفاذ منظور ہے اس سے بالآخر مسلمانوں کے جدا گانہ تشخض کی نفی ہو جائے گی۔ وطن کی نسبت سے اہل وطن کو قوم کہہ دیتے۔ یہ انھیں کا کہنا تھا کہ ہندو اور مسلمان

ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں۔ ہندو اہل وطن بے تعصی اور رواداری سے کام لیں۔ ایسا نہ ہو انھیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے۔ یعنی ہے کہ ہندوستان میں وطنی، یا ملکی وحدت کا تصور تو موجود تھا۔ سیاسی وحدت کا تصور مسلمانوں میں تو کیا ہندوؤں میں بھی موجود نہیں تھا۔ ہاں ’جاتی‘ کی وحدت کے سب قائل تھے۔ یعنیہ جیسے مسلمان اپنی ملی وحدت کے۔ اندریں صورت جہاں سر سید یہ کہہ رہے تھے کہ ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھ کر برطانوی طرز جمہوریت کا نفاذ مسلمانوں کی جدا گانہ قومیت کی نئی کے مترادف ہے۔ وہاں محمد اقبال کی دعوت اتحاد بھی اپنی جگہ پڑھیک تھی۔ ایک اخلاقی اور انسانی ضرورت۔ اس وقت اور اس وقت کے حالات کو دیکھیے تو اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔

لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت یا قومی ترانہ حب الوطنی کا ترانہ ہے۔ وطیت کا ترانہ نہیں ہے، نہ ملی ترانے کی ضد۔ عبدالقدار لکھتے ہیں ملکی ترانہ لکھنے کا خیال میں نے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے یہ کہا تھا کہ جیسے انگریزوں کا نیشنل گیت ہر موقع پر گایا جاتا ہے اور قومی باجے کے سات بجا یا جاتا ہے ایسی کوئی نظم ہمارے ہندوستان کے لیے بھی ہونی چاہیے۔ وہ سوچنے لگ گئے اور ان کی زبان سے یہ مصرع نکلا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

میں نے کہا بہت خوب ہے۔ اب اس نظم کو مکمل کر دیجیے۔ ایک دو دن میں وہ نظم مکمل ہو گئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ کوئی نیشنل میں وہ گائی نہ گئی ہو۔ ۱۸۰۳ء میں یحییٰ محمد اقبال اور عبدالقدار کی نیشنلزم کا مسئلہ صاف ہو گیا۔ لفظ نیشنل پر غور کیجیے۔ شیخ صاحب کی فرمائش ہے کہ ہندوستان کے لیے بھی ایسی کوئی نظم ہونی چاہیے۔ ان الفاظ سے کیا وطنیت کی بوآتی ہے یا بمقابلہ انگلستان ہندوستان کے جدا گانہ شخص کی، اس لیے کہ اس زمانے میں جب یہ ترانہ لکھا گیا ہم سب ہندوستانی تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خونیں کا زخم ابھی تازہ تھا۔ جب ۱۸۰۳ء میں سقوط دہلی کے بعد شہنشاہ تیموری کی حکومت اگرچہ از دہلی تا پالم رہ گئی تھی تخت دہلی کو ہندوستان کی آزادی کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔ جب ہی تو ”کمپنی بہادر“ نے اسے بڑی بردی سے مٹا دیا۔ لوگ نہیں بھولے تھے کہ آزادی کی اس جنگ میں سرفروشی کی تو ہندوؤں اور مسلمانوں نے۔ غداری کی توجہ بھی انھیں نے۔ گواں جنگ کا سب سے زیادہ المناک پہلو ہے اہل وطن کی عظیم اکثریت میں بے حصی اور قومی غیرت کا فخران، جس کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے

اس سانچے کو بے تلقی کی نظر سے دیکھا۔ کس وقاحت سے خاموش تماشائی نبی رہی۔ لیکن ابھی ایک اور بات ہے جسے محمد اقبال کے طالب علم یا معتبر ضمین نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اگر ایسے ”نیشنلٹ“ تھے جسے ان کا خیال ہے تو عملانہ سہی، ہمدردانہ کا گنگریں کی طرف دار کیوں نہیں ہو گے۔ کا گنگریں کا لب والہ بن کا شاعر اور فلسفی کا ذہن لے کر آئے تھے۔ عملی سیاست ایک ”مجلس مباحثہ“ کی تھی۔ مانا کہ وہ ایک شاعر اور فلسفی کا ذہن لے کر آئے تھے۔ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن کا گنگریں یا کسی ایسی انجمن کی طرف داری تو کر سکتے تھے۔ انھوں نے سدیشی کی حمایت میں بڑے شدم سے قلم اٹھایا۔ پاؤں کہا کہ ہندوستانی دساؤں کا مال کیوں منگواتے ہیں۔ اپنی مصنوعات کو ترقی کیوں نہیں دیتے۔ اس لیے نہیں کہ ”نیشنلٹ“ تھے۔ ۵ بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کو آسودہ اور خوش دیکھنے کے آرزو مند۔ اسے تحد دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان معنوں میں نہیں جن میں گاندھی یا نہرو، یا جن معنوں میں انھوں نے ہندوو مسلم اتحاد، تحدہ قومیت اور بالآخر خلاصتاً وطن پرستی یعنی ہندی جغرافی قومیت کو ہوا دی۔ وہ ان نظموں کے پہلو بہ پہلو جن کی بنابر ان کی وطنیت پسندی پر استدلال کیا جاتا ہے، انجمن حمایت اسلام کے لیے کس دکھ سے نالہ یتیم اور فریاد اامت ایسی نظمیں لکھ رہے تھے۔ تصویر درد کے بارے میں کیا کہیے گا۔ یہ نظم کیا ہے؟ قومی اور وطنی یا ملی اور اسلامی، یا جذبہ حب الوطنی میں ان کی اخلاقی اور انسانی روح کی ترجمان جس کا سرچشمہ تھا ان کا ایمان و یقین۔ یہ نظم ایک اسلامی انجمن کے اسلامی اجتماع میں پڑھی گئی۔ جہاں بزرگان دین کے علاوہ سر سید کے رفیق نذری احمد اور ایسے کئی حضرات جن کا سیاسی مسلک وہی تھا جو سر سید کا موجود تھے۔ جس میں حسن نظامی نے عمائدہ فضیلت کے ساتھ اپنی پارسائی بھی ان کی نذر کر دی۔ یہ جلسہ درد مندان ملت کا تھا یا جغرافی بنیادوں پر ہندوستانی قومیت کے طرف داروں کا؟ فریاد امت، نالہ یتیم، بلاں، سر سید کی لوح تربت غرضیکہ اس دور کی نظموں اور غزلوں علی ہذا قصائد کو سامنے رکھیے تو کیا ان میں رہ رہ کے ان کا شعور ملی اُبھرنہیں رہا ہے؟ بارگاہ رسالت میں کس دل سوزی سے عرض کرتے ہیں:

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے ۶

یقیناً وطنی اساس پر ہندوستانی قوم نہیں تھی جس کی زیوں حالی، جن کے امراء کی بے حسی، جس کے دین داروں کی دنیا طلبی اور بعض اللہ کے پردے میں ذاتی عراقوں پر انسوں کرتے ہوئے انھیں کہنا پڑا:

سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا  
قصویر در سلطی نگاہوں میں ایک قومی نظم ہے جس میں بار بار وطن سے محبت اور وطن کے  
لیے جان شاری کا جذبہ بھرتا ہے۔ جس میں شاعر نے کس جوش اور ولے سے کہا ہے:  
دکھادوں گا میں اے ہندوستان رنگ دفاب کو  
کہ اپنی زندگانی تجھ پر قرباں کر کے چھوڑوں گا

جس میں بار بار اہل وطن کو تنبیہ کی ہے کہ آپس کے نزاع وجدال کو چھوڑ کر وطن کی سلامتی  
اور بہتری کی فکر کریں۔ لیکن قصویر دردہی کو سن کر شاید ہر کوئی اپنے اپنے رنگ میں سوچ رہا تھا  
کہ اختلاف عقائد اور مسلک و مشرب اپنی جگہ پر بجا، ہمیں چاہیے وطن کی اصلاح اور بہتری کی  
خاطر اتحاد و اتفاق کی کوئی راہ نکالیں۔ قصویر درد میں بھی فریاد امت کی طرح بار بار ان معائب کا  
ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے جدملی میں زہر کی طرح سرایت کر رہے تھے اور جن کو دیکھتے  
ہوئے خیال ہوتا تھا مسلمانوں کو شاید جینا نہیں آتا۔ واعظوں کو نگین بیانی کی ہوں ہے۔ دعویٰ  
توحید ہے مگر بت پندا کو خدا بنا رکھا ہے۔ قرآن کی سطریں چیلپا بن گئی ہیں۔ یہ اسلام ہے کہ  
ہم آپس میں برس پر غاش ہیں:

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی  
مسلمانوں کو آخر نا مسلمان کر کے چھوڑوں گا  
یہ کیا کہ نبودا بن مریم کے خیال میں ہم جمال یوسف یثرب کو بھول گئے:  
جمال یوسف یثرب کو دیکھ آئیہ دل میں  
نہ ڈھونڈ اے دیدہ حیراں نبودا بن مریم کو

پھر انہم کشمیری مسلمانان نہ سہی انہم حمایت اسلام تو مسلمانوں کی قومی انہم تھی۔  
جغرافی قومیت کے قائل، عالمگیر انسانیت اور وحدت ملی سے نآشنا ذہن کو اس انہم سے کیا  
کام۔ روز و شب اس کے معاملات میں سرگرمی سے کیا غرض۔ کیا محمد اقبال کو انہم حمایت اسلام  
کے علاوہ کوئی قومی اور وطنی پلیٹ فارم نہیں مل سکتا تھا جس سے وہ ہندوستانی قومیت کا پرچار  
کرتے۔ ان کے مضامین کو دیکھیے تو قومی زندگی، میں اقوام و امم کی زندگی سے بحث میں انھیں  
معیشت کی دنیا میں ہندوستان کی حالت زار پر دکھ ہوتا ہے۔ یہاں تک تو وطن کا سوال تھا۔  
ہندوؤں مسلمانوں سب کا۔ پھر تمام تر توجہ مسلمانوں پر مر تکر ہو گئی۔ اب مسئلہ مسلمانوں کے

اخلاق اور معاشرت کا ہے۔ پر دے کی گفتگو ہے، عورتوں کی تعلیم کا، تعداد ازدواج کا، اجتہاد کی ضرورت کا۔ مسلمان معاشری اعتبار سے پست ہیں۔ رسم و رواج کیسے بیوودہ ہیں۔ عادات و اطوار ناگفته ہے۔ حکومت کا نشہ ہے، جیب خالی ہے، مگر دماغ شاہجهانی ہیں۔ سدیش کی حمایت میں قلم اٹھایا تو اس میں بھی مسلمانوں پر نظر رکھی۔ ہندی کی حمایت میں تحریک اٹھی تو پریشان ہو گئے۔ اردو سے عشق ہے۔ اردو ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بن جائے، بلکہ بن رہی ہے۔ غور کیجیے کسی نیشنلٹ کا ذہن ہے۔ وطنی قومیت کے پرستار یا ایک مسلمان کا جس کا شعور ملی بیدار ہے، جو وطن کا خیرخواہ ہے۔ جس کا دل نوع انسانی کی محبت سے سرشار ہے۔

رہے ان کی قومی گیت۔ ہمیں نہیں معلوم ترا نہ ہندی، اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، میں زمانا کے تقدم حاصل ہے۔ قومی گیت کی ابتداء انہوں نے خواجہ احمدی کے پیغام حق سے کی ہے۔ یہ ہندوستان ہی تو ہے جس کی خاطر جازیوں نے دشت عرب چھوڑا۔ جہاں اسلام پھیلا۔ حدیث میں آیا ہے حضور رسالت مآب نے فرمایا: مجھے اس سرز میں سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ یہاں کسی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں۔ بحث ہے تو شاعر کے دل اور دماغ سے جو سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا ایک ماضی تھا جو مستقبل بھی ہے۔ ترا نہ ہندی میں بھی وہ آب گنگا سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ تجھے وہ دن تو یاد ہوں گے:

اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

لفظ ہمارا کی مزید وضاحت شاید:

ایران و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے  
باتی مگر ہے اب تک نام و نشان ہمارا

سے ہو جائے۔ ایران، مصر، روما سب مٹ گئے۔ ہندوستان باتی ہے۔ کون سا ہندوستان؟ پرچین ہندوستان، یا وہ ہندوستان جس میں مسلمانوں کا حصہ پرچین ہندوستان سے کم نہیں۔ جو ایک طرح سے مسلمانوں کی تخلیق ہے۔ جنہوں نے اس ورثے کو محفوظ رکھا جو انھیں اسلاف سے ملا۔ جن کی بدولت اس کا نام ہندوستان ہوا۔ جنہوں نے اس کے بکھرے ہوئے اجزاء کو متعدد کیا۔ ایک سیاسی جغرافی وحدت پیدا کر دی۔ یہ ہندوستان باتی ہے اور اس کی بقا میں مسلمانوں کا حصہ کچھ کم نہیں ہے۔ لہذا ترا نہ ہندی ہو یا قومی گیت محمد اقبال نے ان میں وظیفت کا راگ نہیں الپا۔ ہاں اہل وطن کو سیاسی سو جھ بوجھ، حب الوطنی اور انسانیت کا سبق ضرور دیا ہے تا

کہ وہ پھر سے دنیا میں ابھریں۔ کھویا ہوا وقار، عزت اور آبرو حاصل کریں۔ محمد اقبال انسانیت کی اس سطح پر کھڑے تھے جہاں مذہب اور سیاست ایک ہو جاتے ہیں۔ نوع انسانی کی محبت، انسان کے لیے درمندی اور دل سوزی کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان کا باطن سفون جاتا ہے۔ من و تو کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ فرد کی ذات اور معاشرے کی اصلاح میں وطن اور غربت کی قید باقی نہیں رہتی۔ نوع انسانی ایک بارداری اور ساری دنیا ایک گھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ محبت ہر شکل اور ہر منزل میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ تکلیفوں اور صعوبتوں کے باوجود سرگرم عمل رکھتی ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے۔ انسان، انسانیت:

بیابان محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے  
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے  
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے رہو بھی  
جرس بھی کاروں اس بھی راہ بر بھی راہ زن بھی ہے  
مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا  
چھپا جس میں علاج گردش چرخ گھنہ بھی ہے  
جلانا دل کا ہے گویا سرپا نور ہو جانا  
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

انسان اور نوع انسان کے لیے محبت کی بیبی شراب روح پرور تھی کہ جب محمد اقبال نے دیکھا وطن کا مستقبل تعصب اور تنگ نظری کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ اہل وطن سیاست تو کیا زندگی کی حقیقی روح سے بے بہرہ کن پستیوں میں جاگرے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھے:  
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

غور کیجیے یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا کیا وطنی قومیت کی حمایت میں؟ کیا اس لیے کہ ان کا ذہن ہندوستان پر مرکوز تھا؟ یا اسے ان کی سیاسی بصیرت کہیے گا۔ عالم گیر محبت اور شرافت انسانی کا جذبہ، جس نے ان سے یہ نظیں لکھوائیں۔

یہی نہیں ہم نے اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کر لیں کہ محمد اقبال کا سیاسی مسلک کیا تھا۔ ہم بھول گئے انہوں نے خیال ہی خیال میں سر سید کی لوح تربت کو دیکھا تو سر سید ہی کی زبان میں رہنمایاں سیاست سے خطاب کیا، ارباب دین، بھی خواہاں قوم سے اہل قلم سے جن

میں وہ خود بھی شامل تھے۔ سر سید کی زبان میں اپنے آپ سے جو کہہ رہے تھے کیا اس میں پورے نہیں اترے:

سو نے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے  
خرمن باطل جلا دے شعلہ آواز سے

سر سید کے اتباع میں انھیں جس سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا تھا مسلمان ہی تو تھے۔ انہم نے حمایت اسلام بھی تحریک علی گڑھ کا ضمیمہ ہی تو تھی۔ انہم کا مقصد بھی وہی تھا جو علی گڑھ کا کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں۔ وہ ایک قوم ہیں۔ ہندوستان ان کا وطن ہے۔ انھیں یہیں زندہ رہنا، اپنا قومی تشخص برقرار رکھنا ہے۔

ہم یہ سب کچھ بھولتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ قوم اور وطن کی طرح قومیت اور وطیت کے الفاظ کا جو مفہوم آج سیاست دانوں کی زبان میں ہے اس زمانے میں نہیں تھا جب محمد اقبال حب الوطنی کا گیت گارہے تھے، اہل وطن کو انسانیت کا گرسنگاہ رہے تھے۔ ان کا استعمال ان معنوں میں نہیں ہوتا تھا جن میں آگے چل کر کچھ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور کچھ مغرب کے اتباع میں ہوا۔ وطن صرف وطن تھا، قومیت کی اساس نہیں تھا۔ نہ حب الوطنی سے مذہب کی نفعی لازم آتی تھی۔ لیکن ہم نے ان تھائق کو نظر انداز کر دیا۔ قوم اور وطن کے الفاظ کی تعبیر جو صرف ایک جغرافی نسبت کے اعتبار سے بطور تعارف استعمال کی جا رہی تھی قومیت اور وطیت کے رنگ میں کی۔ محمد اقبال مغرب کے سیاسی نظریوں سے بے خبر نہیں تھے۔ مگر یہ نظریے ابھی عام نہیں ہوئے تھے۔ نہ سیاست میں ان کی دخل اندازی کا کوئی ایسا اندازہ تھا۔ یہ دخل اندازی بہت بعد میں ہوئی۔ ابھی سوال صرف اہل ملک میں اتحاد کا تھا۔ رفع نزاں اور مذاہمت کا۔ گواہیک ہوش مند انسان کی طرح وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے، بالخصوص سر سید کے اتباع میں کہ اہل وطن کو جس اتحاد، مفاہمت اور مصالحت کی ضرورت ہے کوئی اور رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ملک کی سیاسی انہمتوں سے بے تعلق رہے۔ تعلق رہا تو صرف تحریک علی گڑھ سے۔ یہاں شاید یہ کہا جائے کہ یہ بھی تو انھیں کا ارشاد ہے ”میں نے یورپ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ جغرافی قومیت اور لا دین سیاست کا جو بھوت اقوام مغرب کے سر پر سوار ہے انھیں ایک روز ایک شدید اور ہولناک جنگ کی بھٹی میں جھوٹ دے گا۔“ جیسا کہ بالآخر ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں، ۱۹۳۹ء میں۔ درست لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جب تک

یورپ نہیں گئے۔ جغرافی قومیت کے قائل تھے۔ ان کی نگاہیں صرف ہندوستان پر تھیں اس سے کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ ہندوستان میں اگرچہ جغرافی قومیت کا نظریہ عام نہیں ہوا تھا، نہ کسی سیاسی جماعت نے اسے بطور اصول اختیار کیا تھا۔ لہذا انہوں نے اس باب میں کچھ نہیں کہا۔ لیکن محمد اقبال جانتے تھے کہ جغرافی قومیت ایسا ایک نظریہ سیاست بھی ہے۔ یورپ گئے تو اس کے تباہ کرنے تائج کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ واپس آئے اور محسوس کیا کہ ممکن ہے اہل دل بھی اس نظریے کا شکار ہو جائیں تو اس کے خطرات سے اہل ملک، بالخصوص مسلمانوں کو منزہ کیا۔ وہ بھی اس وقت جب انہوں نے دیکھا کہ یہ نظریہ قبول عام حاصل کر رہا ہے۔ تا آنکہ کانگریس نے اسے صاف و صریح الفاظ میں مدار سیاست ٹھہرایا۔ اب ان کا خطاب بالخصوص مسلمانوں سے تھا۔ اس لیے کہ عالم اسلام بھی ان نظریات کی زد میں آ رہا تھا۔ ترکی میں جو کچھ ہوا ان کے سامنے تھا۔ وہ پریشان ہو گئے۔ گواں سے بہت پہلے انہوں نے وطنیت کے عنوان سے وہ نظم لکھی جس میں وطن اور وطنیت کا فرق بڑی خوبی سے سمجھایا۔ مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ وطنیت سے مذہب، بالخصوص اسلام کے سیاسی اجتماعی نسب العین کی نفی ہو جاتی ہے۔ وطن کی محبت ایک طبعی امر ہے لیکن وطنیت ایک مادی جغرافی، غیر اخلاقی اور غیر روحانی تصور۔ محمد اقبال نے کہا ہم نہیں بھولیں:

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے  
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے  
مقصد ایک طرح سے یہ بھی تھا کہ اگر ان کی نام نہاد وطنی نظموں سے یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ ان کا اشارہ وطنی قومیت کی طرف ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے۔

میری رائے میں ہندو اہل وطن اگر مغرب کا نظریہ وطنیت قبول نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ ہندو دھرم کی ایک تاریخ ہے۔ اس کے کچھ آ درش ہیں، کچھ روحاںی قدریں۔ وطنی قومیت سے ان آ درشوں اور ان قدروں کی اگرچہ کلیتاً نفی تو نہیں ہوتی لیکن انھیں گزند ضرور پہنچتا ہے۔ کچھ آ درش عملاً بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ میرا خیال ہے اس لیے کہ ہندو دھرم میں ریاست کا کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کی بنا پر حدت انسانی پر ہو۔ ہندو یوں بھی اکثریت میں تھے۔ مغرب کے نظریہ وطنیت، یا مغرب کے آئے ہوئے جمہوری طرز حکومت میں جاتی کے لیے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، بلکہ سرتاسر فائدہ۔ اس لیے کہ یوں انھیں

سارے وطن پر سیاسی معاشری دسترس حاصل ہو جاتی۔ وہ مغرب کی اصطلاح میں ایک قوم بن جاتے۔ لہذا حکومت خود اختیاری ہو یا ہندوستان کے لیے آزادی کی جدوجہدان کے خیالات کا رُخ بتدربنچ جغرافی قومیت کی طرف ہوتا گیا۔ اتحاد وطن نے ہندو مسلم اتحاد، ہندو مسلم اتحاد نے متحده قومیت اور متحده قومیت نے خالصتاً وطنی قومیت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جو کچھ ہوا تاریخ کا ایک قدرتی عمل تھا یعنی جو بات سمجھنے کی تھی کوئی نہیں سمجھا۔ نہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اتحاد وطن کا مسئلہ بظاہر سیاسی ہے، حقیقتاً دو ثقافتوں کا۔ ان میں مسلسل تصادم یا ان کے پہلو بہ پہلو قائم رہنے کا محمد اقبال کا خیال تھا ان کا پہلو بہ پہلو قائم رہنا ممکن ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟ یہ موقع اس بحث کا نہیں۔ البتہ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس باب میں ان کا موقف کیا تھا۔ رواداری، خیرخواہی، ہندوستان کی غلامی کو آزادی سے بدلنے، اس کی ترقی، اصلاح و احوال اور سیاسی استحکام کے لیے اتحاد۔ انسان کا انسان کے لیے جذبہ محبت۔ اب جہاں تک نوع انسانی کی محبت اور انسان کی انسان کے لیے خیرخواہی کا تعلق ہے اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ نہ مذہب کے معاملے میں کہ ہمیں اس میں رواداری سے کام لینا چاہیے۔ آدمیت احترام آدمیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن آدمیت جب ہی آدمیت ہے کہ اس کی تربجاتی قوموں کی زندگی، فرد اور جماعت کے روابط، سیاست اور معاش غرضیکہ ہر پہلو سے عمل میں ہوتی رہے۔ رہا اتحاد وطن سواس کی تعبیر و طبیت کے رنگ میں کی گئی تو اہل وطن نے کہا: محمد اقبال سے بڑی توقعات تھیں۔ کیسے اچھے نیشنلٹ، تھے۔ مذہب کے چکر میں آ کر کمیونلٹ، ہو گئے۔ ہم نے کہا اچھا ہوا نیشنلزم کے چکر سے نکل گئے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ کبھی نیشنلٹ تھے نہ کمیونلٹ۔ نہ وطنیت کے پرستار، نہ تنگ نظر فرقہ پرست۔ ہم نے اگر ۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کے سیاسی ہندوستان پر نظر رکھی ہوتی تو ایسا نہ کہتے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان آزاد تھا مگر خانہ جنگل میں بیٹلا۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہ کسی راجوں مہاراجوں، نوابوں، نسلی اور مقتانی گروہ بندیوں، ہوس اقتدار میں ایک دوسرے کے خلاف محااذ آ رائی کے ہاتھوں۔ اس خانہ جنگل سے ایک غیر قوم نے فائدہ اٹھایا۔ سارا ہندوستان اس کی گرفت میں آ گیا؟ وہ خلاف اور موافق گروہ بندیاں جو آئے دن برس پر خاش رہتی تھیں، ختم ہو گئیں۔ صرف نام باقی رہ گئے۔ اندریں صورت کیا بچہ اتحاد و اتفاق ہندوستان کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی تھا؟ ہرگز نہیں۔ محمد اقبال کی نظموں کو اس صورت حالات کی رعایت اور اس سیاسی تقاضے کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہیے

جو اس طرح پیدا ہوا۔ ان اخلاقی اور روحانی تصورات کے حوالے، سے سمجھنے کی کوشش بھی جو ان کے ذہن میں کارفرما تھے۔

لیکن وہ جہاں ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی یہ سر زمین جو مذہب کے نام پر مبتلاۓ فساد ہے تعصب اور تنگ دلی کو چھوڑ کر ایک دوسرے سے محبت، خیر خواہی اور رواداری کا راستہ اختیار کرے، اس میں سیاسی سوچ بوجھ پیدا ہو دہاں یہ بھی کہ مسلمانوں کو اس ملک میں جوان کا وطن ہے تمکن حاصل ہو۔ جب ہی تو وہ ایک باعزم اور باہمیت عنصر کی طرح ایک شفافی ورشہ اور ایک سیاسی اجتماعی نصب العین لیے ہوئے اپنا ملی کردار کا میابی سے ادا کر سکتے ہیں۔ انھیں اس ملک میں اپنا وجود قائم رکھنا ہے۔ ان کا دور اقتدار ختم ہوا۔ اب دورِ مکومی ہے۔ دور اقتدار میں سب سے ہر امسکہ یہ تھا کہ ہندوستان کی ملکی وحدت قائم رہے۔ دورِ مکومی میں بھی کچھ یہی صورت تھی۔ لیکن راستے دو تھے ایک راستے کی نشان دہی سر سید نے کی۔ دوسرا راستہ دیوبند نے اختیار کیا۔ یہ حکومت سے علیحدگی کا راستہ تھا۔ ہر اس چیز کے مقاطعے کا جو مغرب سے آئی ہو۔ دونوں صورتوں میں اہل وطن سے سیاسی اتحاد ناگزیر تھا۔ یہی اتحاد ہے جس پر محمد اقبال نے زور دیا۔ اس لیے کہ ہندوستان کا مستقبل اب ہندوستانیوں کا، سب کا یکساں معاملہ تھا۔ مسلمان کیسے کہہ سکتے تھے ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔ بالخصوص جب یہ تسمیہ یعنی ہندوستان، ہند اور ہندی انھیں کا وضع کر دہے ہے۔ کیا وہ حالی کی طرح یہ کہتے:

رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیں مہمان ۷۷

سات کروڑ مسلمان اور بُدیں، ہر گز نہیں۔ وہ بُدیں، نہیں تھی دیں، یعنی اس دلیں کے رہنے والے جسے انھوں نے تحدیر کھا۔ جس کے سیاسی خدو خال متعین کیے۔ جس کے حدود و ثغور کی حفاظت کی جسے اپنے خون سے سینچا۔ اس میں گل و گلزار کھلائے۔ امن و امان آسودگی اور خوش حالی کی نعمت عطا کی۔ دنیا کی عظیم ترین قوموں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا۔ جس کی دولت اور ثروت کا ہر کہیں شہرہ تھا۔ جس کے جاہ و جلال، شہروں اور عمارتوں کے حسن اور زیبائی کو دیکھ کر آنکھیں خیر ہو جاتیں۔ جوتا تاری سیالب کے بعد مسلمانوں کا طباو ماوی بن۔ جس نے عالم اسلام کے زوال پر بھی وہ شان و شوکت حاصل کی کہ بمقابلہ اس کے مغرب کو اپنا وجود یقین نظر آتا۔ جس کی خاک میں وہ کشش تھی کہ ارباب علم وہنر، شاعر اور فنکار اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ جسے دیکھ کر خیال ہوتا بغداد اور قرطبه کی کھوئی ہوئی عظمت شاید والپس آ رہی ہے۔ جس

کی شان میں عرفی نے کہا تھا:

تو از ملک عراقی واڑگوں کن عادت پیشیں  
اگر خواہی کہ حُسن و رونق ہندوستان بنی  
عرفی نے تو خیر سلطنت مغلیہ کا جاہ و جلال دیکھا تھا۔ غالب تو اس وقت بھی جب اس کا  
جسد بے روح زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا یہ کہے بغیر نہ ہے:  
بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں  
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے  
ہندوستان کی شان و شوکت اور اس کی عزت و آبرو ایک غیر قوم کے ہاتھوں لٹ گئی  
-غالب نے کس دکھ بھرے دل سے کہا:

ہندوستان سایہ گل ہائے تخت تھا  
جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ  
دلی اجز گئی۔ حالی نے اس کا مرثیہ لکھا۔ داغ خون کے آنسو رویا۔ محمد اقبال نے یورپ  
جاتے ہوئے اس کی بربادی کو دیکھا اپس آئے تو بے اختیار کہا اٹھے:  
سر زمینِ دل کی مسجد دل غم دیدہ ہے  
ذرے ذرے میں لہو اسلام کا خوابیدہ ہے  
یہ دہلی، یہ ہندوستان جو انھیں کی زبان میں ایک برگشته بخت قوم کا سرمایہ تھا، جس کی  
خاک سے ان کا خمیر اٹھا وہ اس سر زمین کو کیسے بھول سکتے تھے۔ وطن کی محبت کے نہیں ہوتی۔  
اسے کون عزیز نہیں رکھا۔ پھر قطع نظر جذبہ حب الوطنی کے ایک نفسیاتی تعلق بھی ہے جو ہمیں  
خاک وطن سے ہوتا ہے اور وہ یہ کہ زندگی عبارت ہے جن اعمال و افعال، واقعات اور  
حوادث، تجربات اور مشاہدات سے اگر زماناً ہم ان کو ماہ و سال سے نسبت دیتے ہیں تو مکاناً کسی  
نہ کسی مقام، پیشتر اپنے وطن سے کہ جہاں کسی یاد نے ذہن کا رُخ ماضی کی طرف موڑا اس کا  
تصور آنکھوں میں پھر گیا۔ جیسے ہم پھر وہیں پہنچ گئے جہاں کوئی واقعہ پیش آیا، کسی تجربے سے گزر  
ہوا۔ افراد کی طرح قوموں کی رواداد حیات کو بھی اپنے مرزو بوم سے کچھ ایسی ہی نسبت ہوتی  
ہے۔ محمد اقبال چاہتے تھے اس مرزو بوم میں جہاں ہماری زندگی کی جڑیں پیوست ہیں۔ جہاں  
ہمارے ماضی کو ایک نسبت مکافی ہے مضبوطی سے جم جائیں۔ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی

جائیں۔ قوموں اور ملکوں کا وجود تو ام ہے۔ ہم نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک جگہ پیدا کی۔ ایک قوم بن کر زندہ رہے۔ دنیا میں اچھے برے دن آتے رہتے ہیں۔ یہ کیا کہ حالات سے گھبرا کر اس سے قطع تعلق کر لیں، یا اپنا شخص بدل ڈالیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم اپنے وجود ملی کی خود ہی نفی کر رہے ہیں۔ یہ محمد اقبال کی دیدہ وری تھی جس نے ہمیں ایک قوم کی طرح عزت اور آزادی کی زندگی بسرا کرنے کا گرسکھایا۔ ڈلن کی محبت کا سبق دیتا کہ ہم اس میں تمکن حاصل کر سکیں۔ پھر یہ تمکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے نہ صرف ہمارا فطری اور جلی حق تھا، بلکہ اس سر زمین کا تقاضا بھی جہاں ہم ایک قوم کی حیثیت سے اُبھرے اور ایک قوم ہی کی حیثیت سے اس کی آزادی میں دلیرانہ حصہ لے سکتے تھے۔

ہم دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے دولت کدہ دار اسلام میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں تھدہ قومیت کی حمایت میں ہم آپ ہی کی تعلیم پر عمل کر رہے ہیں۔ آپ ہی نے تو ہمیں حب الوطنی اور اتحاد و اتفاق کا سبق دیا تھا۔ مسکرا کر کہا حب الوطنی اور اتحاد و اتفاق کا سبق تھدہ قومیت کا سبق نہیں۔ میں جو کچھ اب کہہ رہا ہوں اس سے بھی تو اتحاد و اتفاق اور حب الوطنی کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر انھیں میری ہی تعلیم پر عمل کرنا ہے، وہ انھیں باقتوں پر کار بند ہیں جوان کے نزدیک میں نے ایک زمانے میں کہیں تھیں تو اب جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ ۸۔ ۱۷ دراصل جو غلط فہمی ڈاکٹر صاحب کو ان کے کلام سے ہوئی وہی دوسروں کو۔ وہ سمجھتے تھے انھوں نے ان دونوں صرف ہندوستان ہی کی بات کی ہے۔ اسلامی قومیت یا عالم اسلام کا خیال نہیں آیا۔ وہ بھولتے ہیں کہ ہندوستان بھی تو عالم اسلام ہی کا ایک حصہ تھا اور ہے۔ تمامانہ سہی، جزوًا۔ مسلمانوں کی تعداد کم سہی، لیکن ایسی کم نہیں کہ اپنے آپ کو مسافر یا اجنبی تصور کرتے۔ ہندوستان کا کون سا گوشہ تھا جہاں انھوں نے اپنی تہذیب و تمدن کا نقش نہیں بٹھایا۔ تعداد میں کم مگر ایک طریق زندگی اور ایک نسب لعین کو لیے ہوئے اس طرح متکن کہ اگر کوئی سیاح اس سر زمین میں قدم رکھتا تو اس کی ظاہری بیست و آثار و باقیات کو دیکھ کر یہی سمجھتا کہ کسی اسلامی ملک میں آ گیا ہے۔ محمد اقبال نے بھی اسی اسلامک ملک میں آنکھیں کھولیں۔ اس کے احوال و شنوں کو دیکھا تو قدرتی بات تھی کہ سب سے پہلے انھیں اس خطے میں اپنی ہستی کی فکر ہوتی اور ایسا ہی ہوا۔

انھیں خوب احساس تھا کہ ہندی مسلمان اپنی جگہ پر ایک قوم ہیں۔ اقوام عالم کی طرح ان

کا بھی ایک جدا گانہ ملی وجود ہے۔ اسلام اس کی روح۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا جب اسلامی قومیت کا مسئلہ زیر بحث آتا۔ ابھی تو قوم اور قومیت کا تصور نیا نیا اُبھر اور تھا بھی بہت کچھ غیر واضح۔ ابھی تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ارباب سیاست اس مسئلے میں بالآخر کیا راستہ اختیار کریں گے۔ ابھی تو یہ بات بھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی کہ مغرب کی سیاسی اصطلاح میں ہندوستانی کیا ایک قوم ہیں، یا نہیں۔ نہ کسی کو اس سے بحث۔ ابھی تو ایک ایسی قوم کے مقابلے میں جو سات سمندر پار سے آ کر ان پر مسلط ہو گئی تھی وہ اپنی ہستی کا اظہار لفظ قوم ہی سے کر سکتے تھے۔ ابھی تو کچھ سلب اقتدار کی تلخی اور کچھ سرکار برطانیہ کی غلامی کے زیر اثر یا احساس عام ہورہا تھا کہ باوجود اختلاف مذہب و ملت اہل وطن میں ایک رشتہ اتحاد موجود ہے۔ اس رشتہ اتحاد کی رو سے وہ اپنے آپ کو ایک قوم کہیں تو بے جانہ ہو گا۔ انھیں برطانوی شہنشاہیت سے رستگاری ملے گی تو الگ الگ قوموں کی نہیں، بلکہ ایک قوم کی حیثیت سے اور یہی ان سیاسی تنظیموں کا جو اس زمانے میں قائم ہوئیں اور قائم ہو رہی تھیں، بنیادی عقیدہ۔ انھوں نے اہل وطن کو ایک قوم سمجھ کر ہی ان سے خطاب کیا اور ان کا ایسا کرنا تھا بھی۔ اس لیے یہی اس نئی زبان کا جو برطانوی شہنشاہیت اور استعمار کی رعایت سے انھیں اختیار کرنا پڑی لازماً تقاضا۔ یوں ہی وہ اس سے گلوغلاصی میں باہم کر کا میابی سے قدم اٹھا سکتے تھے۔ لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ محمد اقبال نے تو شاید اس لحاظ سے بھی اہل وطن کو ایک قوم نہیں کہا۔ بجو اس کے کہ ان نظموں میں جن کا آہنگ اگر قومی اور وطنی ہے تو ملی اسلامی بھی۔ انھوں نے لفظ قوم ضرور استعمال کیا ہے مثلاً یا کسی نظم کے عنوان میں۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں قومی زندگی کی بحث میں ان کا جو مضمون مخزن میں شائع ہوا اس میں اول تو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ تغیر فطرت کی بدولت تہذیب و تہدن کی دنیا میں جو حیرت انگیز تغیر و نہما ہوا۔ اس سے زمانہ حال کا رشتہ ما پسی سے یکسر کٹ گیا۔ لکھتے ہیں：“تو میں بجور ہیں کہ جدید رو�افی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اپنی زندگی کے لیے نئے نئے سامان بھم پہنچا کیں..... میرا منشایہ ہے کہ اس تغیر کے لحاظ سے اقوام ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ایک نظر ڈالوں اور اس امر کو واضح کروں کہ زندگی کی کھنڈن راہ میں کون کون سی مشکلات در پیش ہیں اور ہمیں ان کے ازالے کے لیے کیا تداہیر اختیار کرنی چاہیے،”<sup>۹</sup> ۷۴

**مضمون کا عنوان توجہ طلب ہے۔ قومی زندگی سیاست اور اجتماع کی زندگی ہے، تہذیب**

اور تمدن کی۔ جس میں اقوام ہند کے ساتھ مسلمانوں پر انھیں بالخصوص نظر ڈالنا مقصود ہے تو اس لیے کہ مسلمانوں ہی کی حالت ان میں سب سے زیادہ سیکھ تھی۔ مسلمانوں ہی کو سلب اقتدار میں سب سے زیادہ دکھ اٹھانا پڑا۔ غلامی کا پھندا بھی سب سے زیادہ انھیں کی گردن میں ڈالا گیا۔ کوشش کی گئی کہ ان کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ محمد اقبال چاہتے تھے مسلمان اقوام ہند میں اپنا جائز مرتبہ حاصل کریں۔ ملک کے مفاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ یہ نہیں کہ انھیں اقوام ہند سے کوئی پر خاش تھی۔ بلکہ اس کے انھوں نے تنوع انسانی کی محبت الیٰ شراب روح پرور کے نام پر اہل وطن کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارا۔ ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ ملک کا گزر جن کلھن حالات سے ہورہا ہے ان میں اپنی صفائی درست کریں۔ انھیں ایک دوسرے کی موجودگی کا شعور ہونا چاہیے۔ وہ اس کے اعتراض اور احترام کے ساتھ ساتھ قوموں کی زندگی سے سبق لیں۔ ایک قوم کی طرح زندگی بس کرنا سیکھیں۔ یہ سمجھیں ان کا تعلق اب سیاست کی جس نئی دنیا سے ہے اس کے تقاضے کیا ہیں؟ باعتبار ان کے وہ کیا راستہ اختیار کریں جس سے ان کی حب الوطنی باصطلاح سیاست وطن سے وفاداری ثابت نہ کریں پیدا کرے۔ اس کا رُخ اور اہل وطن کے لیے کسی روشن مستقبل کی جانب مڑ جائے۔ رقم الحروف کے نزدیک محمد اقبال کی شاعری سے بڑھ کر شاید ہی کسی نے اس احساس کو ابھارا جس میں ان کی سیاسی بصیرت نے اخلاق اور روحانیت کی اعلیٰ ترین قدروں سے مل کر وہ جذباتی اساس بہم پہنچائی جس سے اہل وطن اپنی قومی زندگی کا رُخ اس کے بلند ترین نصب اعین کی طرف موڑ سکتے تھے جس نے ان کے دلوں کو گرمایا۔ جس سے ملک میں قومی بیداری کی ایک اہر دوڑ گئی۔ ۲۸۰ محمد اقبال کا دل وطن کی زبول حالی پر دکھتا۔ اہل وطن کے تعصّب اور تنگ نظری کو دیکھتے تو نا امید ہو جاتے۔ صدائے درد اور ایک آرزوایسی نظموں سے اسی نا امیدی کا اظہار ہوتا ہے۔ تصویر درد ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور ملی بے بصری، پسمندگی اور پیشی کا مرثیہ ہے۔ نیا شوالہ میں خطاب اہل وطن کی اکثریت سے ہے۔ قومی ترانہ اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ہندوستان کی محبت اور اس سے واپسی میں اٹھار فخر کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے وجود کا اعتراض اور احترام۔ ہندوستان کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ دنیا نے اس سے کیا کچھ نہیں سیکھا۔ اس کے حسن و دلکشی نے کس کس کو اپنی طرف نہیں کھینچا۔ بہاں و سلطی ایشیا کے قبائل آئے۔ ترک آئے۔ عرب، ایرانی اور آ کر بیہیں کے ہو رہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی،

پارسی کیا اس پر ناز نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ چین اور جاپان بھی:

گو تم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے  
عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا ریشم ہے  
مدفن جس زمین میں اسلام کا حشم ہے  
ہر پھول جس چین کا فردوس ہے ارم ہے  
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے<sup>۲۸۱</sup>

یہ تھی محمد اقبال کی حب الوطنی۔ آپ اسے قومیت کہہ لیجیے۔ میں کہوں گا وطن شناسی کے تعصب اور تنگ نظری، بلکہ بعض و عناد کی اس فضائے باوجود جس میں کوئی نہ کوئی مذہبی اور سیاسی تحریک سرنگاتی حتیٰ کہ اقوام ہند کے اپنے طرز حیات کے علی الرغم انہوں نے اہل وطن کو انسانیت کے نام پر محبت اور رواداری کا سبق دیا۔ انھیں احساس دلایا کہ ملک کی حالت پر غور کریں۔ دیکھیں ملکوںی انھیں کہاں لے آئی ہے۔ دنیا بدل گئی۔ اقتدار کی لڑائی وہ کب کے لڑ چکے۔ بے تعقیٰ کا دور ختم ہوا۔ ان روایط کا پاس کریں جو اور نہیں تو کم از کم وطن کی نسبت سے ان کے درمیان قائم ہیں اور جن کے اعتراف میں خود ان کی بہتری کا راز مضمرا ہے۔ محمد اقبال کی نظم ہندوستان کے مستقبل پر تھی۔ اہل ہند کے سود و بہبود پر۔ اس سر زمین میں پر جس میں اسلام کا حشم مد فون ہے۔ مجملہ اقوام ہند مسلمانوں کے وجود ملی کے تحفظ اور تملک پر۔ ان کے ارشاد پر غور کیجیے۔ ”مسلمانوں میں اصلاح تمدن کا سوال درحقیقت ایک مذہبی سوال ہے۔ کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہب اسلام کی عملی صورت کا دوسرا نام ہے۔ ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اصول مذہب سے جدا ہو سکتا ہے“<sup>۲۸۲</sup>۔ اب اسلامی تمدن کا رشتہ اگر اسلام سے لاینک ہے اور تمدن انسان کی ساری زندگی پر محیط جس میں سیاست بھی شامل ہے تو اسلام ایک اصول قومیت ہے اور مسلمان اس لحاظ سے ایک جدا گانہ قوم جیسا کہ محمد اقبال کہہ رہے تھے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک اصول قومیت مانا تو اس سے وظیفت بالفاظ دیگر جغرافی قومیت کی آپ ہی آپ نفی ہو گئی۔ تعلیم کرنا پڑا کہ محمد اقبال کے شعور میں وہ سب باقی موجود تھیں جن کا تعلق اسلام سے بطور ایک اصول سیاست کے ہے۔ ایک عالمگیر جمعیت بشری اور وحدت امت کا خیال ان کے ذہن میں موجود تھا۔

لہذا محمد اقبال نے اپنی دعوت کا آغاز بجا طور پر وطن سے کیا تا آنکہ اس کا دائرة عالم

اسلام حتیٰ کنوع انسانی تک پھیل گیا۔ بجا طور پر بتدریج اس باب میں انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کی ترجیحی کی۔ خیالات اور تصورات منضبط کیے۔ یہ ایک قدر تی عمل تھا جس کی ابتداء پچھوٹی ہی تھی جیسے ایک نج کی کہ پھوٹا اور بتدریج برگ وبارلاتا ہے۔ ہم اس عمل پر نظر نہیں رکھتے۔ محمد اقبال کے خیالات اور نظریات کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ان میں ایک تسلسل ہے۔ وہ کبھی وطنی قومیت کے قائل نہیں تھے، نہ یہ کہ ان کی نگاہیں محمد و تھیں۔ ایک زمانے میں ہندوستان سے آگے نہیں بڑھیں۔ عالم یگر محبت، نوع انسانی کی وحدت اور امت کے ملی تشخص کا تصور آگے چل کر پیدا ہوا۔ محمد اقبال کا کلام، ان کی تحریریں اور تقریریں، علمی اور ملی مشاغل پر نظر رکھیے، تو ان خیالات اور ایسی ہی اور کئی با توں کی جن کی کوئی حقیقت نہیں باسانی تردید ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ جیسی بھی کوئی بات ہے ہم اس کو اس کے پورے سیاق و سبق میں سمجھیں۔ خیال آرائیاں نہ کریں۔

## ۱۷۔ واحدۃ الوجود

وطفیت کی طرح ایک اور غلط فہمی جو دور اول کی بعض نظموں یا آگے چل کر بعض تحریریوں کی بناء پر پیدا ہوئی یا پیدا کر دی گئی، یہ تھی اور شاید اب تک ہے کہ محمد اقبال ایک زمانے میں ہندی قومیت کی طرح وجودی تصوف کے گرواب میں پھنس گئے تھے۔ حالانکہ ان کی تعلیم و تربیت جس گھر اور جس استاد کی نظر کیمیا اثر سے ہوئی اس کا لاحاظہ رکھ لیا جاتا تو ایسی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن محمد اقبال کے خیالات اور تصورات کا سطحی اور ادھورا مطالعہ، حالات زندگی سے ناواقفیت، سنبھالی روایات، حتیٰ کہ ذاتی تعصبات نے ایسی ایک نہیں کسی غلط فہمیوں کو ہوادی۔ مثلاً یہی کہ شروع میں وہ وطنیت کے قائل تھے۔ یورپ سے واپس آئے تو اسلامیت کا رُخ کیا۔ ایک اسلامی ریاست کا تصور ذہن میں اُبھرا تو پھر وطنیت کی طرف لوٹ گئے۔ ابتداء میں وجودی تھے آگے چل کر وحدۃ الوجود کے خلاف آواز اٹھائی، یا یہ کہ ابتداء میں ت وجودی نہیں تھے۔ آخر میں وجودی ہو گئے۔

وحدة الوجود ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ کوئی دینی عقیدہ نہیں کہ اس سے اتفاق یا اختلاف میں اسلام کا زیر بحث آن لازم ٹھہرے یا یہ کہا جائے کہ وحدۃ الوجود کے علاوہ تو حیدر کی کوئی دوسری تعبیر ممکن نہیں۔ وحدۃ الوجود ایک نظریہ ہے حقیقت مطلقاً کے بارے میں جس کی ابتداء اسلام

سے بہت پہلے ہو چکی تھی اور جس کا عمل دل تصوف میں اس بحث سے ہوا کہ اگر وجود صرف ذات باری تعالیٰ کا ہے تو عالم موجودات کی حیثیت بمقابلہ اس کے کیا رہ جاتی ہے۔ یہ زمین آسمان، یہ انسان اور کتاب، اس کا ہر ذرہ اور ہر شے جس کی موجودگی کا ہمیں تجربہ شعور ہوتا ہے، کیا ہیں؟ کیا ان کا بھی کوئی وجود ہے یا نہیں؟ اگر یہ کہیں نہیں تو کیسے؟ ہیں تو کن معنوں میں؟ فلسفہ کی زبان میں یہ مسئلہ وجود یات کا ہے جس میں ایک نہیں کمی نظر یہ قائم ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ ماہیت وجود کیا ہے؟ وجود ایک ہے یا متعدد؟ شیخ اکبر نے اس سوال کا جواب وحدۃ الوجود کی رعایت سے دیا۔ وہ ایک عظیم فلسفیانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی نقطۂ نظر سے کی۔ اب اگرچہ ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو اس میں قرآن مجید سے رجوع کرے جیسا کہ شیخ اکبر نے کیا۔ محمد اقبال نے بھی ایسا ہی کیا قرآن مجید میں ان کے مطلعے کی ابتدائپن ہی میں ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے حصول علم میں آگے بڑھے، اس میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ قرآن مجید میں ان کے تدبیر اور تفکر کا سلسلہ تادم آخری جاری رہا۔ آخری علالت میں بھی جب ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ بات کرنا مشکل ہو گیا تھا، قرآن مجید میں غور فنکر سے ایک لمحۂ بھی غافل نہیں ہوئے۔ ان کا کب سے خیال تھا قرآن مجید کے ”نوٹ“،<sup>۱۸۳</sup> لکھیں فرماتے کوئی مسئلہ ہو، کیسی بھی مشکل پیش آئے۔ قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں تو مجھے اس کا حل مل جاتا ہے۔ وحدۃ الوجود کے باب میں بھی ان کے لیے فیصلہ کن حیثیت قرآن مجید کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس مسئلے کا فلسفیانہ پہلو سامنے آیا تو اس میں انہوں نے جو کچھ کہا فلسفہ کے اصول و قواعد اور حدود و محدود کا پورا پورا لاحاظہ رکھتے ہوئے کہا۔ رہا تصوف سو تصوف سے بھی انہیں بچپن ہی میں لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ تھی گھر کا محل، کچھ خاندانی روایات، کچھ سیالکوٹ کی روحانی فضا، کچھ میر حسن کا حلقة، درس جس میں ہر طرح کے مسائل زیر بحث آتے۔ ہر عقیدے اور خیال کے لوگ مذہب کی طرح فلسفہ اور تصوف پر بھی گنتیگو کرتے۔ بچپن ہی میں انہوں نے مولانا روم اور شیخ اکبر کے نام سن رکھے تھے۔ بزرگوں کو دیکھتے مثنوی، فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ان کی سمجھ میں اگرچہ کچھ نہیں آتا لیکن ان گنتیگوں کے اثرات ان کے ذہن پر مرتم ہوتے چلے گئے گونے گونے شعوری طور پر۔ نو عمری ہی میں ان کے والد ماجد انھیں اعوان

شریف لے گئے۔ وہ قاضی صاحب سلطان محمود علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے یا نہیں۔ محمد اقبال نے بیعت کی یا نہیں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں کہا جاسکتا ہے تو یہ کہ اعوان شریف کا سفر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ شریعت اور طریقت کا کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ کوئی ذہنی ابحاث تھی جسے دور کرنا مقصد تھا۔ اس سفر کی غرض و غایت سرتاسر تعلیمی تھی تاکہ بیٹا دیکھ لے تو حیدر سالت میں ایمان اور احکام شریعت کی پابندی سے حضرات صوفیاء سیرت و کردار کی پروشن میں کیا طریق اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عملی نمونہ اس کے سامنے ہو۔ قاضی صاحب علیہ الرحمۃ کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ سلسلہ قادریہ کا مراج فلسفیانہ نہیں ہے۔ اس کی نظر نفس انسانی پر ہے تاکہ اس کی آلاتیں دور ہو جائیں۔ تزکیہ باطن سے اخلاص فی العمل کی دولت ہاتھ آئے۔ سلسلہ ریشان پر بھی جس سے محمد اقبال کے بزرگوں کو ایک نسبت روحانی تھی اگرچہ زہد و تفہیف کا غالبہ تھا۔ لیکن زہد و تفہیف ہو، یا تزکیہ باطن، اس سے وحدۃ الوجود کی تائید کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ نہ کشف والہام سے اسے کوئی نسبت ہے۔ لہذا سلسلہ قادریہ کا خیال تجھے یا سلسلہ ریشان، یا کشف والہام کی ان روایات کا جو بچپن میں محمد اقبال نے سنیں بلکہ اپنے والد ماجد کے معاملے میں ان کا کچھ مشاہدہ بھی کیا ان سب باتوں سے کچھ حاصل ہوتا ہے تو یہ کہ ان کے والد ماجد کو تصوف کے رسی پہلو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ عقیدہ وحدۃ الوجود پر اصرار البتہ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ تصوف میں وحدۃ الوجود بھی ایک نظریہ ہے۔<sup>۲۸۳</sup> انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ تصوف کے ہر سلسلے کا اپنا ایک مسلک ہے۔ لیکن ارباب تصوف ایک دوسرے کے مسلک یا خیالات سے تعریض نہیں کرتے۔ اختلافی مسائل میں غیر جانب دار رہتے ہیں۔ عقلی بحثوں میں نہیں ابھتے۔ چنانچہ یہی روش تھی جس پر وہ خود بھی کار بند رہے۔ الا یہ کہ مسلک تصوف میں کسی خاص طرز خیال، یا طرز عمل سے احتمال ہوتا کہ اس سے کوئی غلط نتیجہ متربع نہ ہو جائے تو اسے روک دیتے۔ ”ہم لکھنؤ میں تھے۔ محمد ان ایجو کیشنل کافرنز کا اجلاس ہورہا تھا۔ ایک روز فرست تھی۔ طے پایاد یا شریف چلیں۔ اٹیشن پنچ۔ گاڑی کے آنے میں درتھی۔ وینگ روم میں جا بیٹھے۔“ بتیں ہو رہی تھیں کہ کافرنز کا ملازم ایک تارے کر آیا۔ میرا پوچھا۔ تار میرے حوالے کر دیا۔ میں پریشان تھا تار کیوں آیا ہے۔ کھول کر دیکھا تو والد ماجد نے لکھا تھا دیوامت جاؤ۔<sup>۲۸۴</sup> میں نے دیوا جانے سے انکار کر دیا ہر چند کہ احباب مصر تھے۔<sup>۲۸۵</sup> اب مجھے یہ تو معلوم نہیں اور

نہ میں نے دریافت کیا کہ ان کے والد ماجد کیا جانتے تھے وہ دیوا جا رہے ہیں یا لکھنؤ کے خیال سے انھیں یہ خیال گزرا کہ ممکن ہے وہ دیوا جائیں۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے انھیں دیوا جانے سے کیوں روک دیا۔ اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔ جن حضرات کو حاجی وارث علی شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے تصرفات اور سلسلہ وارثیہ سے تھوڑی بہت واقفیت ہے باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا دیوانہ جانا ہی مناسب تھا۔ نہیں معلوم دیوا پہنچ کر ان کی حاس طبیعت کیا اثر قبول کرتی۔ وہ اس پر قابو پاسکتے یانہیں۔ کوئی ایسی تبدیلی پیدا ہو جاتی جس سے ان کے دل و دماغ کی قابلیتیں بروئے کارند آتیں۔ یہ واقعہ یورپ سے واپسی کے بعد کا ہے۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ کب اور کن حالات میں پیش آیا سوچنے کی بات یہ ہے کہ باوجود تصور سے لگاؤ کے ان کے والد ماجد کس قدر مختار تھے۔ پھر جس طرح ان کے والد ماجد نہیں چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہو بیٹا تصور کے معاملے میں جادہ اعتدال سے ہٹ جائے، بعینہ میر حسن نے بھی ان کے دل و دماغ کی تربیت اس طرح کی کہ تصور کے بارے میں افراط و تفریط سے محظوظ رہیں۔ میر حسن تصور کے رمز شناس سلطیں نگاہوں میں وہابی۔ بلکہ نیچری، مگر ان کی زندگی میں کشف بھی تھا اور وہ اخلاق فی اعمل کا نمونہ بھی تھے کہ یہی تصور کا مقصود ہے۔ محمد اقبال ان کے شاگرد رشید ہی نہیں تھے بقول جمیل علی راٹھور نفس ناطق تھے۔ انھیں کیسے معلوم نہ ہوتا تصور کیا ہے، اس کے مسائل کیا ہیں، اشغال و اعمال کیا۔ تصور کس طرح شعر و شاعری میں، فلسفہ و حکمت حتیٰ کہ سیاسی اجتماعی زندگی میں نفوذ کر گیا ہے۔ خوب جانتے تھے ظہور اسلام سے پہلے تصور کا گزر کن کن مرحلوں سے ہوا۔ ظہور اسلام کے بعد اس نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں۔ عقیدہ وحدۃ الوجود کا ثبت اور منفی دونوں پہلوان کے سامنے تھے۔ لیکن یہ بات کہ ایک زمانے میں ان کا مسلک وہی تھا جو وجودی صوفیا کا، غلط ہے۔ تکمیل تعلیم سے بہت پہلے وحدۃ الوجود کی بحث پورے طور پر ان کے ذہن میں تھی۔ لیکن بطور ایک نظریے کے۔ اس زمانے میں انھوں نے اس کی موافقت یا مخالفت میں کوئی رائے قائم نہیں کی۔ وہ سمجھتے تھے یہ بھی تصور کا ایک نظریہ ہے، بمقابلہ دوسرے نظریوں کے جو ذات باری اور بمقابلہ اس کے عالم موجودات کے بارے میں اختیار کیا گیا اور کیا جا سکتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے توحید کی یہی ایک تعبیر ہے جو صوفیا اسلام کے ایک گروہ نے شیخ اکبر کی پیروی میں کی۔ ان کی روشن اس باب میں غیر جانب داری کی تھی۔ جیسے فلسفے کے

مطالعے میں کئی نظریے ان کے ذہن میں تھے جن کو درست بھی ٹھہرایا جا سکتا تھا اور غلط بھی۔ ان کے والد ماجد کو ابن عربی کی ذات سے بڑی عقیدت تھی جو بعض صورتوں میں غلوکارنگ اختیار کر لیتی۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے بارے میں لکھتے ہیں : ”رسوں تک ان کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا گوچپن میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہیں تھی..... جب میں نے عربی سمجھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا۔ جوں جوں علم اور بڑھتا گیا میراث شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی“، ۷۸۷ وہ عربی کی تخلیل بھی میرحسن کے درس میں کر رہے تھے۔

پھر جب اسرار خودی کی بحث نے شدت اختیار کر لی تو انہوں نے لکھا ”اس کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن مجید میں تذہب کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے“۔ قائل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مسلک وحدۃ الوجود تھا۔ ان کا اشارہ بعض عقائد اور مسائل کی طرف ہے۔ غالباً وہی عقائد اور مسائل جو پیش فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں بیان ہوئے اور جن کی تان بالا خروحدۃ الوجود پر ٹوٹی ہے۔ وہ سمجھتے تھے انہیں ٹھیک ماننے میں شاید کوئی مضائقہ نہیں۔ مذہب، فلسفہ اور تصوف میں ان کا مطالعہ بھی بہ نظر تحقیق جاری تھا۔ ہنوز وقت نہیں آیا تھا کہ فلسفہ ہو یا مذہب، تصوف یا کوئی اور موضوع اس میں ایک آخری رائے قائم کریں۔ یوں بھی کسی بحث کو جب ہی چھڑا جاتا ہے جب اس کا چھڑنا ضروری ہو جائے۔ جیسا کہ اسرار خودی کی اشاعت پر ہو گیا اور جب اس کا پورے طور پر احاطہ کر لیا گیا۔ ان کے ذہن کا ابتداء ہی سے ایک رُخ تھا۔ اس کی پروش بھی اس نئی پر ہوئی تھی کہ جیسے جیسے عمر میں، مطالعے میں، غور و فکر میں، تجربات اور مشاہدات میں آگے بڑھیں باعتبار اس کے ان کے خیالات منضبط ہوتے جائیں۔ پھر چونکہ ذہن اسلامی تھا۔ اس ذہن ہی کی رعایت سے انہوں نے ہر خیال اور ہر عقیدے پر نظر رکھی۔ کسی خیال یا عقیدے کو صحیح سمجھا تو عارضی طور پر۔ ان کے غور و تفکر کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ انہوں نے ان مسائل اور ان عقائد سے تعریض نہیں کیا جن کے بارے میں وہ ایک زمانے تک یہ سمجھتے رہے کہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں گے۔ ان میں ایک عقیدہ وحدۃ الوجود بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسرار خودی کے نزاع سے پہلے انہوں نے تصوف پر قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن جب تصوف کی بحث چھڑ گئی تو پھر انہوں نے جو لکھا

اس سے تو کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کر رہے تھے۔ برعکس اس کے انھوں نے تصوف پر قلم اٹھایا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ تصوف کے فلسفیانہ پہلو سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ دلچسپی ہے تو ان مشاہدات اور تجربات سے جن کی نویعت روحانی ہے اور جن کا ایک پہلو اگر مشاہدہ حق ہے تو دوسرا اخلاص فی العمل۔ فوک کو لکھتے ہیں: ”اہل اللہ کے حالات نے مجھ پر بڑا اثر کیا..... بعض بعض باقون نے تو مجھے اتنا رلا دیا کہ میں بے خود ہو گیا“<sup>۸۸</sup> لیکن تصوف اور حضرات صوفیا سے اس قدر لگاؤ کے باوجود وہ خوب سمجھتے تھے کہ تصوف کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ وہ عمارت ہے ایک تجربے میں گزرنے سے جیسا کہ رقم المحرف کے نام ایک خط میں لکھا: ”تصوف کرنے کی چیز ہے، پڑھنے کی نہیں“<sup>۸۹</sup>۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان مضامیں کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۵ء سے پہلے لکھے۔ ان کی شاعری پر نظر رکھیے۔ علمی اور ملی مشاغل کا خیال کرتے ہیں تو لامحہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا ذہن وجودی نہیں تھا۔ ان کے خیالات اور تصورات میں کہیں وحدۃ الوجود کی جھلک دکھائی دیتی ہے نہ جذبات اور احساسات میں۔ ہاں انسان اور کائنات پر نظر ہے۔ ’زندگی‘ ہے اس کے حقوق اور مسائل ملک اور قوم کے ساتھ ساتھ اسلام کے لیے دل سوزی۔ انھیں علم و حکمت سے شغف ہے۔ حقیقت کی طلب میں ذوق استفسار ہے۔ درد استغفار ہے۔ تلاش متصل، عقدہ اضداد کی کاوش۔ وجودی ذہن کے لیے تو کائنات کوئی معتمد ہے نہ زندگی کوئی مسئلہ۔ اسے علم و حکمت کے الجھیڑوں سے کیا کام۔ کائنات اور جو کچھ ہے ایک وجود واحد کے تعینات۔ سب ہمارے خیالات کی بہتی ہوئی رو میں جلوہ ہائے یا بر کا ب۔ لیکن محمد اقبال کے کلام کا تو یہ رنگ نہیں۔ انھیں جامی سے عشق ہے۔<sup>۹۰</sup> اس لیے نہیں کہ جامی نے شاعری میں وحدۃ الوجود کی ترجمانی کی۔ بلکہ اس لیے کہ جامی عاشق رسول ہیں وہ جامی کی نعمتوں کو سنتے تو بے قابو ہو جاتے۔ انھیں حافظ کے سحر کا اعتراض ہے۔ عطیہ بنیم سے کہتے ہیں: ”حافظ کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے۔ میں خود حافظ بن جاتا ہوں“<sup>۹۱</sup>۔ بایں بھئے انھوں نے جامی کے رنگ میں کچھ کہانہ حافظ کے رنگ میں۔ وحدت مطلقہ کا تصویر جیسا کہ جیلی کے یہاں ہے بڑی خوبی سے واضح کیا۔ لیکن جیلی سے بھی انھیں دلچسپی ہے تو انسان کامل کے اس تصور کے باعث جو اس کے یہاں اُبھرا۔ یہ مضمون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ لیکن ان کا ذہن تو ۱۹۰۱ء سے بھی بہت پہلے خودی پر مرکوز ہو رہا تھا۔ چنانچہ اپنی ایک غزل میں وہ لفظ خودی استعمال

بھی کرچکے تھے۔ وجودی ہوتے تو خودی کے بجائے بے خودی پر زور دیتے۔ رہے ان کے کلام میں داروں ایسے کفایات۔ کثرت میں وحدت کا تماشا۔ ہر شے میں ذات الہی کی تجلی جن کی بنا پر وحدۃ الوجود کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے۔ سو وہ جو صاحب نے کہا ہے تصوف برائے شعر گفتہن خوب است۔ ایرانی ذہن وجودی ذہن تھا۔ اس ذہن کے زیر اثر فارسی شاعری نے کچھ ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا، کچھ اس قسم کے استعارے تشیییں اور ترکیبیں وضع کیں۔ کچھ ایسے الفاظ اور اصطلاحات سے کام لیا کہ شاعر کی ذہنی کیفیت کچھ بھی ہو ہر شعر وحدۃ الوجود کے سانچے میں ڈھل گیا۔ پھر جب نوبت بادہ دساغریک پہنچی۔ بغیر اس کے مشاہدہ حق کی گفتگو ناممکن ٹھہری تو کوئی بھی خیال ہو، کوئی بھی احساس، کوئی بھی تجربہ، انسان، کائنات، زندگی اور اس کے احوال کی طرف کوئی بھی اشارہ اس کی تعبیر وحدۃ الوجود کے رنگ میں ہونے لگی۔ یہی کچھ محمد اقبال سے ہوا۔ اس بنا پر کہ وحدۃ الوجود ایک امر مسلمہ ہے لہذا وہ جو کچھ کر رہے ہیں وحدۃ الوجود ہی کے رنگ میں کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن کسی رنگ میں وجودی نہیں تھا۔ نہ عقلی، نہ وجودی نہ کسی اور اعتبار سے۔

پھر اس بحث میں کہ محمد اقبال کیا ایک زمانے میں وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وحدۃ الوجود کی ایک تاریخ ہے۔ اسلام سے پہلے اس کے ڈانٹے سر زمین یونان، ہندوستان اور نہ معلوم کہاں کہاں جاتے ہیں۔ ویدانت، صنمیت، افلاطونی اور نو افلاطونی فلسفہ تک کہ زرتشت یا یوں کہیے محییت سے اسے جو گہر اتعلق ہے ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک فاسیفیہ تصور ہے۔ واحدیت کا ایک نظریہ۔ مگر شکلیں مختلف۔ تعبیریں گونا گول تشریحیں متعدد۔ محمد اقبال اور سوامی رام تیرتھ جب باہم بل بیٹھتے۔ تصوف پر گفتگو ہوتی تو ان کا نقطہ نظر سمجھتے۔ اپنا نقطہ نظر سمجھاتے۔ اسلامی تصوف میں بھی وحدۃ الوجود نے کئی رنگ اختیار کیے۔ ۲۹۲ معتدل، غیر معتدل، انتہا پسند جس پر بالآخر وہ رنگ غالب آ گیا جسے محمد اقبال نے عجمیت کہا ہے جس میں بقول ان کے افکار دماغ جذبات قلب سے دب گئے۔ زندگی نے فرار اور قتل کا راستہ اختیار کیا۔ جسے شاعری میں خوب خوب فروع ہوا۔ زندگی زندگی اور موت موت نہ رہی۔ بھروسال کی دو کیفیتیں ٹھہریں۔ مجاز نے حقیقت پر پردہ ڈال دیا۔ ہستی فریب ہے نیستی بھی فریب۔ تا آنکہ وحدۃ الوجود کی مخصوص اصطلاحیں جن کی ازروئے اسلام کوئی سند نہیں۔ مثلاً عین اور ثبوت، تعینات اور تنزلات جو وجودی ذہن کی اختراع ہیں۔ مئے و مینا، ساتی و پیانہ،

رندی اور مستی، ہوش اور مدھوٹی سے بدل گئیں۔ الفاظ کی جگہ اشاروں اور کنایوں نے لے لی۔ افکار اور تصورات نے رمز دیا کی۔ بس اتنا یاد رہ گیا کہ شیخ اکبر وحدۃ الوجود کے موسس ہیں۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم اس کی تفسیر۔ اس روایت پر قناعت کر لی جو صدیوں سے چلی آتی تھی۔ ان کی دماغی کا وشوں اور احوال وواردات کو سمجھنے کی بہت کم توفیق ہوئی۔ لیکن جس طرح حلاج کے بارے میں وہ سب خیالات جو روایتاً چلے آتے تھے غلط ثابت ہوئے۔ بعضیہ آج یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ابن عربی کیا فی الواقع وجودی تھے۔<sup>۲۹۳</sup> یہ بحث نہایت دلچسپ اور تحقیق طلب ہے اس لیے کہ اگر ابن عربی وجودی نہیں تھے تو فتوحات اور فصوص کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ان میں تو مجرъ وحدۃ الوجود کے اور کچھ نہیں۔ بہر حال یہاں بحث وحدۃ الوجود کی نہیں ہے۔ بحث یہ ہے کہ محمد اقبال کیا شروع میں وجودی تھے۔ یورپ کی آب و ہوا کے زیر اثر، یا عالم اسلام کے انحطاط کو دیکھتے ہوئے وحدۃ الوجود سے مخفف ہو گئے۔ یہ تو کچھ ولیٰ ہی بات ہے جیسا کہا گیا کہ ابتداء میں ان پر وظیفت کارنگ غالب تھا۔ یورپ میں وظیفت کے تباہ کن اثرات کا اندازہ کیا تو وظیفت کو خیر آباد کہہ دی۔ اسلامیات کی طرف آگئے۔ اب قطع نظر اس امر سے کہ ہمارا ذہن اس قسم کے غلط نظریوں کی طرف کیوں منتقل ہو جاتا ہے غور طلب معاملہ ان کی وہ تحریریں ہیں جن میں انھوں نے بعض ایسے عقائد اور ایسے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو ایک زمانے میں صحیح مانتے رہے۔ یہ عقائد اور یہ مسائل وحدۃ الوجود ہی کے ضمن میں پیدا ہوئے۔ مگر یہ کچھ عقائد اور مسائل ہی تو تھے۔ نظریہ وجود تو نہیں تھی۔ یوں اس کی طرف کوئی ثبت اشارہ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کی علمی اور فکری کا وشوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں وحدۃ الوجود کے حق میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ جذبات و احساسات کا خیال کرتے ہیں جن کا اظہار شاعری میں ہوا تو احوالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا ذہن شروع ہی سے ایک ہی مسئلے پر مرکوز تھا اور وہ انسان، اس کی ذات، مرتبہ اور مقام، تقدیر اور مستقبل اس انسان کی نہیں جو گوشت اور پوست کی ایک ترکیب ہے۔ جس نے جہان آب و گل میں قدم رکھا۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں۔ موت سے ہم کنار ہوا اور فنا ہو گیا، یا قطرے کی طرح واصل بدریا، بلکہ اس انسان کی جو گوشت اور پوست کے اندر موجود ہے۔ جس کے لیے ایک اور زندگی ہے۔ ایک اور سفر۔ کئی میتھا۔ جیسے کچھ بتا ہے۔ جس کا تعلق اس کی انفرادیت اور شخصیت سے ہے۔ کسی غایت کی طرف بڑھنے اور بڑھتے رہنے سے وحدۃ الوجود کا تو یہ مسئلہ نہیں۔ اس کی نظر انسان پر

ہے۔ انسان جیسا کہ اس کا ایک عین ہمارے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ نہ کہ اس انسان پر جس کی ایک انفرادیت ہے۔ جسے شخصیت عطا ہوئی۔ وحدۃ الوجود میں تو تقدیر کا وہ مفہوم نہیں جس کی شرط اولیٰ ہے سعیِ عمل، خودی کا حفظ و استکام۔ اس کی تربیت، عشرت قطرہ تقدیر نہیں ہے۔ ایک سفر کا اختتام ہے اور بس۔ یوں دیکھیے تو محمد اقبال کے فکر و نظر کا معاملہ ایک موقف سے دوسرے موقف میں تبدیلی کا نہیں ہے بلکہ بذریعہ ارتقاء اور مسلسل نشوونما کا۔

اس سلسلے میں ایک بڑی دلچسپ بات وہ ہے جو میش اکبر آبادی نے کہی ہے۔<sup>۲۹۶</sup> وہ کہتے ہیں محمد اقبال شروع میں تو وحدۃ الوجود کے خلاف تھے۔ آخر مریض جب خیالات میں چلتی پیدا ہوئی۔ وجودی صوفیا کا بغور مطالعہ کیا تو وجودی ہو گئے۔ لیجیے میش کی کتاب سے جوانہوں نے بڑی محنت سے لکھی، یہ نزاع تو باقی نہ رہا کہ محمد اقبال ابتداء میں وجودی تھے۔ میش نے اگرچہ کہا نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے ان کے نزد دیک وہ جملہ شواہد جن کی بناء پر وحدۃ الوجود کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے لاکن اعتنا نہیں ٹھہر تے۔ میش کا خیال ہے اور نہایت ٹھیک کہ یہ زمانہ محمد اقبال کے لیے تحقیق و تجسس کا تھا۔ تامل اور توقف کا۔ عقیدہ وحدۃ الوجود اور اس کے جملہ متصتممات اگرچہ ان کے ذہن میں متحضر تھے۔ لیکن دیانت علم کا تقاضا تھا کہ اس سارے مسئلے کو ہر پہلو سے جانچ لیں۔ جب تک ایسا نہ کر لیتے کسی نظریے کا بالخصوص جب اس نے ایک عقیدے کی حیثیت اختیار کر کھی تھی رد و قبول ان کی فلسفیانہ طبیعت کے خلاف تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تصوف سے لگاؤ اور حضرات صوفیا سے عقیدت کے باوجود انھیں فتوحات اور فصوص میں الخاد و زندقہ کی یو آنے لگی تھی۔ انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ذات الہیہ کو ہر شے کا عین ٹھہرایا جائے۔ یہ باتیں گوانہوں نے آگے چل کر کہیں۔ جیسے یہ کہ تصوف اسلام کی سر زمین میں ایک اجنبی پودا ہے مگر وحدۃ الوجود کے سیاق و سبق میں تو صاف دیکھ رہے تھے کہ اس پہلو سے اب ان عربی کی تعلیمات اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شروع میں یہ بات ان کے ذہن میں نہیں تھی غلط ہے۔ اس زمانے میں دراصل ان کی روشن خاموشی کی تھی۔ عقائد اور مسائل کے بارے میں وہ بھی اپنے استاد کی طرح نزاع و جدال سے دور رہتے۔ چنانچہ انھوں نے یہ باتیں اس وقت کہیں اور وہ بھی مجبوراً جب اسرار خودی کی اشاعت پر وحدۃ الوجود کے حق میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اسرار خودی کی اشاعت تک وہ اپنے افکار اور تصورات میں ایک خاص موقف کی طرف بڑھ رہے تھے تا آنکہ ان کی ایک اساس متعین ہو گئی۔

رہا میکش کا یہ کہنا کہ خیالات میں پختگی پیدا ہوئی۔ صوفی وحدۃ الوجود کا مطابعہ زیادہ ثرف نگاہی سے کیا تو وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے ٹھیک نہیں۔ تشکیل جدید التہیات اسلامیہ میں جوان کے غور و فکر کا حامل ہے انہوں نے وحدۃ الوجود کی نہایت سلیمانیہ ہوئے اور مختصر الفاظ میں کردی ہے۔<sup>۲۹۵</sup> دراصل تصوف کی بحث میں وہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریہ سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ لیکن یہ موقعہ اس موضوع پر نفگو کا نہیں۔ وحدۃ الوجود سے ان کے رجوع کا بہر حال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر پھر رجوع بھی کیسے جب بقول میکش وہ ابتداء میں وجودی تھے ہی نہیں۔ دراصل میکش علی ہذا ان کے ہم خیال اسی غلطی کا مرتكب ہو گئے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ وجودی تصوف کے گرداد میں پھنس گئے تھے۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ پھنس نہیں سکے۔ ان حضرات کا ذرور یا تو ان تعبیرات اور تاویلات پر ہے جو دینی نقطہ نظر سے وحدۃ الوجود کے حق میں کی گئیں۔<sup>۲۹۶</sup> یا ان سلطھی مشاہدتوں پر جو بظاہر وجودی تصورات بلکہ یوں کہیں کہ باعتبار جذبات و کیفیات محمد اقبال کے بعض اشعار میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً بال جبریل کا شعر ہے:

تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو  
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر  
پھر ارمغان حجاز ہے۔ یہ ربانیاں:

جہاں دل جہاں رنگ و بو نیست  
در و پست و بلند و کاخ و کونیش ت  
زمین و آسمان و چار سو نیست  
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست  
تو اے ناداں دل آگاہ دریاب  
بحود مش نیاگاہ راہ دریاب  
چنان مومن کند پوشیدہ را فاش  
ز لا موجود الا اللہ دریاب

اگر ان ارشادات کا اشارہ وحدۃ الوجود کی طرف ہے۔ بالخصوص جب لا موجود الا اللہ قطعی طور پر ایک وجودی تصور ہے اور پھر اس سے پہلے بھی تو انہوں نے کہا تھا:

وہ ہے حیرت فزانے چشمِ معنی ہر نظارے میں  
چمک بجلی میں اس کی اضطراب اس کا ہے پارے میں

جس سے صریحاً وحدۃ الوجود کا پہلو نکلتا ہے اور جسے مان لیجئے تو وہ اول و آخر وجودی تھھرتے ہیں۔ پھر یہ نزاع کیوں کہ شروع میں وجودی تھے۔ آگے چل کر وحدۃ الوجود سے انکار کر دیا۔ شروع میں وجودی نہیں تھے۔ آخر میں قائل ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ وہ جذبات اور کیفیات جن کا اظہار ان اشعار میں ہوا وجودی ذہن سے مختص نہیں۔ شہودی ذہن سے بھی ان کا ویسا ہی تعلق ہے۔ مثلاً جب ہم حقیقت مطلق کا اطلاق ذاتِ الہیہ پر کرتے ہیں تو یوں ہمارا ذہن جس ذات واحد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اسے ایک اور والو امان کر بھی یہ کہنا ممکن ہے کہ باوجود وراثت کے ہم اسے ہر شے میں مشہود دیکھتے ہیں۔ اس کی تجلی ہر کہیں نظر آتی ہے۔ کثرت میں وحدت کے اقرار سے کثرت کا انکار لازم نہیں آتا۔ نہ تجلی کے یہ معنی ہیں کہ بجز اس کے کسی شے کا وجود ہی نہیں ہے۔ پھر جب مومن اپنے ایمان اور عمل کی دُنیا میں لا الہ الا اللہ کی رعایت سے مساوا کوچ گردانتا ہے تو اس ایمانی کیفیت کو اس عقلی یا وجدانی کیفیت سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جس پر وحدۃ الوجود کی اساس ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ وجود تو ایک تجربہ ہے، ایک تصور جو موجودات کو دیکھتے ہوئے قائم ہوا۔ موجود ایک خارجی حقیقت ہے، وجود داخلی۔ اب اگر وجودی ذہن کے نزدیک صفت وجود کا اطلاق صرف ذاتِ الہیہ پر ہوتا ہے اور ہم نے کہا لا موجود الا اللہ، لا تو حالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذاتِ الہیہ کے سوا ہر شے صفت وجود سے مura ہے۔ بالفاظ دیگر موجود نہیں ہے۔ بظاہر یہ منطق بڑی کامیاب ہے اور اہل ایمان کے لیے بھی بڑی پرکشش لیکن دراصل ایک مغالطہ کے پہلے تو موجودات کے اثبات سے ہم نے ایک تصور قائم کیا۔ پھر بغیر کسی دلیل کے یعنی محض اس عقیدے کی بنا پر کہ خدا ہے اس کا اطلاق ذاتِ الہیہ پر کرتے ہوئے موجودات کی نفی کر دی۔ حالانکہ یہ تصور قائم ہی موجودات کے سہارے ہوا تھا۔ ہم سمجھے یوں وہ مسئلہ جو وجودیات کے سامنے ہے حل ہو گیا۔ توحید کی اس سے بہتر کوئی تعمیر ممکن نہیں۔ لیکن ہم بھول گئے۔ وجود ہی ایک صفت نہیں جو موجود کو عطا ہوئی علاوہ اس کے اور بھی صفات ہیں۔ مثلاً صفتِ انیت (میں) اب ہر انہا موجود تو ہے۔ صفت وجود سے متصف لیکن ہر موجود انہیں ہے۔ لہذا یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے فہم میں ہماری بحث صرف صفت موجود پر مرکوز رہے۔ حالانکہ اس صفت کے اثبات سے صرف اس کے فہم کی ابتداء ہوتی ہے وہ اگر ایک انہا ہے

مطلق اور محض، تو موجود میں بھی جس کو اس نے صفت وجود عطا کی کچھ معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ نکتہ ہے جسے وحدۃ الوجود نے نظر انداز کر دیا۔ موجودات کے کوئی معنی نہ رہے۔ نہ ان کے انفرادی وجود کی۔ تو فرد کی بھی کوئی حیثیت نہ رہی جب ہی تو محمد اقبال نے کہا تھا وحدۃ الوجود ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے کوئی دینی عقیدہ نہیں۔ حضرت مجدد کے نزدیک ایک وجودانی کیفیت کی غلط تعبیر۔ محمد اقبال کا گزر بھی عقل و فکر کی پریقچ را ہوں سے ہوا۔ ان کے یہاں بھی وجودانی کیفیات تھیں۔ ہم سمجھے ان کے نزدیک بھی شاید دل پر قطرہ سازاناً بھر ہے۔ بحرِ گم شدن انعام مانیست بھول گئے۔ جب مسئلہ ایک ہوا در بنیادی باوجود اختلاف رائے ان تصورات میں جو اس طرح قائم ہوتے ہیں کوئی یکسانی کوئی نہ کوئی مشاہدہ اور ممانعت ضرور باقی رہ جاتی ہے۔ اس قسم کی یکسانیوں، مشاہدتوں اور ممانعتوں کو مترادفات پر محمول کرنا غلطی ہے۔ ممانعت کو ممانعت ہی کہنا چاہیے۔ تمثال تمثال ہے۔ ترادف نہیں ہے۔

یہ ایک پہلو تھا واحدۃ الوجود کی بحث میں محمد اقبال کے موقف کا جس میں ایک وجودانی کیفیت کی غلط تعبیر میں فکر کی جو عمارت تیار ہوئی۔ انسان، کائنات، زندگی اور اس کے احوال و شعون کے بارے میں جو تصورات وضع ہوئے فکر مجرد کے سہارے وضع ہوئے۔ ایک صغیری و کبریٰ قائم ہو گیا تو استخراج دراستخراج کے عمل نے وحدۃ الوجود کا رشتہ حقائق سے منقطع کر دیا۔ اس کا دوسرا پہلو وہ احوال و واردات، عقلی اور وجودانی کیفیات ہیں جن کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا۔ وہ سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے معرف، سلسلہ مجددیہ کے قائل مگر اس کے باوجود نہ رسماً تصوف ان کا مسلک، نہ ان کی زندگی صوفی کی زندگی۔ ان کے یہاں اذکار و اوراد تھے نہ مراقبے اور مجاہدے۔ نہ شریعت اور طریقت کا امتیاز۔ لیکن تصوف اگر عبارت ہے ایک روحانی تجربے، ایک حالت سے گزرنے سے جس سے مقصود ہے:

### شرع را دیدن باعماق حیات

تو وہ صوفی تھے اور تصوف ان کا مسلک۔ ان کے یہاں پیچ و تاب رازی تھا تو سوز و ساز روی بھی۔ وہ اس عقل کے قائل تھے جو ادب خورده دل ہو۔ وہ روم کو آتش تبریز کی نذر کر کچے تھے۔ علم کو بر دل زدن پر کار بند۔ ان کی نگاہیں آثار قلم پر نہیں، آثار قدم پر تھیں۔ انہوں نے آثار قدم دیکھے اور دیکھ دیکھ کر آگے بڑھتے چلے گئے ۲۹۷

یوں ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ تصوف جو عبارت ہے اس روحانی

تجربہ سے جو ایک ذریعہ ہے اور اک بالجواں دلائل اور برہین سے ہٹ کر علم کا اگر مغض فریب ہے۔ ہماری داخلی کیفیات کا ایک کرشمہ تو وہ سب بحثیں جو تصوف، اس کے نظریے یا مسلک کے بارے میں اٹھائی جاتی ہیں حاصل تھیں تھیں۔ ہم اسے کلیتاً رد کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ اندریں صورت محمد اقبال کے فکر و نظر کو بھی بجز چند مستثنیات کے رد کرنا پڑے گا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ہی لائق اعتناء جائے گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں کرتے تو گفتگو خواہ مشاہدہ حق کی ہو۔ خواہ اخلاص فی العمل کی یہ دیکھنا لازم تھا ہے کہ تصوف کا رُخ جس کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ ہمارے مشاہدات اور واردات قلب کے ساتھ ساتھ ضمیر اور باطن کا تزکیہ ہوتا رہے کسی ایسی بپلو، اخلاق، سیاست اور معیشت میں فساد پیدا ہوا۔ تصوف کی دنیا بھی اس سے محفوظ نہ رہی تا آنکہ بیشتر صورتوں میں اس کی حیثیت مغض ایک فرسودہ روایت کی رہ گئی۔ بعض صورتوں میں شریعت سے انحراف کا ایک فریب آمیز ذریعہ۔ یہ زمانہ تھا جس میں محمد اقبال نے آنکھ کھولی۔ سیالکوٹ کی فضابڑی حد تک تصوف آ لو تھی۔ سیالکوٹ میں بھی مزار تھے، غالباً تھیں، پیری مریدی تھی۔ عرس ہوتے، میلے لگتے۔ علماء و فضلاء کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔ ہندوستان کے میخانے تین سو سال سے بند پڑے تھے۔ ہاں کچھ نیک نہاد انسان پرانی روایات کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ خود ان پر عمل کرتے۔ دوسروں کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتے۔ سیالکوٹ میں بھی بسبب اس تعلق کے جو حضرت مجدد الف ثانی کو ملا کمال سے تھا اس معرکے کی تھوڑی بہت یاد باقی تھی جو وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان رونما ہوا۔ لیکن روشن غیر جانب داری کی اور یہی کیفیت کم و بیش سارے اسلام ہندوستان کی شاید حضرت شاہ ولی اللہ کے زیر اثر جنہوں نے تصوف کے ان دونظریوں میں تلطیق پیدا کی۔ یوں بھی ارباب تصوف کی عام روشنی یتھی کہ اپنے اپنے مسلک پر کار بندی ہیں۔ دوسروں سے تعریض نہ کریں۔ اختلاف مسائل کی بجائے توجہ صفائی باطن پر رہے۔ شریعت کی پابندی میں فرق نہ آئے۔ ابھی وہ وقت دور تھا کہ محمد اقبال اس مجدد کو توڑیں جو پانچ سو برس سے الہیات اسلامیہ میں قائم تھا۔ ابھی تو عالم اسلام پر وحدۃ الوجود کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ خیال تھا وحدۃ الوجود ہی توحید باری تعالیٰ کی بہترین تعبیر ہے۔ وحدۃ الوجود ہی حقیقت مطلقہ کی تعین کا فلسفیانہ ذریعہ۔ ابھی تو محمد اقبال کی ذہنی نشوونما اور غورو فکر کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی تو اس جرأت منداہ اقدام کی نوبت نہیں آئی تھی کہ محمد اقبال

افلاطون کی طرح ابن عربی کو بھی خیر با دکھہ کر اپنے ایک الگ راستے پر چل پڑیں۔ وہ اس راستے پر چل پڑے۔ یہ راستے طے ہوا تو ان کے افکار اور تصورات منضبط ہو کر سامنے آگئے۔ اندر میں صورت اگر ایک زمانے میں انہوں نے بعض ایسیں باتوں کو درست مانا جس کے انہیں مانہار میں انھیں شرم محسوس ہوتی تھی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس زمانے میں وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ ہاں وحدۃ الوجود ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا جو مخلہ دوسرے مسائل کے انھیں تصوف میں پیش آیا۔ وہ اگر وحدۃ الوجود کے قائل ہوتے تو اسرار خودی کے دیباچے میں بلا تکلف اس کا اعتراف کرتے۔ پھر ان کے مخترضین تو درکار حسن نظامی کہ سکتے تھے کہ وحدۃ الوجود کو حق مانتے ہوئے اس سے مخرف کیوں ہو گئے۔ رہے مولانا روم، ان کے پیر و مرشد سو مولانا کے بارے میں بھی حلاج کی طرح یہ غلط روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ ان کا مسلک وجودی تھا۔ حالانکہ مولانا وجودی نہیں تھے۔<sup>۲۹۸</sup> خودی کے قائل تھے جس کی وحدۃ الوجود میں کوئی جگہ نہیں۔ اسرار خودی بھی تو انھیں کے اشارے سے لکھی گئی۔

محمد اقبال کی مخلصانہ کوشش تھی کہ تصوف بالخصوص اس کی اسلامی روح کو ہر پہلو سے سمجھیں مذہبی، عقلی۔ ان کی نگاہیں ان سب مراحل پر نہیں جن سے تصوف کا گزر ہوا۔ انھیں حق کی تلاش تھی۔ زیاد وجدال اور محاذ آرائی سے نفرت۔ نہ کسی سے مخاصمت، نہ پر خاش۔ ان کے دل میں اسلاف کی بڑی قدر تھی۔ وہ ابن عربی کا بھی احترام کرتے۔ ان کا اختلاف اصولی تھا۔ وہ ہر خیال اور ہر نظریے کو اسلام کی کسوٹی پر پر کھتے۔ جس میں پھر انھیں کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوا کہ ان کا ہر قول قول فیصل ہے۔ ہر حرف حرف آخر۔ وہ ایک انصاف پسند طبیعت لے کر آئے تھے جس میں انکسار تھا، توضیح تھی۔ انھیں جہاں کہیں کوئی حق بات نظر آئی بلا تکلف اس کا اعتراف کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں وحدۃ الوجود میں یہ خوبی تو ہے کہ اس سے انسان کے اندر مساوات کی روح پیدا ہوتی ہے۔ گرامی کا شعر:

عصیان ما و رحمت پروردگار ما

ایں را نہایت است نہ او را نہایت

نظر سے گزر تو نیازِ محمد خاں کو لکھا۔ یہ ایک صداقت ہے جو وحدۃ الوجود میں پائی جاتی ہے۔<sup>۲۹۹</sup> مگر اس کی وضاحت نہیں کی۔ اس کا فہم قاری کے ذہن پر چھوڑ دیا ہے۔

در اصل محمد اقبال سمجھ گئے تھے اسلامی تصوف کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اس کی روح کو پا

گئے۔ ۱۹۰۲ء میں 'قومی زندگی' کے عنوان سے ان کا جو مضمون مسخن میں شائع ہوا اس میں لکھتے ہیں "آواز نبوت کا اصل زور اور اس کی حقیقت و قوت عقلی دلائل اور براہین پر منی نہیں ہے۔ اس کا دارا و مدار اس روحاںی مشاہدے پر ہے جو کے بغیر معمولی قومی کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی بناء پر اس کی آواز میں وہ ربانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سامنے انسانی شان و شوکت بیچ ہے..... یہ ہے نمود مذہب کا اصلی راز....." دو باتیں ہیں جو اس طرح ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ مذہب اگر عطیہ ہے نبوت کا جیسا کہ یقیناً ہے تو انہیاً علیہم السلام کا روحاںی مشاہدہ اس کا سرچشمہ۔ ثانیاً یہی مشاہدہ انسانی شخصیت کا صورت گر ہے۔ اس کی تقویم اور تقویت کا راز۔ اب اگر تصوف عبارت ہے ایک روحاںی مشاہدے سے وہ ایک اکشاف ہے۔ ہمارے لیے قرب ذات کا ذریعہ جس میں ہمارا اتصال اپنی ہستی کی حقیقی اساس سے ہوتا ہے تا آنکہ جیسی ہماری بساط ہے ہم اس حق کو جس پر ہم ایمان لائے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے اندر ورن ذات اور دل و دماغ کی دنیا یکسر بدلت جاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد اقبال نے ان حقائق سے کیسے اور کب پرده اٹھایا۔ مگر یہ وہ موضوع ہے جس کا تعلق اس سوانح حیات کے آئینہ ابواب سے ہے۔ ہمیں اس کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ وحدۃ الوجودی وہ بہر حال کبھی نہیں تھے۔ نہ آخر الامر ہو گئے۔

## حوالی

1- لیکن یا مرتحین طلب ہے۔ Quadrangle

2- University Career.

3- ڈاکٹر وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، طبع ۱۹۶۵ء، ص ۳۱۷۔ فقیر سید وحید الدین روز گار فقیر، ج ۲، ص ۱۰۔ دیکھیے خان بہادر ایف۔ ایس جمال الدین کا نقش۔ فقیر صاحب مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ انتقال سے قبل اپنا ذاتی کتب خانہ پنجاب پیک لاجپت ریڈی کی نذر کر دیا۔ یہ

تمغہ عربی میں امتیازی کامیابی کے لیے مخصوص تھا، حسب قرارداد، بجانب یونیورسٹی سٹڈیکیٹ، ۸ جون ۱۸۹۱ء۔

-۳- اقبال، ہجہ بزم اقبال لاہور، شمارہ ۲۰، اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص ۵۔ میر صاحب کا مضمون بعنوان اقبال کے بعض حالات۔

-۴- باعزازی۔ ایں۔ بریٹ (G.S. Brett) جو ۱۹۰۷ء میں کرائسٹ کالج سے لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس تقریب کے لیے دیکھیے اقبال ریویو، انگریزی اشاعت۔ قاضی محمد اسلم کا مضمون، بعنوان Iqbal at a College Reception in Lahore، ص ۱۹۷۶ء۔

-۵- Hemmy۔ اسی تقریب سے کچھ پہلے محمد اقبال نے نظریہ اضافیت اور خودی کے عنوان سے انگریزی میں ایک مضمون اسلامیہ کالج کے ماہنامہ کریسمسٹ میں لکھا۔ جس کا ترجمہ راقم الحروف نے رسالہ جامعہ دہلی میں شائع کیا اور جواب اقبال کی تحریروں کے کئی ایک مجموعوں میں شامل ہے۔ راقم الحروف اس وقت اسلامیہ کالج میں تھا۔ اے کاظلی علم تھا۔ ہمارے فلاسفہ کے پروفیسر مرحوم خواجہ عبدالجید پرچھ دینے کے لیے آئے تو جیسے کوئی بہت بڑی خبر لائے ہیں۔ کہنے لگے میں ایک خبر لایا ہوں اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے تو سبھی خط مستقیم ہو۔ پروفیسر صاحب اکثر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتے شاید ان کے اصرار ہی سے محمد اقبال نے کریسمسٹ کے لیے میں مضمون لکھا۔ پروفیسر صاحب کی محمد اقبال سے گفتگوؤں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

-۶- دیکھیے تشكیل جدید النہیات اسلامیہ۔ بحث علم الہی۔ اس باب میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا پیدا کر دی گئی سطور بالا سے اس کا ذرا سانی ہو جاتا ہے۔

-۷- یہ مضمون صحیفہ: اقبال نمبر، ۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ بعنوان سر اقبال دے نال میل، ص ۶۰۔ Alma Mater.

-۸- سید نذری نیازی: اقبال کے حضور، ج ۱۔

12- Sir Thomas Walker Arnold. -۹- یہ مضمون صحیفہ: اقبال نمبر، ۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ بعنوان سر اقبال دے نال میل، ص ۶۰۔ Siddons Union Club طلباء کی انجمن۔

14- Miniatures. -۱۰- بانگ درا:

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذر وہ بینائے علم  
تھی تری مونِ نفس باد نشاط افرائے علم

16- Atiya Begum, Iqbal, Feb. 1947, P.20.

-۱۱- بانگ درا:

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا  
آئندہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوں کا ہرا ہونے کو تھا  
آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا  
اب رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت  
اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

۱۸۔ بانگ درا:

کھول دے گا دستِ وحشت عقیدہ تقدیر کو  
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

۱۹۔ Edward Granville Browne ۱۸۲۶ء۔ ۱۹۲۶ء۔ Wilford Seewan Blunt

۱۹۲۲ء۔

براؤن نے تاریخ ادبیات ایران کے علاوہ باب اور بہایت میں کئی ایک کتابیں تصنیف کیں۔ علی ہذا طب عربی کے عنوان سے ایک تصنیف۔ بخش اور مسز بلنت نے مجذب کے حالات پر قلم اٹھایا۔ Future of Islam کی مشہور تصنیف ہے۔

20۔ Iqbal has lost his friend and teacher.

۲۱۔ دیکھیے لیڈی آرغلہ کے نام تعریت کا خط، ۱۲ جولائی ۱۹۳۰ء میں *Letters and Writings of Iqbal* مرتبہ شیر احمد ڈار، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۵ میں محمد اقبال لکھتے ہیں: یہ حقیقت ہے کہ ان کی وفات سے نہ صرف برطانوی دنیا نے علم کو قصان پہنچا بلکہ دنیا نے اسلام کو بھی جس کے فکر و فرہنگ اور ادب کی خدمت میں آنحضرتی نے تادم آخر کی نہ آنے دی۔ میرے لیے یہ زیان ایک ذاتی حیثیت رکتا ہے کیونکہ یہ انھیں کہ اثر تھا جس نے میری روح کی تربیت کی اور اسے جادہ علم پر گامزن کر دیا۔

۲۲۔ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ دوم، طبع ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۔

نازشِ اہلِ کمال ای میں جی براؤن  
فیضِ او در مشرق و مغربِ عالم  
مغرب اندرِ ماتم او سینہ چاک  
از فراق او دلِ مشرق دو نیم  
تا بفردوں بریں ماوی گرفت  
گفت ہائفِ ذالک الفوز العظیم

23۔ Mount Pleasant Community Birmingham.

۲۴۔ نام درانی ۱۹۲۳ء کا توبرے ۱۹۷۷ء۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کا عنایت نام از برمنگھم رقم الحروف کے نام اور ان کے مضامین روز نامہ جنگ میں۔ مثلاً اشاعت ۲۰ جوئی ۱۹۷۷ء۔

۲۵۔ ایضاً

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

- ۲۶- اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ اسد ملتانی مرحوم کا مضمون ”قطرہ ششم“، جس پر انہیں انعام ملا۔ لالہ جیا رام کے بارے میں مجھے یہ معلومات عبدالرحمن خاں ریثاڑہ انجینئر سے حاصل ہوئیں۔ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں حکیم الامت کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک نظم پر وہ بھی انعام کے مختصر ٹھہرے۔
- 27- P.G. Dallinger.
- 28- Hirst.
- 29- G.B. Ussher.
- 30- Dr. Sterattion.
- 31- Canadian.

-۳۲- دیکھیے: B.A. Dar, *Letters and Writings of Iqbal*.

میں محمد اقبال کا تقریزت نامہ۔ اقبال اکیڈمی کراچی، طبع ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۱۔

- 33- Mcleod Arabic Reader.
- ۳۳- بی او ایل مشرقی علوم میں مروجہ سنداور انفرمیڈیٹ اس زمانے میں ایف۔
- اے۔

- ۳۴- Dr. Stein ۱۸۸۹ء سے پنپل چلے آ رہے تھے۔ استغفار یا اور ملکتہ مدرسے کے پنپل مقرر ہو گئے۔
- 36- Dean Oriental Faculty
- ۳۵- A.C. Woolner جو ترقی کرتے کرتے بالآخر چنگاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان تمام معلومات کے لیے دیکھیے (۱) ڈاکٹر وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۱ اور (۲) ریسم بخش شاہین کی تالیف *Mementos of Iqbal* شائع کردہ آل پاکستان اسلامک ایجوشن کانفرنس، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸ تا ۳۱۔
- ۳۶- ڈاکٹر وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۶۔
- ۳۷- بحیثیت استاد زبان انگریزی۔

- 40- *Observer*.
- 41- *Seekers After Good*.
- ۳۸- ڈاکٹر وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۸۔
- ۳۹- Dr.Haig خوب آدمی تھے۔ سواری کے لیے گھوڑا کھر کھاتھا۔ گھوڑے ہی پرسوار ہو کر کانج آتے۔
- ۴۰- آج کل کی اصطلاح میں صوبہ جاتی سول سروں PCS۔
- 45- Lahore Law School.
- 46- Jurisprudence.
- ۴۷- تفصیل کے لیے دیکھیے: بی۔ اے۔ ڈار کی کتاب *Letters and Writings of Iqbal* شائع کردہ New light on Iqbal's Life۔ سید حسن ترمذی کا مضمون ۳۹ تا ۳۹ صفحات۔
- 48- *Indian Antiquary*.
- 49- *Doctrine of Absolute Unity as expounded by al-Jilani*.
- 50- *Studies in Islamic Mysticism*.
- 51- Stubb's *Early Plantagenets*
- 52- Epitomised translation of Walker's *Political Economy*.

- ۵۳۔ دیکھیے: ڈاکٹر وحیدہ تربیتی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۸۔
- ۵۴۔ مخزن، شمارا کتوبر ۱۹۰۲ء۔
- ۵۵۔ یعنی خام پیداوار۔
- ۵۶۔ النساء، ۳:۲۔
- ۵۷۔ Marshall اورج Taussig لیکن ان معالشین کا دور بھی گزر چکا ہے۔
- ۵۸۔ محمد اقبال، علم الاقتصاد، نسخہ اقبال اکیڈمی کراچی، دیباچہ مصنف، ص ۲۲۔
- ۵۹۔ ایضاً۔
- ۶۰۔ اصطلاحاً یہ حدیث ضعیف ہے۔ لیکن ابوسعید کے نزدیک بحوالہ الصاعانی صحیح دیکھیے: تذكرة الموضوعات، ص ۱۷۷، طبع ۱۳۲۲ھ، المکتبۃ القیمة، بمبئی۔ قرآن مجید کے ارشادات اس امر میں بہر حال واضح ہیں۔
- ۶۱۔ علم الاقتصاد۔
- ۶۲۔ ایضاً۔
- ۶۳۔ صحیفہ، شمارہ ۱۹۷۱، ۵۳، ص ۸۵۔
- ۶۴۔ دیکھیے جاوید نامہ، ارض ملک خدا است اور بمال جبریل؛ الارض اللہ۔
- وہ خدا یا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں  
تیرے آبا کی نہیں میری نہیں تیری نہیں
- ۶۵۔ بقول لسان العصر:
- منہب کے واسطے نہ حکومت کے واسطے  
ہے جنگ اب تو صرف تجارت کے واسطے
- ۶۶۔ زمانہ کانپور، اشاعت اپریل ۱۹۰۶ء۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکیڈمی کراچی۔
- ۶۷۔ دیکھیے پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، یہی عنوان۔
- ۶۸۔ علم الاقتصاد۔
- ۶۹۔ پانگ درا، ص ۱۲، طبع فروری ۱۹۷۳ء۔ شیخ غلام علی۔
- ۷۰۔ ماہنامہ نقوش، لاہور نمبر۔
- ۷۱۔ چینیوں کے چبوترے۔
- ۷۲۔ Chielsea لندن میں ارباب فن، ادیپول اور شاعروں کا مسکن جس کی فناہ شہر کے دوسرے مسکن سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ ماہنی کا زمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ چیلسو بدل گیا اور بدل رہا ہے۔ چار سو برس پہلے یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ۲ اویں صدی میں سرٹاکس مور نے یہاں سکونت اختیار کی، ایک مکان بنایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے ارباب فن نے اس کا رخ کیا۔ چیلسو کا ایک حصہ

اب شہر سے ملت ہے۔ دوسرا دریائے ٹیز کے کنارے کچل گیا ہے۔ یہ حصہ بڑا خوبصورت ہے۔ لب دریا ایک کشادہ سڑک کے پار ایک چن لگا ہے جہاں گرمیوں میں میلہ سالگار ہتا ہے۔ دیکھیے حکیم شجاع الدین کا مضمون لاہور کا چیلیس۔

۷۳۔ اس سلسلے میں دیکھیے محمد عبد اللہ قریشی کے مضمون اقبال مجلہ، بزم اقبال لاہور میں لعنوان لاہور کے مشاعرے اور اقبال، شمارہ اکتوبر ۱۹۵۲ء، لاہور۔

۷۴۔ شیخ عبدالقدور، بانگ درا میں دیکھیے دیباچہ نسخہ غلام علی، ص ۱۵، ۱۷ فروری ۱۹۷۳ء۔

۷۵۔ بانگ درا:

اڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے عندیلوں نے  
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فناں میری

۷۶۔ عبدالرؤف رافت بھوپالی، پیسہ اخبار میں کام کرتے تھے، بھوپال چلے گئے، فوق نے حریتِ اسلام کی تصنیف میں معلومات فراہم کرنا شروع کیں تو ان کے پاس بھوپال پہنچے۔ بڑے صاحبِ علم تھے۔

۷۷۔ بانگ درا:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا بیام دے دے  
جو کام کچھ کر رہی میں تو میں انھیں مذاقِ خن نہیں ہے

۷۸۔ زبور عجم، گلشنِ راز جدید:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست  
کہ ہر من تہمت شعر و خن بست

۷۹۔ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ اول، مکتوب ۵، ص ۱۰۔

۸۰

مرے گلو میں ہے ایک نغمہ جب تک آشوب  
سنچال کر جسے رکھا ہے لا مکاں کے لیے  
کہہ گئے ہیں شاعری جزو بست از پنیری  
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغام سروش

---

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا  
ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا

---

تحی وہ اک درماندہ رہو کی صدائے درد ناک  
جس کو آوازِ رحلی کارواں سمجھا تھا میں نے

- 81- Dante: *Divine Comedy*.  
 82- Beatrice بیتریس، پیار تر پڑی۔

- ۸۳- سیدنذر نیازی، مکتوبات اقبال، ص ۳۲، ۳۳۔
- ۸۴- محمود نظامی، ملفوظات، مرزا جلال الدین کامضیون میر اقبال، ص ۱۷۲۔
- ۸۵- مکتب ۲۲ ہنام گرامی۔ ۱۲ ابریل ۱۹۱۹ء، مکاتیب اقبال (اقبال نامہ)، اقبال اکادمی کراچی، ص ۱۵۷۔
- ۸۶- صحیفہ: اقبال نمبر، حصہ اول، ص ۹۶، شمارہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۱۶ء۔
- ۸۷- خواجہ حسن نظامی نے اس جلسے کی تاریخ ۱۲ ابریل لکھی ہے۔ جو غلط ہے۔ دیکھیے شاہین: اوراق گم گشته، ص ۲۸، اور سیدنذر نیازی، مکتوبات اقبال، ص ۹۸، ۹۹۔
- ۸۸- سیدنذر نیازی، مکتوبات اقبال، ص ۹۹۔
- ۸۹- محمود نظامی، ملفوظات، سر عبدالقدوس کامضیون کیف غم۔ صفحات ۱۳ تا ۱۵۔
- ۹۰- اپناؤ، ص ۱۵۔
- ۹۱- نذر اقبال: مجموعہ کمپانیں سر عبدالقدوس۔ مرتبہ حنیف شاہد، ص ۸۶۔
- ۹۲- اپناؤ، ص ۸۷۔
- ۹۳- شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ دوم، مکتب ۷۱، ص ۲۹۲۔
- ۹۴- حکیم الامت کو لوگ ڈاکٹر صاحب ہی کہتے، علامہ، حضرت علامہ، حکیم الامت کے القاب بعد میں وضع ہوئے۔ اس دور کے لوگ تواب ہی ڈاکٹر صاحب ہی کہہ کر ان کا ذکر کرتے ہیں۔
- ۹۵- حنیف شاہد، نذر اقبال، ص ۱۲۵۔
- ۹۶- روزگار فقیر، حصہ ۲، ص ۱۵۹۔
- ۹۷- اس سلسلے میں دیکھیے ڈاکٹر صدر محمود کامضیون علامہ اقبال کا گوشوارہ آمدی، جوانہوں نے انکم ٹکیں کے مسلوں سے مرتب کیا۔ مجلس ترقی ادب، مجلہ صحیفہ۔ شمارہ ۶۵۔ ماه اکتوبر ۱۹۷۳ء۔
- ۹۸- اردو، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۳۸ء، سیدنذر نیازی کامضیون علامہ اقبال کی آخری علاالت، ص ۳۳۳۔
- ۹۹- ان بعض الظن ائم۔ الحجرات، ۲:۲۹۔
- ۱۰۰- علی بخش کے لیے دیکھیے ریم بخش شاہین، اوراق گم گشته، ص ۳۰۵ تا ۳۱۰۔ اقبال نامہ، مرتبہ چانگ حسن حسرت۔ سیدنذر نیازی، اقبال کے حضور، ح، جام جما۔
- ۱۰۱- سید بشیر نیم بھرت پوری مکمل پولیس میں ملازم تھے۔ میخن میں ان کی غزلیں شائع ہوتیں تھے بلند شہری، حافظ محمد یوسف خاں۔ مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی۔ یہ غزل ۱۸۹۵ء میں پڑھی گئی۔
- ۱۰۲- سری گریمیں دریائے چہلم کا پہلا پل۔
- ۱۰۳- اقبال، مجلہ ہرم اقبال لاہور۔ محمد عبدالقدیر لیش کامضیون اقبال اور فوق۔

- ۱۰۳۔ ایضاً

- ۱۰۵۔ پورے قطعہ کے لیے دیکھیے کوئی مجموعہ (غیر مطبوعہ) کلام:

ہر عمل کے لیے ہے رو عمل

دہر میں نوش کا جواب ہے نیش

- ۱۰۶۔ دیکھیے انوار اقبال، ص ۲۵۔ مکتبہ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۱۷ء۔

107- Tit Bits.

- ۱۰۸۔ مخزن، جون ۱۹۰۳ء۔

- ۱۰۹

در گلستانِ دہر ہمایونِ کنست سخ

آمد مثال ششم و چون بوئے گل امید

می جست عندلیب خوش آہنگ سالی نوت

”علامہ فتح“ ز ہر چار سو شنید

- ۱۱۰۔ نیز رحیم بخش شاپین، اوراق گھم گشته، ص ۳۰۷ء۔

- ۱۱۱۔ سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور، ج ۱۔

- ۱۱۲۔ پیغمبر احمد ڈار، انوار اقبال، ص ۲۳۶ء۔

- ۱۱۳۔ سیدنذر نیازی، اقبال کے حضور، ص ۱۷ اور مابعد۔

- ۱۱۴۔ دیکھیے ماہنامہ تقویش لاہور نمبر۔

- ۱۱۵۔ سیدنذر نیازی، اقبال کے حضور، زیر طبع۔

- ۱۱۶۔ نقیر سید وحید الدین، روز گار فقیر، حصہ اول، ص ۹۹، ۱۰۰ء۔

- ۱۱۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مشق خواجہ کا مضمون، اقبال ریویو، کراچی، شمارہ جولائی ۱۹۶۷ء۔

- ۱۱۸۔ دیکھیے اقبال، مجید بزم اقبال لاہور، اشاعت ص۔

- ۱۱۹۔ اقبال، مجید بزم اقبال، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔ مرتضی اصلح کتاب خانہ ربوہ میں محفوظ ہے۔

- ۱۲۰۔ اقبال کے معاصر از محمد عبداللہ قریشی، ص ۱۷۶ء۔

- ۱۲۱۔ دیکھیے اقبال، بزم اقبال تبصرہ بر اسرار خودی۔

- ۱۲۲۔ شیخ عطاء اللہ، مکاتیب اقبال، حصہ اول، مکتبہ ۱۰، مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ انھیں مشی صاحب بھی کہا

جاتا۔ لفظ مشی سے غلطی نہیں نہ ہو۔ یہاں لفظ مشی اس کے تدقیقی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مشی وہ

اعزاز تھا جو اہل قلم کو بشكل حاصل ہوتا۔

- ۱۲۳۔ ماہنامہ نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ۱۹۳۳ء۔

- ۱۲۴۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، مکتبہ میں اردو فارسی دونوں تقطیعات موجود ہیں، ص ۲۳۔

۱۲۵۔ پیر حسین نہیں، پیر حیدر۔ اقبالنامہ میں غلطی سے پیر حسین چھپ گیا۔ بعض اوقات ناموں کے بارے میں غلطی ہو جاتی۔ مثلاً ایک خط میں ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خان کو سید ڈاکٹر حسین لکھا ہے۔ دیکھیے مکتوبات اقبال از سید نذر نیازی، اقبال اکیڈمی کراچی۔

۱۲۶۔ جو فریادِ امت کے نام سے ابھن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ ۱۹۰۳ء میں پڑھی گئی۔

۱۲۷۔ محمد صادق علی خان بڑے خوش گو شاعر تھے، نور الدین عنبر بھی۔ یوں کشیر میں اردو شاعروں کا ایک حلقہ ناظر کی سرپرستی میں قائم ہو گیا۔ خان صاحب اس حلقة کے روح درواں تھے۔ شعراء کی تربیت کرتے۔ شگفتہ دلی کا یہ عالم کہ اس ادبی حلقة کا نام انہم مفرح القلوب رکھا۔ آگے چل کر عنبر کے بھانجے میر خورشید احمد مرحوم نے جن کی معیت میں مجھے اس ابھن میں اکثر شرکت کا موقعہ ملا اور جن کے نام مگر اقبال کے متعدد خطوط شیخ عطاء اللہ نے اقبال نامہ میں جمع کر دیے ہیں، اس حلقة کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بقول شیخ عطاء اللہ۔ دیکھیے اقبال نامہ، مکتب جس کا مطلع ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی  
اور اس کے بعد ”بلبل کی فریاد“ ص ۲۲۔

۱۲۸۔ وہی مکتب۔

۱۲۹۔ ایضاً، مکتب ۳ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء۔

۱۳۰۔ میں ان معلومات کے لیے خال صاحب کی صاحبزادی بیگم ڈی حسین کا ممنون ہوں۔

۱۳۱۔ عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۲۲۶۔

۱۳۲۔ مورخ ۲۳ صفر ۱۳۵۷ھ۔ ایک دوسرے مکتب میں جونومبر ۱۹۱۴ء میں انہوں نے مجھ لکھا فرماتے ہیں: وفات کی خبر آنے سے ایک دن قبل علام صاحب نے فرمایا خدا خیر کرے۔ اندازہ دیکھیے مولانا ابو الحیا اور مولانا عمامدی کی حکیم الامت سے عقیدت کا۔

۱۳۳۔ دیکھیے مکاتب گرامی، شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی۔

۱۳۴۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۹۲ تا ۱۰۰۔

۱۳۵۔ مکاتب گرامی شائع کردہ اقبال اکیڈمی۔

۱۳۶۔ مکاتب اقبال بنا نیاز الدین خان، مکتب مورخ ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء۔

۱۳۷۔ شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، مکاتب اقبال۔

۱۳۸۔ مکاتب گرامی، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۲۹ء۔

۱۳۹۔ ایضاً۔

۱۴۰۔ سوامی جی کے لیے دیکھیے ماہنامہ فنون، جولائی اگست ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر عاشق بیالوی کا مضمون باضافہ محمد عبداللہ قریشی، مع کتابیات۔

۱۲۱۔ تجھے آیک ہی الف درکار ہے۔

۱۲۲۔ سیدنذر نیازی، اقبال کے حضور، زیریں۔

۱۲۳۔ اپنَا۔

144- Young Men Indian Association.

۱۲۵۔ رحیم بخش شاہین، اور ان گم گشته، علامہ اقبال کے ترانے کی شان نزول، ص ۳۱۸۔

۱۲۶۔ انوار اقبال، مکتبہ بنام فوق۔

۱۲۷۔ سیدنذر نیازی، مکتوبات اقبال۔

۱۲۸۔ شہر ادی بامالیپ سلگھ کے شوہر۔ Harper Nelson

۱۲۹۔ محمود نظامی، ملفوظات اقبال، طبع ثالی، ۱۹۲۹ء، ص ۱۰۸۔

۱۳۰۔ اپنَا۔ مرزا جلال الدین کا مضمون: میر اقبال، ص ۲۸۔

۱۳۱۔ اپنَا، ص ۷۷۔

۱۳۲۔ اپنَا، ص ۹۲۔

۱۳۳۔ اقبال، بزم اقبال لاہور، شمارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء۔

۱۳۴۔ میر نیرنگ کا مضمون: اقبال کے بعض حالات، ص ۱۵ اقبال، مجلہ بزم اقبال، اکتوبر ۱۹۵۷ء۔

۱۳۵۔ اپنَا۔

۱۳۶۔ اپنَا۔

۱۳۷۔ صحیفہ، شمارہ ۲۵، ۱۹۷۷ء، محمد عبداللہ چغتائی کا مضمون: لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہی، ص

-۵۳

158- Gandhi Irwani Pact.

159- There is many a slip between the cup and the lip.

۱۴۰۔ شاکر صدیقی نے ماہنامہ ماحول، روپنڈی میں ”نیاز فندر“ کے عنوان سے شیخ صاحب کی محمد اقبال سے خط و تابت کا ذکر کیا ہے۔ شیخ صاحب کو محمد اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنی شاعری کو ان کے فیض سے تعبیر کرتے۔ دیکھیے ماہنامہ فنون، اقبال نمبر، اشاعت ۱۹۷۷ء، ارشد میر کا مضمون: اقبال کے ایک قریبی دوستی۔

161- Easy Chair Study.

۱۴۲۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال النامہ، مقدمہ، ص ۱۷۔

۱۴۳۔ اپنَا۔ مکتبہ بتاریخ۔ بھائی دروازے سے لکھا گیا۔ ص ۹۔

۱۴۴۔ اقبال، مجلہ، بزم اقبال، نومبر ۱۹۵۷ء، اقبال کے بعض حالات۔

۱۴۵۔ یہ ہندوستان کے اندر ایک اور ہندوستان، کا اشارہ اودھ یادبھی کی طرف ہے جسے پورے ہندوستان کا سیاسی، ثقافتی مرکز کہنا چاہیے۔

۱۴۶۔ پنڈت جی کا محمد اقبال اعجاز عشق کی تفریط میں ذکر کر چکے تھے۔ لکھا تھا ہمارے ایک کرم فرما

جاندھر میں ہیں۔

۱۶۷۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ دوم، صفحات ۳۰۰ تا ۳۰۷۔

۱۶۸۔ عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۲۰۳۔

۱۶۹۔ ایضاً۔

۱۷۰۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔

۱۷۱۔ ایضاً۔

۱۷۲۔ ایضاً، ص ۲۰۶۔

۱۷۳۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۲۱۱۔

شکایت بجا تھی کہ اسلامی تومیت کا راز تو محمد اقبال ان سب بزرگوں سے بہت پہلے مکشف کر چکے تھے،

حسن ظالمی نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا۔

۱۷۶۔ دیکھیے: اکبری اقبال کا دیباچہ۔

۱۷۷۔ عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۲۱۵ تا ۲۱۵۔

ماہنامہ نظام المنشائی، دہلی، رسول نمبر ۱۳۳، ۱۹۱۵ء، جنوری، فروہی، خواجہ صاحب نے خطابات کی

ایک طویل فہرست شائع کی۔ محمد اقبال کے علاوہ سر علی امام، حکیم اجمل خاں، مولانا شوکت علی اور میر

نیرنگ کوہجی کسی نہ کسی خطاب سے نواز۔ ماہنامہ صوفی منڈی بہاؤ الدین، شمارہ اپریل ۱۹۱۵ء میں

ایک صاحب نامی گوہسواری نے ”سرالصال“، کو ایک قطعے میں نظم کیا۔

مرجا شاعر شکر بخن و شیریں مقال

حذا شاعر ہند شیخ محمد اقبال

شہرہ آفاق ہے اسلام کا یہ جوشیا

واہ صد واہ کہیں کیوں نہ اسے سر وصال

”حذا اشعار ہند یہ مصرع محل نظر ہے۔ شاید طباعت میں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔

۱۷۸۔ شاہین، اوراق گم گشته، ص ۲۸، ۲۹۔

۱۷۹۔ ایضاً۔

۱۸۰۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۲۳۷۔

۱۸۱۔ ایضاً، ص ۲۳۸۔

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۲۳۹۔

۱۸۳۔ خواجہ صاحب اس قسم کی ”تحقیقات اور اختراعات“ کے بادشاہ تھے۔ تحریکوں پر تحریکیں چلاتے۔ ہندی

اسلامی سیاست میں ان کا کردار ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے۔

-۱۸۲- ادبی دنیا، میکی ۱۹۶۵ء، ص ۹ تا ۱۱۔

-۱۸۵- محمد عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۲۵ جوالہ منادی، فوری ۱۹۳۶ء۔

-۱۸۶- ایضاً، ص ۲۵ تا ۲۲۔

-۱۸۷- جیسا کہ حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے۔

-۱۸۸- ماہنامہ نقوش، لاہور نمبر حکیم احمد شجاع کا مضمون: لاہور کا چیلی۔

-۱۸۹- رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشته، ص ۶۷۔

-۱۹۰- تاریخ میں اختلاف ہے لیکن فیصلہ ۱۹۰۰ء کے حق میں ہے۔

-۱۹۱- ویکھیے: اقبال اور انجمن حمایت اسلام، تالیف حنیف شاہد انجمن کی رواداووں پر مشتمل، طبع جولائی ۱۹۷۶ء۔

-۱۹۲- جیسا کہ اس نظم کے ایک شعر میں کہا ہے:

حضر میں ابر شفاعت کا گھر بار آیا  
دکھ اے جنس عمل تیرا خریدار آیا  
-۱۹۳- فتوائے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار  
-۱۹۴- محمود نظامی، ملفوظات، ص ۱۲۔

-۱۹۵- حنیف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۸۳۔

-۱۹۶- محمود نظامی، ملفوظات، میرا قبائل، ص ۲۹۔

-۱۹۷- فقیر سید وحید الدین کا دعویٰ ہے (روزگار فقیر، حصہ اول، ص ۶۹۔ ۷۰) کہ یہ قطعاً اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا۔ فقیر صاحب مرحوم کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ ماہنامہ صوفی، منڈی بہاؤ الدین، شمارہ ۱۹۱۲ء میں یہ قطعاً شائع ہو چکا ہے۔ آخری شعر کا پہلا مصروع یوں ہے:

من کہ شیع عشق را در بزمِ دل افروختم  
بجائے بزمِ جاں کے جیسا کہ روزگار فقیر میں چھپا۔

-۱۹۸- اخبار میں لکھتا ہے لندن کا پادری

ہم کو نہیں ہے مذہب اسلام سے عناد  
لیکن وہ خلم نگ ہے تہذیب کے لیے  
کرتے میں ارضوں پر جو ترکان بد بہاد  
مسلم بھی ہوں حمایت حق میں ہمارے ساتھ  
مٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد

سُن کے یہ بات خوب کہی شہبواز نے  
بلی چھے کو دیتی ہے پیغام اتحاد  
نظموں کے علاوہ محمد اقبال نے انہم کے سالانہ جلسوں میں تقریریں بھی کیں، مقالات بھی پڑھے، لیکھر  
بھی دیئے جن میں بعض کا مفاد ان کے خطبات میں موجود ہے۔

- ۱۹۹ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، مخزن کا نام شیخ صاحب کو شاید اگریزی لفظ ”میگرین“ سے سوچنا اس  
لیے کہ انگلستان سے علمی ادبی ”میگرین“ شائع ہو رہے تھے، گویا ”میگرین“، مجاہے خود لفظ مخزن کی اگریزی  
شکل ہے۔

- ۲۰۰ سیالکوٹ میں محمد اقبال کے دوست اور سید محمد تقیٰ کے قریبی عزیز، ان کا ذکر پہلے آپکا ہے۔

- ۲۰۱ سید بشیر حیدر بھی ان کا کلام جمع کرتے، سید محمد تقیٰ بھی۔

- ۲۰۲ بانگ درا، دیباچہ۔

- ۲۰۳ میر نیونگ۔

- ۲۰۴ نظم نایاب ہے۔

- ۲۰۵ حنفی شاہ، نذر اقبال۔

- ۲۰۶ ایضاً۔

- ۲۰۷ ایضاً۔

جسے مؤلف نے غلطی سے وہ لیکھ سمجھ لیا جس کا مولانا ظفر علی خاں نے ملت بیشاپ ایک عمرانی نظر کے  
عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔

- ۲۰۸ مخزن، دسمبر ۱۹۰۸ء، عبدالقدار کا تعارفی شتر رہ۔

- ۲۰۹ محمود نظامی، ملفوظات، شیخ عبدالقدار کا مضمون کیف غم ص ۱۶۔

- ۲۱۰ حنفی شاہ، نذر اقبال، عبدالقدار کا مضمون: شاعر مشرق سے میری آخری ملاقات، ص ۹۰ تا ۹۳۔

- ۲۱۱ اشعار پر مشتمل یہ غزل روز گار فقیر میں موجود ہے۔ حصہ دوم ص ۲۵۰۔ مگر تجھ بہ پائے ساقی پر  
گرا یا..... یہ شعر درج ہونے سے کیسے رہ گیا۔ یہ غزل بھی ظاہر ہے ۱۸۹۵ء سے پہلے لکھی گئی۔ نظم طویل  
ہے۔ میر صاحب کا اس پر تبصرہ بھی طویل۔ انھوں نے اہل پنجاب کے بارے میں اپنی رائے بدلتی۔  
”معلوم ہو گیا، ذوق خشن کا اجراء کسی خطہ زمین کو نہیں دیا گیا..... اقبال کا تو میں قائل ہی ہو گیا۔ بندشوں  
کی ایسی چستی، کلام کی ایسی روانی، مضامین کی شوختی.....“۔

- ۲۱۲ قاضی افضل حق، باقیات اقبال، ماہنامہ اردو، شمارہ ۳، کراچی، ۱۹۶۹ء۔

- ۲۱۳ ایک وہ شعر جس میں محمد اقبال نے نیم اور تین کی طرح داغ کی شاگردی پر اظہار فخر کیا ہے۔ دوسرا جس  
پر مرزاز ارشد نے انھیں گلے لگایا۔ تیسرا بازار حکیماں کے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کے موقع پر  
آپ کہتے ہیں ”خنور تو سخنور ہی سہی“۔ والی غزل۔

- ۲۱۳- بانگ درا، دیباچ، ص ۱۶۔
- ۲۱۴- نیرا عظیم، مراد آباد، اگست ۱۹۰۶ء میں پورا واقعہ تفصیل مذکور ہے۔ راقم الحروف کو یہ تفصیل نہیں مل سکی۔ نیرا عظیم کا یہ پرچہ پاکستان تو کیا بھارت میں بھی شاید بکشکل دستیاب ہو۔
- ۲۱۵- تجہب ہے عطیہ نیگم ۱۹۰۷ء تک مخزن کی اشاعت سے بے خبر ہیں۔
- ۲۱۶- عطیہ نیگم، اقبال، انگریزی نسخہ، مطبوعہ اکیڈمی آف اسلام، کبلی، ۱۹۳۷ء، ص ۹۰۔
- ۲۱۷- یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں میری نظر سے گزری۔ کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اب ڈاکٹر ڈاکٹر حسین لاجپت ریجی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں محفوظ ہے۔ مصنف کا نام یاد نہیں رہا۔
- ۲۱۸- حتیٰ کہ بانگ درا میں بھی شامل کی گئی تو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ۔
- ۲۱۹- خان صاحب کا میں اور بھی بہت سی معلومات کے لیے منون ہوں۔

221- Tennyson, Longfellow Emerson.

- ۲۲۲- پیام مشرق:

اے برادر من ترا از زندگی دار نشان  
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خوب گران

- مشہور مستشرق۔ سنکرت اور قدیم ہندوستان کے مطالعے میں ان کی خدمات بڑی  
و قیع ہیں۔

- ۲۲۳- ۳۵: ۳۳، ۳۴۔

- ۲۲۴- رع بمعنی قرص آفتاب۔ رع کے پیروؤں کا۔ یوں رع اور ”سوٹر“ میں ایک رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔  
یونانی، ہندو اور مصری مذاہب کے مطالعے میں غور طلب۔
- ۲۲۵- پیروان زرنشت کا۔

- ۲۲۶- ۱۸۱۹ء میں Jephson یا Chapman اور تھیڈنگ کار۔ یا ۱۹۱۹ء میں صدی کا طابع اور ناشر۔

- ۲۲۷- مخزن ۱۹۰۳ء۔

- ۲۲۸-

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پرداہ میم کو اٹھا کر  
وہ بزم یہ رب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر  
- ۲۲۹- مخزن، جنوری ۱۹۰۲ء۔

- ۲۳۰- محمد اللہ کہ اب مرزا کی وہ حالت نہیں جو محمد اقبال اپنی آنکھوں سے دیکھا آئے تھے اور جو شاید ۶۰/۱۹۵۰ء تک قائم رہی۔ حکومت ہند کی توجہ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کی کوششوں سے مرزا از سر نو تغیر ہوا۔ عمارت شاندار ہے، غالب کے بارے میں ایک کتب خانے پر مشتمل۔

۲۳۲۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، طبع آسکفورو، ۱۹۳۲ء، خط پر بچم، ص ۲۷۲۔

The great sufi philosopher Muhyuddin Ibnul Arabi of Spain has made the observation that God is a percept, the world is a concept.

233- Sir Meworth Younge.

پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور۔ محمد اقبال کے قدر شناس۔ W. Bell - ۲۳۳

۲۳۴۔ میخزن، شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء۔

۲۳۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی، ۷ جون ۱۹۱۶ء۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں سید عبدالرشاد بیدار نے ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں اقبال پر چکبست کی ایک تقدیم کے عنوان سے رسالہ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، اشاعت اپریل، ۱۹۰۲ء میں نواب جعفر علی خاں اثر کامضمون جو انہوں نے چکبست کے جواب میں لکھا تھا شائع کر دیا ہے۔ یہ مضمون آئینہ اقبال مرتبہ عبداللہ قریشی میں محفوظ ہے۔ عبدالرشاد (ڈاکٹر عبدالرشاد) بیدار آج کل کتب خانہ خدا بخش باکی پور کے ڈائریکٹر ہیں۔

۲۳۶۔ آئینہ اقبال مرتبہ عبداللہ قریشی میں نہرث قریشی کا مضمون اقبال کے قصائد ص ۱۵۵۔

۲۳۷۔ مکتوب بنام خان صاحب فتحی سراج الدین خاں۔

۲۳۸۔ جیسا کہ گاندھی جی یہ تجھ کہا کرتے تھے کہ ہندی مسلمان جب بیشتر ہندی الاصل ہیں تو محض تبدیل نہ ہب کی بنابر ان کی قومیت کیسے بدلتی ہے۔

۲۳۹۔ خواۓ ارشاد باری تعالیٰ شعوب و قبائل کا امتیاز تعارف کے لیے ہے۔

۲۴۰۔ میخزن، جون ۱۹۱۰ء۔

۲۴۱۔ مجلس ترقی ادب، صحیفہ، اقبال نمبر، حصہ اول، شمارہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ قاضی افضل حق کا مضمون: نادرات اقبال، ص ۲۱۲ تا ۲۱۳۔ اردو اگریزی سروق کی نقل کا اصل کے ساتھ اگریزی ترجمے کا عنوان ہے۔ Stanzas of Tears of Blood پر مشتمل۔ اردو عنوان کے نیچے لکھا ہے۔ ترکیب ہند جو حضور ملکہ معظمه محترمہ کے انتقال پر ملاں پر مسلمانان لاہور کے ایک ماتحتی جلسے میں پڑھا گیا از خاکسار اقبال۔

۲۴۲۔ اور جس میں ہندوستان تاجدار برطانیہ سے یوں خطاب کرتا ہے:

اے تاجدارِ خلائق جنتِ نشانِ ہند

روشنِ تجلیوں سے تری خاورانِ ہند

پوری نظمِ نہایت زور دار ہے۔ فی اعتبار سے بہت خوب۔

۲۴۳۔ اس وقت بقول اکبر ایک ہی راستہ تھا:

پابندِ اگرچہ اپنی خواہش کے رہو

لائلِ سمجھت تم بڑش کے رہو

قانون سے فائدہ اٹھانا ہے اگر

حای نہ کسی خراب سازش کے رہو

داد دیکھیے حضرت لسان اعصر کی سیاسی بصیرت کی، لفظ خواہش قابل غور ہے۔

- ۲۲۵ اس زمانے کی اصطلاح میں انگریزی خیالات کا۔ مثلاً دیکھیے: مخزن، ص ۱۹۰، عبد القادر کا تمہیدی شذرہ ہمالیہ پر۔

246- Iqbal, *Stray Reflections*.

زمانہ طالب علمی میں محمد اقبال کو وڑوز ور تھ بہت پسند تھا جیسے ٹینی سن، لیکن یہاں قابل لحاظ یہ امر ہے کہ باوجود اس دیپھی یا اس خوش گواراٹ کے جو انھوں نے ان سے قبول کیا ان شعراء کو غالب اور بیدل کی طرح ان کے شعروفلسفہ میں مستقلًا کوئی جگہ نہیں ملی۔ صرف ان کی یاد باقی رہ گئی۔ چنانچہ پیام مسترق میں انھوں نے شعراء کی جو محفل قائم کی ہے اس میں ٹینی سن موجود ہے نہ وڑوز ور تھ۔ وہ اپنے انکار اور تصورات کی دنیا میں بہت آگے کلکھے تھے۔ پھر یہ دہریت ہمیں ایک گزرتا ہوا فلسفیانہ لمحہ تھا جس کا تعلق فکر سے تو ہے ایمان و یقین سے نہیں۔

- ۲۲۷ ابو میاں، سید بشیر حیدر، سید محمد تقی اور شاید شنگ گلاب دین یا مولوی احمد دین بھی۔

- ۲۲۸ بانگ درا، دیباچ، ص ۱۴، نسخہ غلام علی۔ لیکن شنگ صاحب نے شاید خود کوئی بیاض مرتب نہیں کی۔

- ۲۲۹ مخزن، جنوری ۱۹۰۳ء؛ باقیات اقبال، ص ۱۹۲۔ یہ تین شعر کیا چک Czecch شاعر ڈائیک (Dyke) م-۱۸۷۷ء کے ہیں۔

- ۲۵۰ سید نزیر نیازی، اقبال کے حضور، انجمن ترقی ادب، اقبال نمبر، ۱۹۳۸ء، علامہ اقبال کی آخری عمارت۔

- ۲۵۱ محمود نظامی، ملفوظات، ص ۲۹۔

- ۲۵۲ ۱۹۱۹ء میں جب کانگرس، لیگ اور مجلس خلافت کے اجلاس ایک ساتھ منعقد ہو رہے تھے۔ جلسے کا اشارہ لیگ کے اجلاس کی طرف ہے۔

- ۲۵۳ راقم الحروف نے یہ نظم لیگ کے اجلاس میں خود ان کی زبان سے سُنی۔ مجھ ہمہ تن گوش تھا۔ جلسے کی صدر ارت مُسیح الملک، بہادر حکیم احمد بن نے فرمائی۔ دائیں بائیں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی بیٹھے تھے۔ پاس ہی مولانا عبدالباری فرغلی محلی، مولانا حسرت موبانی، ڈاکٹر انصاری، آزاد سجانی اور دوسرا رے زعامے لیگ۔ مولانا ابوالکلام قیود بند میں تھے۔ جوہنی حکیم صاحب نے اعلان کیا ڈاکٹر اقبال نظر بند ان اسلام کو خیر مقدم کہنے آئے ہیں مجھ بے قابو ہو گیا۔ ہر کسی کو شتیاق کہ نظم کیا ہو گی۔ نظم پڑھی گئی۔ وہی لحن، وہی سوز، وہی دل کش آواز جس کا عبد القادر نے ذکر کیا ہے۔ ساری محفل پر ایک وجہ آفرین کیفیت طاری تھی۔ مولانا محمد علی اٹھے ان سے پہنچنے، پھر مولانا شوکت علی۔

- ۲۵۴ محمود نظامی، ملفوظات، مرزا جلال الدین کامضیون: میرا اقبال، ص ۸۷۔

- ۲۵۵ مخزن، اشاعت مئی ۱۹۰۳ء، نوازش علی خان شاید، ہائی کورٹ میں لعہدہ ترجی ملازم تھے۔

- ۲۵۶ تفصیل کے لیے دیکھیے: مخزن، اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

- ۲۵۷ ایضاً۔

- ۲۵۸ - شیخ عطاء اللہ، مکاتیب، حصہ اول، کتب، ۲۱، ص ۵۶، بنام سردار عبدالرب نشر۔
- ۲۵۹ - اقبال، مجلہ بزم اقبال، لاہور ۱۹۴۷ء۔
- ۲۶۰ - شیخ عطاء اللہ، مکاتیب، حصہ دوم، ص ۲۹۰، کتب، ۳۶، بنام مولوی عبدالحق، ص ۸۵۔
- ۲۶۱ - ماہ نو، اقبال نمبر، ۷۱۹۴ء میں ان کا مضمون ایک جوئے کہستان۔ موج روایا، ڈاکٹر عبدالرشاد بیدار اب خدا بخش لاسریری بانگی پور (بہار) کے ڈائریکٹر ہیں۔
- ۲۶۲ - شاپین، اوراق گلم گشتہ، ص ۱۲۔
- ۲۶۳ - ایضاً، ص ۱۱۲۔
- ۲۶۴ - برسوں گو نمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہے۔ مشرقی اور مغربی ادب، تاریخ اور مذہب میں فاضلانہ دستگاہ رکھتے۔ خواب ہستی اور یاسمین کے مصنف۔ دہلوی، دہلی میں انتقال فرمایا۔ فرمایا: کاش مذہب اور باطنی تعلیم کے عنوان سے انہوں نے جو خیم کتاب بڑی محنت اور کاوش سے لکھی پھر سے شائع ہو جائے۔
- ۲۶۵ - تا تو بیدار شوی نالہ کشید ورنہ  
عشق کاریت کر بے آہ و فقاں نیز کنند
- ۲۶۶ - ماہ نو، اقبال نمبر، ۷۱۹۴ء، ص ۲۰۹۔
- عزیز احمد کے نزدیک محمد اقبال کے متعین کو یا آگے چل کر اردو ادب میں جوئی تحریکیں پیدا ہوئیں انھیں ”اقبال کی شاعری کے بے پناہ توج، اس کی وسعت، اس کی حرکت اور تلاطم سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ بات عزیز احمد نے جوش کے بارے میں کہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں وہ اس کا اطلاق سب پر کر رہے ہیں۔
- ۲۶۷ - حنیف شاہد، نذیر اقبال، ص ۱۳۲، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱ غالباً معرض زیادہ نسبت مذاح ہے۔
- ۲۶۸ - لمحہ؟
- ۲۶۹ - مسخرن، نومبر ۱۹۰۳ء۔
- ۲۷۰ - ایضاً، اگست ۱۹۰۲ء۔
- ۲۷۱ - ایضاً، مئی ۱۹۰۲ء۔
- ۲۷۲ - اس سلسلے میں ان مضامین، مقالات اور تصنیفات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا جو بھارت میں شائع ہو رہی ہیں۔ مثلاً ایک کتاب مسٹر چوبڑا کی ہے جس کا صرف تبرہ نظر سے گزر۔ جگن ناتھ آزاد اور دوسرے اہل قلم نے بھی اس موضوع میں متعدد مضامین لکھے ہیں۔ اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ محمد اقبال ابتداء میں وظیفت کے قائل تھے۔ تاثیر بہت پہلے اس موضوع پر قلم اٹھا چکے تھے۔
- ۲۷۳ - مثلاً آریا سماج اور اس قسم کی دوسری جماعتیں جو مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک جزو غیر تصور کرتی تھیں جب ہی تو مولانا شرمرحوم نے پنکم چندر چیٹر جی کے ناول در گیش نندی کا ترجمہ اردو میں کیا تاکہ

مسلمان اس قسم کے خیالات سے بے خبر نہ رہیں۔ شاید اس لیے بدلت ہو کر انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بہتر ہو گا ہندوستان کو ہندو اور اسلام دو خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

- ۲۷۳۔ عبدالقادر، نذر اقبال، مرتبہ حنفی شام، ص ۸۲۔

میں لکھ چکا ہوں بخواہ شاہین، اور ان گم گشته اور یہ شاید ٹھیک بھی ہے کہ اول یہ ترانہ ایک نیشنل، جلسے ہی میں پڑھا گیا۔ ہر دیال کی قائم کردا۔ Young men Indian Association میں بھارت کا قومی ترانہ بننے والترم ہے۔ لیکن ترانہ ہندی اب بھی کسی نہ کسی تقریب میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کی دھن بڑی وجدانگیز ہے۔

- ۲۷۴۔ اور Nationalism Communalist ایسے الفاظ میں صرف ہندی اسلامی ریاست میں ان کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر استعمال کر رہا ہوں۔

- ۲۷۵۔ میری رائے میں قوم کے لیے قوم کا لفظ واضح طور پر انہوں نے صرف اسی نظم میں استعمال کیا۔

- ۲۷۶۔ شکوہ ہند۔

- ۲۷۷۔ سیدنذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، زیر ترتیب۔

- ۲۷۸۔ میخزن، ۱۹۰۲ء۔ قومی زندگی کے زرعیوان یہ مضمون مقالات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی میں مل جائے گا۔ دیکھیے صفحات ۲۲۳، ۲۲۴ اور جا بجا۔

- ۲۷۹۔ عطیہ بیگم اقبال، اس ڈائری کا کوئی نسخہ انگریزی، اردو۔

- ۲۸۰۔ یہم میخزن میں شائع ہوئی۔ حاشی کے ساتھ۔ قارئین اس باب میں میخزن سے رجوع کریں۔

- ۲۸۱۔ عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، ص ۵۲۔

- ۲۸۲۔ سیدنذر یہ نیازی، مکتوبات اقبال، ص۔

- ۲۸۳۔ سیدنذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، زیر ترتیب۔

285- Don't Proceed to Deva.

- ۲۸۴۔ سیدنذر یہ نیازی، اقبال کے حضور، زیر ترتیب۔

- ۲۸۵۔ انوار اقبال، طبع اول، ۱۹۶۱ء، اقبال اکادمی کراچی، ص ۱۷۸۔

- ۲۸۶۔ وکیل، امر تسر، ۱۹۱۶ء، جنوری ۱۹۱۶ء، بخواہ اقبال، جملہ بزم اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۹۳۔

- ۲۸۷۔ سیدنذر یہ نیازی، مکتوبات اقبال، ص ۱۲۔

- ۲۸۸۔ اسرار خودی:

کشته	انداز	ملا	جامیم
نظم	و نشر	او	علان
نامیم			

- ۲۸۹۔ عطیہ بیگم، اقبال، ان کی ڈائری کا کوئی نسخہ، انگریزی، اردو۔

- ۲۹۰۔ دیکھیے: اس سلسلے میں دیوان غالب، نسخہ حمیدیہ، اشاعت اول جس کا مقدمہ ڈائز بخوری مرحوم نے لکھا۔ لیکن بخوری مرحوم نے جب غالب کے ایک شعر پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ کہا کہ غالب

ہالینڈ کے وجودی فلسفہ اپیورا کا ہم خیال ہے تو مفتی انوار الحق مر جوم (اس زمانے میں معتمد تعلیمات بھوپال) نے وحدۃ الوجود کی مختلف تعبیروں کے پیش نظر جن کا سلسلہ الحاد و زندقة سے جاتا ہے، حتیٰ کہ دہریت سے ایک طویل مضمون وحدۃ الوجود کی اسلامی شکل پر لکھا تاکہ یہ غلط فہمی کے وحدۃ الوجود کی تعلیم کسی رنگ میں اسلام کے خلاف دور ہو جائے۔ یہ مضمون بطور دبیا پے کے اس نئے میں موجود ہے۔ مفتی صاحب نے اس موضوع پر اس لیے قلم اٹھایا کہ مطہق کی رو سے دو ہی نتیجے ہیں جو وحدۃ الوجود سے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم فطرت الہیہ میں ختم کر دیں یا ذات الہیہ کو فطرت میں اور دونوں ازروئے اسلام غلط۔

۲۹۳۔ فرانسیسی مستشرق لاندو Landau کے نزدیک ابن عربی وجودی نہیں تھے۔ کچھ ایسا ہی خیال مشہور تر کی شاعر ضیا کا ہے۔ ضیا کے لیے دیکھیے: Ziya Gokalp از نیازی Berkes یہ کتاب RCD نے شائع کی۔

۲۹۴۔ کمیش اکبر آبادی: نقد اقبال میں یہ بحث۔

۲۹۵۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، دوسرا خطہ، آخری وصیفات۔

۲۹۶۔ دیکھیے: مفتی انوار الحق کا مضمون دیوان غالب نسخہ حمید یہ میں۔

۲۹۷۔ روی:

زاد	دائش	مند	آثار	قلم
زاد	صوفی	چست	آثار	قدم
ہم	چو	صیادے	سوئے	آشکار شد
گام	آہو	دید	و	بر آثار شد

۲۹۸۔ دیکھیے: پروفیسر نکلسن کی کتاب The Idea of Personality in Islam پروفیسر نکلسن مشنوی معنوی کے مترجم کا کہنا ہے میں بھی ایک زمانے میں روی کو وجودی سمجھتا رہا۔

۲۹۹۔ بزم اقبال، مکاتیب اقبال بنام نیاز محمد خان۔

۳۰۰۔ عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، ص ۷۷۔

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیدھی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیدھی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیدھی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیدھی پروف داناے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا کیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

پہلا اکیڈمی پروف داناۓ راز

پہلا اکیڈمی پروف دانائے راز

- روزگار فقیر۔ ج اص، ۲۲۹، لیکن یہ تاریخ قطعی نہیں ہے۔ دیکھیے پروفیسر محمد عثمان کی یادداشتیں علامہ اقبال کی ولادت پر مباحثہ (زیریط) خالد نظیر صوفی، اقبال و رون خانہ۔
- ڈپٹی وزیر علی بکری کے بیہاں، جن کو سرکار انگریزی اور حصے سیالکوٹ لائی، امور ضلع کا تنظیم و انصرام بڑی حد تک انہیں کے پر دھنا۔ سلامی کی علگر مشین سب سے پہلے انہیں کی فرمائش پر سیالکوٹ آئی اور شیخ نور محمد کے سپرد کردی گئی۔ لہذا لوگ انہیں نور محمد کا لاداں لے بھی کہتے بنگر سلامی مشین کل ہی تر ہے۔

- والد محترم گھر آرہے تھے۔ دیکھا ایک کتاب بھوک سے بے حال ہو رہا ہے۔ رومال میں تھوڑی سے مٹھائی تھی، اس کے آگے رکھ دی۔ رومال ترکر کے پانی بھی پلایا۔ اس رات خواب میں دیکھا گھر میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں۔ صحیح اٹھے تو اس یقین کے ساتھ کہ ان کے دن پھر نے والے ہیں۔ پھر بھائی صاحب بھی نوکر ہو گئے۔ سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، ج اص، ۱۹۶۹ء۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۷۳ء۔

- والد محترم نے خواب میں دیکھا، ایک کبوتر بہت اونچا اڑ رہا ہے دفعۃ ان کی جھوٹی میں آگرا۔ یہ خواب میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔ وہ اسے ایک اشارہ غمی سمجھے۔ سید نذرینیازی: اقبال کے حضور۔ ج اص، ۹۵۔

### سید نذرینیازی: اقبال کے حضور۔ ج ۲ زیریط

- خواجہ محمد عظیم شاہ دیدہ مری، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں گزرے ہیں۔ تاریخ کشمیر کا دوسرا نام ہے۔ تاریخ عظمی، واقعات کشمیر۔ سنہ تصنیف ۱۹۵۵ء۔
- اُون تحصل کلگام میں ہے، ضلع اسلام آباد (انٹ ناگ)
- حضرت علامہ کاظم شیخ عطاء محمد کے نام، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء، دیکھیے صحیفہ مجلہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ شمار ۱۶۵، ۱۹۷۳ء۔ اقبال کے اجداد کا سلسلہ عالیہ اڑاکٹر محمد باقر صفحات ۳ و ۴ میں نقل کا لاصلن ایضاً، شمار ۱۶۵، ۱۹۷۳ء تاریخ وفات ۱۹۵۱ء عارف باللہ نصر الدین۔
- ولادت ۱۳۷۸ء۔ وفات ۱۳۳۹ء تاریخ وفات شخص العارفین۔ ریشن سے مراد ہے رشی، (منکرت ترقی) تارک الدنیا۔ زاہد و عابد۔ صحیفہ، شمارہ ۱۶۵، ۱۹۷۳ء۔ وہی مضمون۔ وہی شہاب الدین جس کا ذکر جاوید نامہ میں آیا ہے۔

عمر	حکایات	ما	دیگر	دیگر	رخت	کل	کشاد
خاک	نزاں	الدین	شہاب	شہاب	برbast	و	
عہد حکومت ۱۳۲۰ تا ۱۳۲۰ء۔ یہ سینیں اس لیے اہم ہیں کہ ہم انہیں کے حوالے سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حکیم الامت کے آباد اجداد نے اسلام قبول کیا تو کس زمانے میں۔							-۱۳
صحیفہ: مجلس ترقی ادب۔ لاہور فوق کے نام حکیم الامت کے خط اقبال۔							-۱۴
سینی عربی امجد کا احوال حروف							-۱۵

### Root مادہ

- مکتبہ مذکور فوق کے نام۔ ج اص، ۲۔ نیز ج ۶ میں ابو محمد حاجی جی الدین مسکین کی کتاب تھائف الابرار فی ذکر اولیاء اخیار (تاریخ کبیر کشمیر) کا اقتباس۔
- عجیب بات ہے کہ پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا سپرد خاندان ہے تو سر تھی بہادر سپرد کا جن کے علاوہ کسی سپرد خاندان کا سراغ نہیں ملا۔ مسئلہ تھائیت اعجاز احمدی شادی کا۔ کوشش تھی کہ ان کی شادی سپرد کے بیہاں ہو۔ دیکھیے اقبال، مجلہ بزم اقبال (انگریزی اشاعت) اکتوبر ۱۹۵۳ء میں۔
- فوق اور ان کے تھیج میں حضرت علامہ کے مکتبہ، دیدہ مری اور مسکین کے بیانات اور سلطان زین العابدین کے سینیں حکومت سے واقفیت کے باوجود اس غلطی کا اتحاد ہوتا رہا۔ دیکھیے فوق کا مضمون ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی مختصر سوانح حیات: نیرنگ خیال اقبال نمبر، تمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں۔
- ضلع سیالکوٹ میں۔
- سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، ج اص، ۱۶۹۔
- ایضاً ج ۹۷۔

- ابو عبد اللہ مولا ناغلام حسن، ڈن سا ہیوالا۔ فاروقی شیخ نواب صدیق حسن خاں اور پھر مولوی مرتضی صاحب سے تلمذ رہا۔ عالم و فاضل، بڑے بزرگ، صاحب کشف۔ مسجد صرافاں میں درس دیتے، عقیدت سند اور طلباء حاضر خدمت رہتے۔ مولوی ابراہیم انہیں کے شاگرد رشید تھے۔ میر حسن سے نہایت گھرے روابط تھے۔ قنیفات متعدد۔ اسلامی معاشرے کے اخنطا طاں کا اس امرے اندازہ کیجئے کہ اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرسی کی، سیرت و کردار کا یہ عالم کہ مولوی ظفر اقبال دوپھر میں ان سے سبق لیتے۔ ایک روز حاضر خدمت ہوئے تو سور ہے تھے۔ مولوی صاحب کے پاؤں داہنے لگے۔ دوسرے روز، مولانا نے

پوچھا کل کیوں نہیں آئے کہا آپ آرام فرمائے تھے۔ کہنے لگے اچھا اور پھر اس واقعے سے ایسے متاثر ہوئے کہ دو پھر میں بھی آرام نہ کیا۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو فوت ہوئے۔  
- ۲۳ سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور حاصہ، ص ۹۶۔

لیکن اس کے یہ مخفی ہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے، کہ انہیں مولانا غلام حسن کے یہاں دینیات کی تعلیم کے لیے بھیج کی روایت غلط ہے۔ وہ مسجد یعنی عمر شاہ کے مکتب سے سید حسن کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ ان کے والد ماجدی البتہ یہ خواہش تھی کہ انہیں صرف دینی تعلیم دلوائیں۔ انہوں نے شاہ صاحب سے جو گویا انہیں اسکول کی تعلیم کے لیے تیار کر رہے تھے، درخواست کی انہیں دینی علوم پر پڑھائیں، اسکول کی تعلیم نہ دیں۔ جس پر شاہ صاحب نے کہا یہ بچہ مسجد میں نہیں اسکول میں پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے شیخ نور محمد کا خیال ہو کہ اگر شاہ صاحب ان کی درخواست نہ مانیں تو بیٹے کو مولانا غلام حسن کے درس میں بھیج دیں۔ دونوں صورتوں میں بالآخر وہی ہوا جو شاہ صاحب چاہتے تھے۔  
- ۲۴ اقبال ص ۹۶۔

- ۲۵ یہ مدرسہ کلیساۓ سکاٹ لینڈ (Church of Scotland) نے ۱۸۵۹ء میں قائم کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا مدرسہ ۱۸۵۵ء میں قائم ہو چکا تھا۔ امریکن مشن ہائی اسکول کے نام سے United Presbyterian Church of America کی طرف سے۔ سیالکوٹ میں مسیحی مبشرین کی سرگرمیاں پنجاب میں سرکار انگریزی کے تسلط کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھیں۔

Career - ۲۶  
اقبال کے حضور حاصہ ص ۹۶۔  
- ۲۷ ورنکولر Vernacular یعنی مل مل۔ اس زمانے میں تعلیم کی درجہ بندی اس طرح کی گئی تھی: تین سال پر انگریزی اول، دو سال پر انگریزی دوم، تین سال مل، دو سال انگریزی، دو سال ایف اے دو سال بی۔ اے ایک یاد دو سال ایم۔ اے کے لیے۔  
Murray College موجود عمارت ۱۹۰۹ء میں تعمیر ہوئی۔ کالج روڈ پر۔

Faculty - ۲۸  
- ۲۹ سیدنذر نیازی۔ اقبال کے حضور حاصہ ص ۹۶، اقبال اکیڈمی کراچی۔  
- ۳۰ اس ملاقات میں ڈاکٹر وحید قریشی راقم احمدوف کے شریک سفر تھے۔ مرحومہ کے ارشادات قلمبند کرتے رہے۔ تقریب اس ملاقات کی یہ تھی کہ علیم الامت کی تاریخ و لادت معلوم کی جائے۔ بزم اقبال کی طرف سے بنیوال پروفیسر محمد عثمان معتمد اعزازی بزم اقبال ہم بطور ایک وفد سیالکوٹ پہنچے۔

- ۳۱  
- ۳۲  
- ۳۳  
- ۳۴  
- ۳۵

	ما	بنویم	غالب	بدیں	مرتبہ	راضی	خواہش	آں	کرد	کے	گرد	و	فن	ما	شعر	خود
بقول ڈاکٹر جشید علی راخنور، حضرت علامہ کے ہم سبق، رشتے میں خالہ زاد بھائی۔ لیکن ان کے علم و فضل اور کمال شاعری کے منکر۔ ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی، پروفیسر مرے کالج، سیالکوٹ، انگریزی میں شعر کہتے۔ کلام چھپ پکا ہے۔	راٹھور مرحوم سے ۱۹۵۲ء میں ملاقات ہوئی۔ مهر مرحوم اور ڈاکٹر عبداللہ چفتائی ساتھ تھے۔ بزم اقبال کی طرف سے ایک وفد کی صورت میں ہم سیالکوٹ پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے سوانح لکھنی ہے تو میر حسن کی لکھتے۔ اقبال میں کیا رکھا ہے وہ ان کے نفس ناطقہ ہی تو تھے اور کیا تھے۔ مرحوم صاحب تو اس کے بعد میر حسن ہی کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ بات بات پر کہتے اللہ اکبر! میں نے عرض کیا جو آپ فرماتے ہیں اقبال ان کے نفس ناطقہ تھے، تو ان کی سوانح حیات پر قلم اٹھانا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ راخنور صاحب کے بیانات ڈاکٹر عبداللہ چفتائی نے مهر مرحوم کے زیر ہدایات قلمبند کیے جو بزم کے دفتر میں موجود ہیں۔ راخنور مرحوم کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یاد دشیں میرے دوست کلیم اختصار صاحب کے پاس محفوظ ہیں جو خود انہوں نے ان سے ملاقات کے بعد مرتب کیں۔ راقم احمدوف نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ ان یادداشتوں کو دیکھ کر ایک ہی بات ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ کہ افضل ما شہدات بالاعداد۔															

- ۳۶  
My education began with the study of Arabic and Persian. A few years after I joined one of the local schools. Development of Metaphysics in Persia.

سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور حاصہ ص ۹۶۔  
سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور حاصہ ص ۹۶۔  
خالد نظیر صوفی: اقبال دوران خانہ، بزم اقبال، لاہور۔ ۳۷۱۹۴۷ء۔ ص ۱۰۳ تا ۱۰۴۔  
اسرار خودی:

گرچہ	ہندی	در	غدوہ	شکر	است	
طریقہ گفتار دری شیریں تراست	گرچہ	ہندی	در	غدوہ	شکر	است

یوں بھی ایک ایسے ادب کی تکلیل میں جس سے زندگی کو تحریک ہوان کا ذہن عربی ادب کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ الہابطی امر تھا کہ فارسی ہو، یا اردو ان کے کلام میں اسلامی ادبیات کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے ہیات افروز اثرات کا عمل دخل بڑھتا چلا جائے۔ اسرار خودی میں جب حافظ کی تقدیم سے ایک علط تاثر قائم ہوا تو اس کے ازالے کے لیے درحقیقت شعرواد بیات اسلامیہ کے عنوان سے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے، اے میان کیسات نفتخت، میں صاف صاف کہا:

فکر	صالح	در	سوتے	عرب	ادب	می	باید	باید	اسرار خودی:
فارسی		از		رفعہ		اندیشہ	ام	ام	-۳۲
درخورہ		با		فطرت		اندیشہ	ام		-۳۳
سیدنذر نیازی: اقبال کے حصور، ج ۲، زیر طبع۔									-۳۴
سیدنذر نیازی: اقبال کے حصور ج ۲ زیر طبع									-۳۵
انوار اقبال: اقبال اکیڈمی کراچی ص، ۱۷، ۸									-۳۶
سیدنذر نیازی: اقبال کے حصور، ج ۲ زیر طبع۔									-۳۷
سیالکوٹ میں ان دونوں چار مدرسے تھے: مولانا غلام حسن، مولانا مرتضیٰ اور مولانا مزمیل کا مدرسہ چوچھا میر حسن کا۔ پہلے تین مدرسوں میں صرف علوم دین کی تعلیم ہوتی، میر حسن کے مدرسے میں علوم دینی اور دینوں دونوں کی۔									-۳۸
رموز بیجنودی: حسن سیرت ملیہ از تادب بآ داب محمد است۔									-۳۹
سیدنذر نیازی: اقبال کے حصور ج ۱ ص، ۲۰، ۲۱ مخلصاً بال جبریل کے شعر۔									-۴۰

کتاب نزول کے شعر۔

تیرے	ضمیر	پہ	جب	تک	نه	ہو	نزول	کتاب	کثاف
گرہ	کشا	ہے	نه	رازی	نه	صاحب			سے اسی واقعے کی یادتازہ ہو جاتی ہے۔

سید سیلان ندوی نے ”سفر افغانستان میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے نیز دیکھئے شیخ عطاء اللہ اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ دوم ص، ۱۲۰۔ برداشت عطیہ بیگم۔ دیکھئے اقبال از عطیہ بیگم۔ سیالکوٹ سے براہ راست کوئی میں میں دور گجرات کے پاس۔

قاضی صاحب موصوف عصر حاضر کے ایک عظیم صوفی بزرگ تھے۔ نواب معشوق یار جنگ بہادر نے جو قاضی صاحب کے حلقة ارادت میں شامل تھے، ان کے حالات زندگی لکھے ہیں، نواب فخر یار جنگ بہادر اور مسٹح الملک حکیم محمد احمد خان کو بھی ان سے دلی ارادت تھی۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ ان کے زیر اثر سلسلہ قادریہ دور دور تک پھیل گیا۔

ماہنامہ ضیائے حرم: اشاعت اپریل ۱۹۷۵ء۔ سید نوراللہ شاہ قادری کا مضمون بعنوان سلسلہ قادریہ میں علامہ کی بیعت۔ نیزا اقبال: اکتوبر ۱۹۵۳ء اقبال کے بعض حالات۔

شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ حصہ اول، مکتب ص، ۳۵

جاوید نامہ:

تاغرالی درس اللہ ہو گرفت

ذکر و فکر ازاد و مان او گرفت

شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ دوم ص، ۲۳۔

سید وحید الدین: روزگار فقیر، حصہ دوم ص، ۱۳۱،

اور جس کا ذکر انہوں نے عطیہ بیگم کے نام اپنے خط اور دیے بھی گفتگوؤں میں کیا ہے۔

اسرار خودی:

آن نواپرداز گزار کہن گفت مارا از گل رعناء خن

حضرت قلندر فرماتے ہیں



-۸۵ اقبال کے حضور ج از طیع۔  
دیکھیے بالگ درا کی نظم نوائے غم اور زبور عجم۔

کن	گوش	برادر	اوے	است	قتم	دو	غم	شعلہ	-۸۶
کن	ہوش		چراغ	مارا					
راخورد	آدم	کی	غم	آن	است		یک		-۸۷
جورد	غم	غم	ہر	دیگر			غم	آن	-۸۸
است	ہدم		کہ	مارا	دیگر		آن		-۸۹
است	غم	اوے	از	صحبت	غم		جان		-۹۰
		بے						سید نذر نیازی: اقبال کے حضور (زیر طبع)۔	-۹۱
								اقبال نامہ حصہ دوم، مکتوب بنام تصدق حسین۔ ۱۹۲۷ء ص، ۱۰۰ ائمہ ترجمہ حسن الدین نے کیا۔ عنوان ہے فلسفہ عجم۔	-۹۲
								سید وحید الدین: روزگار فقیر حصہ دوم ص، ۲۰۹۔	-۹۳
								سید وحید الدین: روزگار فقیر۔ حصہ اول ص، ۳۳۔ ۳۲ اور ۱۰۹۔	-۹۴
								بقول ڈاکٹر جشید علی راحمودی: یادداشتیں۔	-۹۵
								نیرنگ خیال: اقبال نمبر ستمبر ۱۹۳۳ء ص ۵۷۔	-۹۶
								سید نذر نیازی: اقبال کے حضور، جلد ا۔ حصہ اول ص ۲۵۱۔	-۹۷
								حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے:	-۹۸

مباش	مباش	بد	غیر	کہ	این	کیے	دو	مرا	-۹۳
									سید وحید الدین: روزگار فقیر۔ حصہ دوم ص ۱۹۵۔
									سید وحید الدین: روزگار فقیر، حصہ اول، ص ۳۸۔
									سید نذر نیازی: اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۹۲۔
									Sakala Sagala
									Menader (milinda) Eutyhydamon
									Mihragala
									Sialkot District Gazetteer, 1967
									-۹۴
									جس کے بعد سیالکوٹ کی تباہی اور بر بادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ مغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا۔ صرف سوری دروازے کا نام باقی رہ گیا۔ جہانگری کے تیس کرہہ شیش محل کی تو یاد بھی باقی نہیں۔
									-۹۵
									مکتوب میر حسن محمد دین فوق کے نام۔ نقش مکاتیب نمبر، ۱۹،
									-۹۶
									Boundary Commission
									-۹۷
									امام علی حق کا مزار امام صاحب کہلاتا ہے۔ منڈی میں اس کا حق مشن ہائی اسکول اور اس کے یونیورسٹی میں امریکن مشن ہائی اسکول اور تحریکیں کی عمارت تعمیر ہوئی۔ پاس ہی پانی کا تالاب تھاما لاعبد الحکیم کا تعمیر کردہ۔
									-۹۸
									بشمول چھاؤنی کی کوئی پچاس ہزار 1967ء
									-۹۹
									سیالکوٹ اور اسکے اطراف میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں ۱۸۵۷ء سے پہلے یعنی پنجاب پر برطانوی قبضے کے ساتھ ہی شروع ہو گئیں۔ ۱۸۵۵ء سے۔
									-۱۰۰
									یہ بجاۓ خود ایک اہم موضوع ہے۔ میر حسن فیض کوکھ پکے تھے کہ سکھ گردی میں سیالکوٹ پر کیسے تباہی۔ کتب خانے نذر آتش کر دیے گئے۔ علماء نے آس پاس کی بستیوں میں پناہی۔ رفتہ رفتہ ان کی

اولاد بھی علم و فضل سے محروم ہوتی چلائی کچھ بچی کھپی کتائیں یادگارہ گئیں سید نور محمد قادری جن کا خاندان لگی چوڑی گراں ہی کے قریب آباد تھے اپنے جدا مجدد سید چراغ شاہ کے بعد سیالکوٹ سے نکل گیا۔ رقم المحرف کو ان کا نیاز حاصل ہے۔ انہوں نے بکمال شفقت اس زمانے کے اہل قلم کے حالات پر گستاخی کی تحریریں اور مسودات دکھانے پر جن میں مولانا محمد حسن فیضی جخنوں نے عربی میں ایک قصیدہ لکھا۔ سید ظہور اللہ شاہ اور مولوی عبدالکریم اشرافی کے نام خاص طور پر مقابل ذکر ہیں۔

- |       |                                                                                                                                 |
|-------|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| -۱۰۸- | سوانح علامہ عبدالکریم سیالکوئی از فوق، محمد اقبال کا تبصرہ۔ ۳ دسمبر ۱۹۲۳ء دیکھیے مقالات اقبال از سید عبدالواحد معین ص ۲۰۱، ۲۱۱۔ |
| -۱۰۹- | یاشیدنیں۔                                                                                                                       |
| -۱۱۰- | بانگ درا۔                                                                                                                       |

۱۱۱۔	میرا سیدنذرینہاری: اقبال کے حضور ج اص ۲۵-۲۶۔	یاد عہد مانسی
۱۱۲۔	سیدنذرینیازی: اقبال کے حضور ج اص ۲۵-۲۶۔	
۱۱۳۔	سید وحید الدین: روزگار فقری، ج اص ۱۲۷۔	
۱۱۴۔	ایضاً، ج ۲ ص ۷۵۔	
۱۱۵۔	باغک درا: سر سید کی لوح تربیت۔	
۱۱۶۔	بقول ولیم حمیز، نفیات میں۔	
۱۱۷۔	باغک درا: عہد طفلی۔	

- |           |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |
|-----------|--------------------------------------------------------------------------------------------------|-------------------------------------------|------------------------------------------------|------------------------------------------------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------|--------|
| تھے       | دیار                                                                                             | تو                                        | زمین                                           | و                                              | آسمان                                                                                                                                                           | میرے                         | لیے    |
| و سعٰتِ   | آغوش                                                                                             | مادر                                      | اک جہاں                                        | میرے                                           | لیے                                                                                                                                                             | لیے                          | لیے    |
| آنکھ      | وقت                                                                                              | دید                                       | تحمی                                           | مال                                            | گفتار                                                                                                                                                           | تحمی                         | تحا    |
| دل        | نا                                                                                               | تحا                                       | میرا                                           | سرپا                                           | ذوق                                                                                                                                                             | استفسار                      | تحا    |
| بال جریل: | زمتنی                                                                                            | گرچہ                                      | تحمی                                           | ششیر                                           | کی                                                                                                                                                              | تیزی                         | خیزی   |
| -۱۱۸      | نہ                                                                                               | مجھ سے                                    | لندن                                           | میں                                            | بھی                                                                                                                                                             | آداب                         | حر سحر |
| -۱۱۹      | کلیم اختر: یادداشیں                                                                              | ہوا                                       | میں                                            | گرچہ                                           | تحمی                                                                                                                                                            | ششیر                         | زمتنی  |
| -۱۲۰      | رجیم بخش شاہین: اوراق گستاخ۔ سید محمد ذکری کا بیان اقبال کا بچپن میں ۲۴۶ ص ۲۴۷ اور ص ۲۴۷ ملخساً۔ | سید نذرینیازی، اقبال کے حضور، ج ۱، ص ۱۳۸۔ | پوری نظم کے لیے دیکھئے ان کا کوئی مجموعہ کلام۔ | مکاتیب اقبال، نیاز الدین خاں۔ بزم اقبال لاہور۔ | نیاز الدین خاں کے صاحبو زادے۔ رقم الحروف کے ہم جماعت۔ نیاز الدین، خاں کی یادداشیں بعنوان گرامی، نیاز، اقبال تا حال طباعت نہیں ہو سکی۔ مسوودہ میرے پاس محفوظ ہے۔ | گوئے فاؤسٹ کی تمہد کی۔ Faust |        |
| -۱۲۱      |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |
| -۱۲۲      |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |
| -۱۲۳      |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |
| -۱۲۴      |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |
| -۱۲۵      |                                                                                                  |                                           |                                                |                                                |                                                                                                                                                                 |                              |        |

-۱۲۶ - رجیم بخش شاہین Gabriel's Wingsaz Newlight on the Early Life of Iqbal میں لفظیت کرٹن کے اے شید کا مضمون بکوال۔ Anamarie Schimmel

- ۱۲۷ اقبال روپو: مجلہ اقبال اکیڈمی، کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء۔

-۱۲۸ اقبال، مجلہ برم اقبال، لاہور۔ میر نیرنگ کامضمون اقبال کے بعض حالات۔

-۱۲۹ شاہین: اوراقِ مگ شیٹ - ص ۲۷۰۔

-۱۳۰ شیخ عطا اللہ: اقبال نامہ۔ حصہ دوم، مکتب - ۱۲۲ اگست ۱۹۰۸ء۔

-۱۳۱ سید وحید الدین: روزگار فقیر۔

- ۱۳۲ بائگ درا: دیباچہ از شیخ عبدالقدار۔
- ۱۳۳ ایضاً
- ۱۳۴ دیکھنے روزگار فقیر، حصہ نظم۔
- ۱۳۵ نیم و تشنہ ہی اقبال پر نہیں نازاں پر سخنداں شاگردی اس پر کچھ فخر ہے مجھے بھی تھی حقیقت سے نہ غفلت کی پرواز پر نہیں نہیں کی طائر آکھ میں پرواز سید نذر نیازی: بہار داغ۔ ہی دیباچہ۔
- ۱۳۶ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ اول۔
- ۱۳۷ سید وحید الدین: روزگار فقیر حصہ اول ص ۱۰۰۔
- ۱۳۸ اقبال، مجلہ بزم اقبال، شمارہ ۱۹۲۰ء عبدالقدیر یشی کا مضمون اقبال اور فوق۔
- ۱۳۹ سید وحید الدین: روزگار فقیر حصہ اول ص ۱۰۰۔
- ۱۴۰ جارج سارٹن (George Sarton) مقدمہ تاریخ سائنس اور تاریخ سائنس میں فارمر (Henry Farmer) کی کتاب اور ماضی میں عربی موسیقی کے اثرات مغربی موسیقی پر نیز دیکھیے میراث اسلام (Legacy of Islam)
- ۱۴۱ سید نذر نیازی: اقبال کے حضور ج ۲ زیریطع۔
- ۱۴۲ دیکھنے کتب خانہ جامعہ پنجاب۔ کیفیٰ کلکشن مجلدات رسالہ زبان ۳۱۸۹۳ اور ۱۸۹۳ء یہ رائج عبدالرحمن رائج ہیں۔ رائج عظیم آبادی نہیں ہیں۔
- ۱۴۳ صحیفہ: مجلس ترقی ادب لاہور۔ شمارہ ۳۷۱۹ء میزاج محمد منور کا مضمون اقبال کی شاعری۔
- ۱۴۴ سید وحید الدین: روزگار فقیر، حصہ دوم۔
- ۱۴۵ اقبال: مجلہ بزم اقبال لاہور۔ محمد عبدالقدیر یشی کا مضمون لاہور کے مشاعرے ص ۳۸، ۳۹۔
- ۱۴۶ رحیم بخش شاہیں: Iqbal Mementos
- ۱۴۷ مکتوب ۲۷۱۹ء رقم الحروف کے نام۔
- ۱۴۸ سید وحید الدین: روزگار فقیر حصہ دوم۔
- ۱۴۹ سید نذر نیازی: اقبال کے حضور میں۔ ج ۲ زیریطع۔
- ۱۵۰ ماہنامہ اسلامی تعلیم، ال پاکستان ایجو کیشنل کانفرنس، اشاعت ۷۷ء لاہور۔
- ۱۵۱ امر تبریحیم بخش شاہیں ص ۲۸۔
- ۱۵۲ بال جریل۔ ساقی نامہ۔
- ۱۵۳ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ۔ دیباچہ۔
- ۱۵۴ سید نذر نیازی: اقبال کے حضور، ن ۱۔
- ۱۵۵ مصرع اولیٰ میں لاہور کی جگہ پنجاب ہے۔
- ۱۵۶ مولانا میر حسن کی۔
- ۱۵۷ سید نذر نیازی: اقبال کے حضور۔ ج ۲۔ زیریطع۔

فصل دوم

لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے۔ Quadrangle

# University Careers

- ۳- ڈاکٹر وحید قریبی: کلاسیک ادب کا تحقیقی مطالعہ، طبع ۱۹۶۵ء ص ۳۱۔ فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر، ص ۲۰۔ دیکھیے خان بہادر ایف۔ ایں جمال الدین کا نقش۔ فقیر صاحب مرہوم پنجاب یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ انتقال سے قبل اپنا ذائقی کتب خانہ پنجاب پیلک لائبریری کی نذر کر دیا۔ یہ تمنۂ عربی میں امتیازی کامیابی کے لیے مخصوص تھا، حسب قرارداد، پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ، ۸ جون ۱۸۹۱ء۔

- ۴- اقبال۔ مجلہ بزم اقبال لاہور۔ شمارہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۵۷ء۔ ص ۵۔ میر صاحب کا مضمون بعنوان اقبال کے بعض حالات۔

- ۵- باعزاز جی۔ ایں۔ بریٹ (G.S. Brett) جو ۱۹۰۴ء میں کرائسٹ کالج سے لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں فاسنڈ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس تقریب کے لیے دیکھیے اقبال رویو، انگریزی اشاعت۔ تقاضی محمد اسلام کا مضمون، بعنوان اقبال at a College Reception in Lahore ۱۹۷۶ء۔

Hemmy

- ۷ اسی تقریب سے کچھ پہلے محمد اقبال نے نظریہ اضافیت اور خودی کے عنوان سے انگریزی میں ایک مضمون اسلامیہ کا لمحہ کے ماہنامہ کریسٹ میں لکھا جس کا ترجمہ راقم الحروف نے رسالہ جامعہ دہلی میں شائع کیا اور جواب اقبال کی تحریروں کے کئی ایک مجموعوں میں شامل ہے۔ راقم الحروف اس وقت اسلامیہ کا لمحہ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ہمارے فلسفہ کے پروفیسر مرحوم خواجہ عبدالجید پیغمبر دینے کے لیے آئے تو جیسے کوئی بہت بری خبر لائے ہیں۔ کہنے لگے میں ایک خبر لایا ہوں اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے تو سبھی خط مستقیم ہو۔ پروفیسر صاحب اکثر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتے شاہزادان کے اصرار ہی سے محمد اقبال نے کریسٹ کے لیے یہ مضمون لکھا۔ پروفیسر صاحب کی محمد اقبال بے گفتگوؤں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

- ۸ دیکھیے تکلیف جدید الہیات اسلامیہ۔ بحث علم الہ۔ اس باب میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا پیدا کردی گئی سطور بالا سے اس کا اللہ باہ سانی ہو جاتا ہے۔

-۸- ویکھے تکلیف جدید الیات اسلامیہ۔ بحث علم الہی۔ اس باب میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا پیدا کردی گئی سطور بالا سے اس کا اللہ آسمانی ہو جاتا ہے۔  
 -۹- یہ مضمون صحیحہ: اقبال نمبر، ۲۷۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ بغتوں سرا اقبال دے نال میں۔ ص۔ ۶۰۔

سینئر نانکن اقبال کھضور مجاہد

سید مدیریتیاری، انجامے سورن، نا،

Sir Thomas Walker Arnold

الفِت	اسلام	کے	دل	میں	ہے
اور	مسلمانی	قبا	زیب	بدن	
Siddons union club	طلبا کی نجمن۔				-۱۳
Miniatures					-۱۲
بانگ دار:					-۱۵

Atiya Begum, Iqbal, Feb. 1947, P.20.

۷۱-

براؤن نے تاریخ ادبیات ایران کے علاوہ باب اور بہائیت میں کئی ایک کتابیں، تصنیف کیں۔ علی ہذا طب عربی کے عنوان سے ایک تصنیف۔ بدھ اور مسیح بلطف نے خود کے حالات پر قلم اٹھایا۔ Future of Islam ان کی مشہور تصنیف ہے۔

-۲۰ Iqbal has lost his friend and teacher

-۲۱ دیکھیے لیڈی آرنلڈ کے نام تعریزت کا خط، ۱۶ جولائی ۱۹۳۰ء Letters and Writings of Iqbal اور ۱۹۶۷ء میں محمد اقبال لکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی وفات سے نہ صرف برطانوی دنیا میں علم و فنا صان پہنچا بلکہ دنیا میں اسلام کو بھی جس کے فکر و فرہنگ اور ادب کی کدمت میں آنجمانی نے تادم آخ کی نہ آنے دی۔ میرے لیے یہ زبان ایک ذاتی، حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ انہیں کہ اثر تھا جس نے میری روح کی تربیت کی اور اسے جادہ علم پر گامزن کر دیا۔

-۲۲ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ دوم، طبع ۱۹۵۱ء ص ۱۳۔

براؤن	جی	ای	کمال	اہل	نازشِ
عجمیم	مغرب	در	او	فیضِ	
چاک	او	اتم	اندر	مغرب	
نیم	شرق	دو	او	از	
گرفت	ماویٰ	بریں	بفردوں	تا	
اعظیم	الصور	ذالک	ہاتھ	گفت	

-۲۳ Mount Pleasant Community Birmingham

-۲۴ نامہ درانی ۱۹۲۲ء۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کا عنایت نامہ از برلنگ راقم الحروف کے نام اور ان کے مضامین روز نامہ جنگ میں۔ مثلاً اشاعت ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء۔ اپنے

-۲۵ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ اسد ملتانی مرحوم کا مضمون ”قطرہ شبیم“، جس پر انہیں انعام ملا۔ لالہ جیارام کے بارے میں مجھے یہ معلومات عبدالرحمن خاں ریٹائرڈ انجینئر سے حاصل ہوئیں۔ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں حکیم الامت کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا ایک نظر پر وہ بھی انعام کے مستحق تھے۔

-۲۶ P.G. Dallinger

-۲۷ Hirst

-۲۸ G.B. Ussher

-۲۹ Dr. Sterratton

-۳۰ Canadian

-۳۱ دیکھیے۔ B.A. Dar, Letters and Writings of Iqbal.

-۳۲ میں محمد اقبال کا تعریزت نامہ۔ اقبال اکیڈمی کراچی طبع، ۱۹۶۷ء ص ۱۲۱۔

-۳۳ Meleod Arabic Reader

-۳۴ اور B.O.L. ای او ایل مشرقی علوم میں موجودہ سنداور انٹرمیڈیٹ اس زمانے میں ایف۔ اے۔

-۳۵ اور ۱۸۸۹ء سے پہلی چلے آرہے تھے۔ استغفادا اور ملکتہ مدرسہ کے پہلی مقرر ہو گئے

-۳۶ Dean Oriental Faculty

-۳۷ A.C. Woolner جو ترقی کرتے کرتے بالآخر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان تمام معلومات کے لیے دیکھئے (۱) ڈاکٹر وحید قریشی: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۳۲۹ تا ۳۲۱۔

-۳۸ اور (۲) ریجیم بخش شاہین کی تالیف Mementos of Iqbal شائع کردہ آل پاکستان اسلام ایجوکیشن کانفرنس، ۱۹۶۷ء ص ۲۸ تا ۲۱۔

-۳۹ ڈاکٹر وحید قریشی: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص ۳۲۶۔

-۴۰ بحیثیت استاذ زبان انگریزی۔

-۴۱ Observer

Seekers After Good	-۳۱
ڈاکٹر وحید قریشی: کلائیکل ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص، ۲۳۸،	-۳۲
Dr. Haig خوب آدمی تھے۔ سواری کے لیے گھوڑا رکھ رکھا تھا۔ گھوڑے ہی پر سوار ہو کر کانج آتے۔	-۳۳
آج کل کی اصطلاح میں صوبیاتی سول سروس PCS	-۳۴
Lahore Law School	-۳۵
Jurisprudence	-۳۶
تفصیل کے لیے دیکھیے بی۔ اے۔ ڈار کی کتاب Iqbal Letters and Writings of شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی صفحات ۳۹۷۔ سید محمد تنہذی کامضمون New light on	-۳۷
Iqbal's Life	-۳۸
Indian Antiquary	-۳۹
Doctrine of Absolute Unity as expounded by al-jalani.	-۴۰
Studies in Islamic Mysticism	-۴۱
Stubb's Early Plantagenets	-۴۲
Epitomised translation of Walker's Political Economy.	-۴۳
دیکھیے ڈاکٹر وحید قریشی: کلائیکل ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص، ۲۳۸،	-۴۴
مخزن، شماراکتوبر ۱۹۰۳ء۔	-۴۵
یعنی خام پیداوار۔	-۴۶
(النماء): ۳۔	-۴۷
Marshall اور Taussig لیکن ان معاشرین کا دور بھی گزر چکا ہے۔	-۴۸
محمد اقبال: علم الاقتصاد نسخہ اقبال اکیڈمی کراچی، دیباچہ مصنف ص، ۲۳۔	-۴۹
محمد اقبال: علم الاقتصاد۔ نسخہ اقبال اکیڈمی کراچی۔ دیباچہ مصنف ص، ۲۳۔	-۵۰
اصطلاحاً یہ ہدیث ضعیف ہے۔ لیکن ابوسعید کے نزدیک بحوالہ الصاغانی صحیح دیکھیے: تذكرة الموضوعات۔ ص، ۱۷۷۔ طبع ۱۳۲۲ھ المکتبۃ القيمة، بمبئی۔ قرآن مجید کے ارشادات اس امر میں بہر حال واضح ہیں۔	-۵۱
علم الاقتصاد۔	-۵۲
ال ايضا۔	-۵۳
صحیفہ شمارہ ۱۹۷۱ء۔ ص ۸۵۔	-۵۴
دیکھیے جاوید نامہ۔ ارض ملک خدا است اور بال جریل۔ الارض اللہ۔	-۵۵
تیرے	-۵۶
بقول کسان الحصر:	-۵۷
نمہب	-۵۸
واسطے	-۵۹
کے	-۶۰
کے	-۶۱
کے	-۶۲
کے	-۶۳
کے	-۶۴
کے	-۶۵
کے	-۶۶
کے	-۶۷
کے	-۶۸
کے	-۶۹
کے	-۷۰
کے	-۷۱
کے	-۷۲
کے	-۷۳
کے	-۷۴
کے	-۷۵
کے	-۷۶
کے	-۷۷
کے	-۷۸
کے	-۷۹
کے	-۸۰
کے	-۸۱
کے	-۸۲
کے	-۸۳
کے	-۸۴
کے	-۸۵
کے	-۸۶
کے	-۸۷
کے	-۸۸
کے	-۸۹
کے	-۹۰
کے	-۹۱
کے	-۹۲
کے	-۹۳
کے	-۹۴
کے	-۹۵
کے	-۹۶
کے	-۹۷
کے	-۹۸
کے	-۹۹
کے	-۱۰۰
کے	-۱۰۱
کے	-۱۰۲
کے	-۱۰۳
کے	-۱۰۴
کے	-۱۰۵
کے	-۱۰۶
کے	-۱۰۷
کے	-۱۰۸
کے	-۱۰۹
کے	-۱۱۰
کے	-۱۱۱
کے	-۱۱۲
کے	-۱۱۳
کے	-۱۱۴
کے	-۱۱۵
کے	-۱۱۶
کے	-۱۱۷
کے	-۱۱۸
کے	-۱۱۹
کے	-۱۲۰
کے	-۱۲۱
کے	-۱۲۲
کے	-۱۲۳
کے	-۱۲۴
کے	-۱۲۵
کے	-۱۲۶
کے	-۱۲۷
کے	-۱۲۸
کے	-۱۲۹
کے	-۱۳۰
کے	-۱۳۱
کے	-۱۳۲
کے	-۱۳۳
کے	-۱۳۴
کے	-۱۳۵
کے	-۱۳۶
کے	-۱۳۷
کے	-۱۳۸
کے	-۱۳۹
کے	-۱۴۰
کے	-۱۴۱
کے	-۱۴۲
کے	-۱۴۳
کے	-۱۴۴
کے	-۱۴۵
کے	-۱۴۶
کے	-۱۴۷
کے	-۱۴۸
کے	-۱۴۹
کے	-۱۵۰
کے	-۱۵۱
کے	-۱۵۲
کے	-۱۵۳
کے	-۱۵۴
کے	-۱۵۵
کے	-۱۵۶
کے	-۱۵۷
کے	-۱۵۸
کے	-۱۵۹
کے	-۱۶۰
کے	-۱۶۱
کے	-۱۶۲
کے	-۱۶۳
کے	-۱۶۴
کے	-۱۶۵
کے	-۱۶۶
کے	-۱۶۷
کے	-۱۶۸
کے	-۱۶۹
کے	-۱۷۰
کے	-۱۷۱
کے	-۱۷۲
کے	-۱۷۳
کے	-۱۷۴
کے	-۱۷۵
کے	-۱۷۶
کے	-۱۷۷
کے	-۱۷۸
کے	-۱۷۹
کے	-۱۸۰
کے	-۱۸۱
کے	-۱۸۲
کے	-۱۸۳
کے	-۱۸۴
کے	-۱۸۵
کے	-۱۸۶
کے	-۱۸۷
کے	-۱۸۸
کے	-۱۸۹
کے	-۱۹۰
کے	-۱۹۱
کے	-۱۹۲
کے	-۱۹۳
کے	-۱۹۴
کے	-۱۹۵
کے	-۱۹۶
کے	-۱۹۷
کے	-۱۹۸
کے	-۱۹۹
کے	-۲۰۰
کے	-۲۰۱
کے	-۲۰۲
کے	-۲۰۳
کے	-۲۰۴
کے	-۲۰۵
کے	-۲۰۶
کے	-۲۰۷
کے	-۲۰۸
کے	-۲۰۹
کے	-۲۱۰
کے	-۲۱۱
کے	-۲۱۲
کے	-۲۱۳
کے	-۲۱۴
کے	-۲۱۵
کے	-۲۱۶
کے	-۲۱۷
کے	-۲۱۸
کے	-۲۱۹
کے	-۲۲۰
کے	-۲۲۱
کے	-۲۲۲
کے	-۲۲۳
کے	-۲۲۴
کے	-۲۲۵
کے	-۲۲۶
کے	-۲۲۷
کے	-۲۲۸
کے	-۲۲۹
کے	-۲۳۰
کے	-۲۳۱
کے	-۲۳۲
کے	-۲۳۳
کے	-۲۳۴
کے	-۲۳۵
کے	-۲۳۶
کے	-۲۳۷
کے	-۲۳۸
کے	-۲۳۹
کے	-۲۴۰
کے	-۲۴۱
کے	-۲۴۲
کے	-۲۴۳
کے	-۲۴۴
کے	-۲۴۵
کے	-۲۴۶
کے	-۲۴۷
کے	-۲۴۸
کے	-۲۴۹
کے	-۲۵۰
کے	-۲۵۱
کے	-۲۵۲
کے	-۲۵۳
کے	-۲۵۴
کے	-۲۵۵
کے	-۲۵۶
کے	-۲۵۷
کے	-۲۵۸
کے	-۲۵۹
کے	-۲۶۰
کے	-۲۶۱
کے	-۲۶۲
کے	-۲۶۳
کے	-۲۶۴
کے	-۲۶۵
کے	-۲۶۶
کے	-۲۶۷
کے	-۲۶۸
کے	-۲۶۹
کے	-۲۷۰
کے	-۲۷۱
کے	-۲۷۲
کے	-۲۷۳
کے	-۲۷۴
کے	-۲۷۵
کے	-۲۷۶
کے	-۲۷۷
کے	-۲۷۸
کے	-۲۷۹
کے	-۲۸۰
کے	-۲۸۱
کے	-۲۸۲
کے	-۲۸۳
کے	-۲۸۴
کے	-۲۸۵
کے	-۲۸۶
کے	-۲۸۷
کے	-۲۸۸
کے	-۲۸۹
کے	-۲۹۰
کے	-۲۹۱
کے	-۲۹۲
کے	-۲۹۳
کے	-۲۹۴
کے	-۲۹۵
کے	-۲۹۶
کے	-۲۹۷
کے	-۲۹۸
کے	-۲۹۹
کے	-۳۰۰
کے	-۳۰۱
کے	-۳۰۲
کے	-۳۰۳
کے	-۳۰۴
کے	-۳۰۵
کے	-۳۰۶
کے	-۳۰۷
کے	-۳۰۸
کے	-۳۰۹
کے	-۳۱۰
کے	-۳۱۱
کے	-۳۱۲
کے	-۳۱۳
کے	-۳۱۴
کے	-۳۱۵
کے	-۳۱۶
کے	-۳۱۷
کے	-۳۱۸
کے	-۳۱۹
کے	-۳۲۰
کے	-۳۲۱
کے	-۳۲۲
کے	-۳۲۳
کے	-۳۲۴
کے	-۳۲۵
کے	-۳۲۶
کے	-۳۲۷
کے	-۳۲۸
کے	-۳۲۹
کے	-۳۳۰
کے	-۳۳۱
کے	-۳۳۲
کے	-۳۳۳
کے	-۳۳۴
کے	-۳۳۵
کے	-۳۳۶
کے	-۳۳۷
کے	-۳۳۸
کے	-۳۳۹
کے	-۳۴۰
کے	-۳

- ۷۰ مہنامہ نقوش، لاہور نمبر۔
- ۷۱ چینیوں کے چوتھے۔
- ۷۲ Chieelsea لندن میں ارباب فن، اوپیول اور شاعروں کا مسکن جس کی فضا شہر کے دوسرے مسکن سے میکر مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر محبوس ہوتا ہے کہ اپنی کازمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ جملی بدل گیا اور بد رہا ہے۔ چار سو برس پہلے پاکیج چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ۱۶ اویں صدی میں سرٹامس مورنے یہاں سکونت اختیار کی، ایک مکان بنا یا رفتہ رفتہ دوسرے ارباب فن نے اس کا رخ کیا۔ جملی کا ایک حصہ اب شہر سے مٹتی ہے۔ دوسرا دریائے ٹیز کے کنارے پھیل گیا ہے۔ یہ حصہ بڑا خوبصورت ہے۔ اب دریا ایک کشادہ سڑک کے پار ایک کشادہ سڑک کے پار ایک چن لگا ہے جہاں گرمیوں میں میلہ سالگرا رہتا ہے۔ دیکھیے حکیم شجاع الدین کا مضمون لاہور کا جملی۔
- ۷۳ اس سلسلے میں دیکھیے محمد عبد اللہ القرشی کے مضمایں اقبال جملہ بزم اقبال لاہور میں بعنوان لاہور کے مشاعرے اور اقبال، شمارہ اکتوبر ۱۹۵۳ء لاہور۔
- ۷۴ شیخ عبدالقدار، بانگ درا میں دیکھیے دیباچہ۔ نجاشی غلام علی، ص ۱۵، ۱۴ فروری ۱۹۷۳ء۔
- ۷۵ بانگ درا:
- اڑا لی طوطیوں نے قریوں نے عذیبوں نے  
چن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فنا میری  
عبد الرؤف رافت بھوپالی، بیہہ اخبار میں کام کرتے تھے، بھوپال پلے گئے فوق نے حریتِ اسلام کی تصنیف میں معلومات فراہم کرنا شروع کیں تو اس کے پاس بھوپال پہنچ۔ بڑے صاحب علم تھے
- ۷۶ بانگ درا:
- میر مخن سے کوئی اقبال جا کے میرا بیام دے دے  
جو کام کچھ کرہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ خن نہیں ہے  
زبور عجم، گلشنِ راز جاوید
- ۷۷ شیخ عبدالقدار، اقبال نامہ، حصہ اول، مکتبہ ۵، ص ۱۰۔
- ۷۸  
دست بست نہ بینی خیر ازال فرو مرد من تہمت شعر و خن  
کہ ہر من تہمت شعر و خن
- ۷۹ شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ اول، مکتبہ ۵، ص ۱۰۔
- ۸۰
- |       |       |     |
|-------|-------|-----|
| آشوب  | مرے   | گو  |
| سنجال | سنجال | کر  |
| کہہ   | کہہ   | گئے |
| ہاں   | ہاں   | سنا |
- |         |            |    |       |
|---------|------------|----|-------|
| رجہل    | ترانہ      | کا | اقبال |
| مکان کے | رکھا ہے لا | ہے | ہوتا  |
| از      | بست از     |    |       |
| پیغام   | کو         |    |       |
- |        |       |    |       |
|--------|-------|----|-------|
| ۰۰۰    |       |    |       |
| گیا    | درادا | کا | اقبال |
| کارواں | پھر   | ہے | ہوتا  |
- |     |                    |             |                     |
|-----|--------------------|-------------|---------------------|
| ۰۰۰ |                    |             |                     |
| نے  | صدائے کی سمجھا تھا | اک وہ کو    | تھی جس              |
| میں | کارواں             | درمانہ رحلی | دانتے Divine Comedy |
- ۸۱ Dante: Divine Comedy
- ۸۲ Beatrice بیٹریس، بیاتریچے
- ۸۳ سید نذرینیازی، مکتوبات اقبال۔ ص ۳۲، ۳۳۔
- ۸۴ محمد نظایری، طفقطات، مرزا جمال الدین کا مضمون میرا اقبال، ص ۱۷، ۱۸۔
- ۸۵ مکتبہ ۲۲ ہمام گرامی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء مکاتیب اقبال (اقبال نامہ)، اقبال اکادمی کراچی، ص ۱۵۔
- ۸۶ صحیفہ: اقبال نمبر، حصہ اول، ص ۹۶۔ شمارہ ۲۵، ۱۹۷۳ء۔
- ۸۷ خوجہ حسن ظایی نے اس جلسے کی تاریخ ۱۲ مارچ لکھی ہے۔ جو غلط ہے۔ دیکھیے شاہین: اوراق گمشدہ، ص ۲۸، اور سید نذرینیازی مکتوبات اقبال، ص ۹۸، ۹۹۔

- | سیدنذر نیازی، مکتوبات اقبال، ص ۱۰۰، ۹۹۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                          | -۸۸                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------|--------|------|-----|-----|-----|----|-----|------|-----|-----|---------|--------------------|-----|-----------------------------------------|---------------------------|------|------|-----|-----|-----|---|----|------|----|----|---------|--------------------|------|
| محمود ناظمی، ملفوظات۔ سر عبد القادر کا مضمون کیف غم۔ صفحات ۱۳ تا ۱۵۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                             | -۸۹                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| ایشا۔ ص ۱۵۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                      | -۹۰                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| نذر اقبال: مجموعہ مضمومین سر عبد القادر۔ مرتبہ حنفی شاہ، ص ۸۶۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                   | -۹۱                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| ایضا۔ ص ۷۷۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                      | -۹۲                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ، حصہ دوم، مکتوب ۱۱، ص ۲۹۶۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                             | -۹۳                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| حکیم الامت کو لوگ ڈاکٹر صاحب ہی کہتے، علامہ، حضرت علامہ، حکیم الامت کے القاب بعد میں وضع ہوئے۔ اس دور کے لوگ قواب بھی ڈاکٹر صاحب ہی کہہ کر ان کا ذکر کرتے ہیں۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                   | -۹۴                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| حنفی شاہ، نذر اقبال، ص ۱۳۵۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                      | -۹۵                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| روزگار فقیر: حصہ ۲، ص ۱۵۹۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                       | -۹۶                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| اس سلسلے میں دیکھیے ڈاکٹر محمود کا مضمون، علامہ اقبال کا گوشوارہ آدمی، جوانہوں نے انکیں کیس کے سلوں سے مرتب کیا۔ مجلس ترقی ادب: مجلہ صحیفہ۔ شمارہ ۲۵۔ ماہ اکتوبر ۱۹۷۳ء۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                          | -۹۷                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| اردو، اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ سیدنذر نیازی کا مضمون علامہ اقبال کی آخری علاالت۔ ص ۳۳۳۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                         | -۹۸                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| ان بعض الظن ام۔ (۲۹) (الجراحت ۲):                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | -۹۹                       |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| علی بخش کے لیے دیکھیے حیم بخش شاہین۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۳۰ تا ۳۵۔ اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت۔ سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور ج۔ ا۔ جا۔ بجا۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                       | -۱۰۰                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سید بیش نیزمی بھرت پوری ملکہ پولیس میں ملازم تھے۔ مخزن میں ان کی غزلیں شائع ہوتیں تھیں بلند شہری، حافظ محمد یوسف خاں۔ مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی۔ یہ غزل ۱۸۹۵ء میں پڑھی گئی۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                        | -۱۰۱                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سری گلکیں دریائے جہلم کا پہلا مل۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | -۱۰۲                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| اقبال: مجلہہ بزم اقبال لاہور۔ محمد عبداللہ قریشی کا مضمون اقبال اور فوق۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                         | -۱۰۳                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| اقبال: مجلہہ بزم اقبال لاہور۔ محمد عبداللہ قریشی کا مضمون اقبال اور فوق۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                         | -۱۰۴                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| پورے قطعہ کے لیے دیکھیے کوئی مجموعہ (غیر مطبوعہ) کلام:                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                           | -۱۰۵                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| <table border="1"> <thead> <tr> <th>در</th> <th>گلستان</th> <th>دہر</th> <th>عمل</th> <th>کے</th> <th>لیے</th> <th>ہے</th> <th>رد</th> <th>عمل</th> <th>کے</th> <th>لیے</th> <th>ہے</th> <th>رد</th> <th>نیش</th> </tr> </thead> <tbody> <tr> <td>دیکھیے انوار اقبال۔ ص ۲۵۔</td> <td>مکتوب مورخ ۲۶ مارچ ۱۹۱۴ء۔</td> <td></td> </tr> </tbody> </table>                                              | در                        | گلستان | دہر  | عمل | کے  | لیے | ہے | رد  | عمل  | کے  | لیے | ہے      | رد                 | نیش | دیکھیے انوار اقبال۔ ص ۲۵۔               | مکتوب مورخ ۲۶ مارچ ۱۹۱۴ء۔ |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    | -۱۰۶ |
| در                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                               | گلستان                    | دہر    | عمل  | کے  | لیے | ہے  | رد | عمل | کے   | لیے | ہے  | رد      | نیش                |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| دیکھیے انوار اقبال۔ ص ۲۵۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                        | مکتوب مورخ ۲۶ مارچ ۱۹۱۴ء۔ |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| ٹٹ بٹ Bits                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                       | -۱۰۷                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| مخزن، جون ۱۹۰۳ء۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                 | -۱۰۸                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| <table border="1"> <thead> <tr> <th>در</th> <th>گلستان</th> <th>دہر</th> <th>عمل</th> <th>کے</th> <th>لیے</th> <th>ہے</th> <th>رد</th> <th>عمل</th> <th>کے</th> <th>لیے</th> <th>ہے</th> <th>رد</th> <th>نیش</th> </tr> </thead> <tbody> <tr> <td>نیز حیم بخش شاہین: اوراق گم گشتہ، ص ۳۰۔</td> <td>آمد</td> <td>مثال</td> <td>شہنم</td> <td>دہر</td> <td>چون</td> <td>چون</td> <td>و</td> <td>گل</td> <td>کہتہ</td> <td>ہے</td> <td>ہے</td> <td>کا جواب</td> <td>انوار اقبال۔ ص ۲۵۔</td> </tr> </tbody> </table> | در                        | گلستان | دہر  | عمل | کے  | لیے | ہے | رد  | عمل  | کے  | لیے | ہے      | رد                 | نیش | نیز حیم بخش شاہین: اوراق گم گشتہ، ص ۳۰۔ | آمد                       | مثال | شہنم | دہر | چون | چون | و | گل | کہتہ | ہے | ہے | کا جواب | انوار اقبال۔ ص ۲۵۔ | -۱۰۹ |
| در                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                               | گلستان                    | دہر    | عمل  | کے  | لیے | ہے  | رد | عمل | کے   | لیے | ہے  | رد      | نیش                |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| نیز حیم بخش شاہین: اوراق گم گشتہ، ص ۳۰۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                          | آمد                       | مثال   | شہنم | دہر | چون | چون | و  | گل  | کہتہ | ہے  | ہے  | کا جواب | انوار اقبال۔ ص ۲۵۔ |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور ج۔ ا۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | -۱۱۰                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور ج۔ ا۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | -۱۱۱                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| بیش احمد ڈار: انوار اقبال، ص ۲۳۶۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                | -۱۱۲                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سیدنذر نیازی: اقبال کے حضور، ص ۷۱ اور مابعد۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                     | -۱۱۳                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| دیکھیے ماہنامہ نقوش لاہور نمبر۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                  | -۱۱۴                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| سیدنذر نیازی، اقبال کے حضور، زیر طبع۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                            | -۱۱۵                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، حصہ اول، ص ۹۹، ۱۰۰۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                            | -۱۱۶                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |
| تفصیل کے لیے دیکھیے۔ مشق خواجہ کا مضمون رویوی، کرایی، شمارہ جولائی ۱۹۶۷ء۔                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                        | -۱۱۷                      |        |      |     |     |     |    |     |      |     |     |         |                    |     |                                         |                           |      |      |     |     |     |   |    |      |    |    |         |                    |      |

-۱۱۸- دیکھیے اقبال: مجلہ برم اقبال لاہور، اشاعت میں۔

-۱۱۹- اقبال: مجلہ برم اقبال، اکتوبر ۱۹۶۲ء۔ مرحوم صاحب کا کتب خانہ ربوہ میں محفوظ ہے۔

-۱۲۰- اقبال کے معاصر از محمد عبداللہ قریشی، ص ۱۷۷۔

-۱۲۱- دیکھیے اقبال: بزم اقبال تحریر بر اسرار خودی۔

-۱۲۲- شیخ عطاء اللہ: مکاتیب اقبال حصہ اول۔ کتب ۱۰، مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء۔ انہیں مشی صاحب بھی کہا جاتا۔ لفظ مشی سے غلطی بھی نہ ہو۔ یہاں لفظ مشی اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مشی وہ اعزاز تھا جو اہل قلم کو بشكل حاصل ہوتا۔

-۱۲۳- ماہنامہ نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۳ء۔

-۱۲۴- شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ۔ حصہ اول مکتوب امیں اردو فارسی دونوں قطعات موجود ہیں۔ ص ۲۳۔

-۱۲۵- بشیر حسین نہیں، بشیر حیدر۔ اقبال نامہ میں غلطی سے بشیر حسین چھپ گیا۔ بعض ادوات ناموں کے بارے میں غلطی ہو جاتی۔ مثلاً ایک خط میں ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خان کو سید ڈاکٹر حسین لکھا ہے۔ دیکھیے مکتوبات اقبال از سید نذری نیازی۔ اقبال اکیڈمی کراچی۔

-۱۲۶- جو فرید امت کے نام سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ ۱۹۰۳ء میں پڑھی گئی۔

-۱۲۷- محمد صادق علی خاں بڑے خوش شاعر تھے، نور الدین غیر بھی۔ یوں کشیر میں اردو شاعروں کا ایک حلقة ناظر کی سرپرستی میں قائم ہو گیا۔ خاں صاحب اس حلقت کے روح دروازہ تھے۔ شعر اکیڈمی کی تربیت کرتے۔ مغلقتہ دلی کا پیغمبر اقبال نامہ انجمن مفرح القلوب رکھا۔ آگے چل کر غیر بھ کے بھائی میر خوشیدا حمر حروم نے جن کی معیت میں مجھے اس انجمن میں اکثر شرکت کا موقعہ ملا اور جن کے نام محمد اقبال کے متعدد خطوط شیخ عطاء اللہ نے اقبال نامہ میں جمع کردیئے ہیں اس حلقت کی سرگرمیوں میں بڑھ چکر حصہ لیا۔

بقول شیخ عطاء اللہ۔ دیکھیے اقبال نامہ مکتوب جس کا مطلع ہے:

ظاہر کی آگہ سے نہ تماشا کرے کوئی اور اس کے بعد "بلبل کی فریاد" ص ۲۲،

-۱۲۸- دی مکتوب

-۱۲۹- ایضاً۔ مکتوب ۳ اور ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء۔

-۱۳۰- میں ان معلومات کے لیے خاں صاحب کی صاحبزادی بیگم ڈی حسین کا ممنون ہوں۔

-۱۳۱- عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۲۳۶۔

-۱۳۲- مورخہ ۲۳ صفحہ ۱۳۵۔ ایک دوسرے مکتوب میں جون ۱۹۱۷ء میں انہوں نے مجھے لکھا فرماتے ہیں: وفات کی خبر آنے سے ایک دن قبل علامہ صاحب نے فرمایا خدا خیر کرے۔ اندازہ تکمیل مولانا ابوالحسن اور مولانا عادی کی حکیم الامت سے عقیدت کا۔

-۱۳۳- دیکھیے مکاتب گرامی شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی۔

-۱۳۴- محمد عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۰۰ تا ۱۱۷۔

-۱۳۵- مکاتیب گرامی شائع کردہ اقبال اکیڈمی۔

-۱۳۶- مکاتیب اقبال: نام نیاز الدین خاں، مکتوب مورخہ ۱۱۳ اکتوبر ۱۹۱۹ء۔

-۱۳۷- شیخ عطاء اللہ واقعہ اقبال نامہ، مکاتیب اقبال۔

-۱۳۸- مکاتیب گرامی، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۹ء۔

-۱۳۹- ایضاً۔

-۱۴۰- سوامی جی کے لیے دیکھیے ماہنامہ فنون جولائی اگست ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر عاشق بلالی کا مضمون باضافہ محمد عبداللہ قریشی، مع کتابیات۔

-۱۴۱- مجھے ایک ہی لف کا ہے۔

-۱۴۲- سید نذری نیازی: اقبال کے حضور۔ زیر طبع۔

-۱۴۳- سید نذری نیازی: اقبال کے حضور۔ زیر طبع

#### Young Men Indian Association

-۱۴۴- رحیم بخش شاہین: اوراق گشته علامہ اقبال کے ترانے کی شان نزول۔ ص ۳۱۸۔

-۱۴۵- انوار اقبال مکتوب بنا فوچ۔

-۱۴۶-

- سیدنذر بیانی کتبات اقبال۔-۱۲۷
- Harper Nelson شہزادی بامداد لیپ سلگھے کے شہر۔-۱۲۸
- محمود نظای، ملفوظات اقبال۔ طبع ثانی، ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۸۔-۱۲۹
- محمود نظای، ملفوظات اقبال۔ طبع ثانی۔ مرتضی جلال الدین کامضون: میر اقبال، جس ۶۸۔-۱۵۰
- ایضاً، ص ۸۷۔-۱۵۱
- ایضاً، ص ۹۲۔-۱۵۲
- اقبال: بزم اقبال لاہور۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء۔-۱۵۳
- میر نیرنگ کامضون: اقبال کے بعض حالات۔ ص ۱۵، اقبال جلد، بزم اقبال، اکتوبر ۱۹۵۷ء۔-۱۵۴
- ایضاً۔-۱۵۵
- ایضاً۔-۱۵۶
- صحیفہ۔ شمارہ ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء۔ محمد عبداللہ چختائی کامضون، لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہی، ص ۵۳۔-۱۵۷
- Gandhi-Irwani Pact-۱۵۸
- There is many a slip between the cup and the lip-۱۵۹
- شاکر صدیقی نے ماہنامہ ماحول، روپنڈی میں "بیار قلندر" کے عنوان سے شیخ صاحب کی محمد اقبال سے خط و تابت کا ذکر کیا ہے۔ شیخ صاحب کو محمد اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنی شاعری کو ان کے فیض سے تعمیر کرتے۔ دیکھیے ماہنامہ فنون: اقبال نمبر، اشاعت ۱۹۷۷ء۔ ارشد میر کامضون اقبال کے ایک قریبی دوست۔-۱۶۰
- Easy Chair Study-۱۶۱
- شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ۔ مقدمہ۔ ص ۱۔ ک
- ایضاً۔ مکتوب بے تاریخ۔ بھائی دروازے سے لکھا گیا۔ ص ۹۔-۱۶۲
- اقبال جلد بزم اقبال۔ نومبر ۱۹۵۶ء اقبال کے بعض حالات۔-۱۶۳
- یہ ہندوستان کے اندر ایک اور ہندوستان، کا اشارہ اودھ یادگی کی طرف ہے جسے پورے ہندوستان کا سیاسی، ثقافتی مرکز کہنا چاہیے۔-۱۶۴
- پڑھتے ہی کام جہاں اقبال ابی اعزش کی تفریظ میں ذکر کر چکے تھے۔ لکھا تھا ہمارے ایک کرم فرماجاندہ ہمیں ہیں۔-۱۶۵
- شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ حصہ دوم۔ صفحات ۳۰۰ تا ۳۰۷۔-۱۶۶
- عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۳۰۳۔-۱۶۷
- عبداللہ قریشی۔ معاصرین اقبال کی نظر میں۔ ص ۳۰۳۔-۱۶۸
- ایضاً۔ ص ۳۰۵۔-۱۶۹
- عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں۔ ص ۳۰۷۔-۱۷۰
- ایضاً۔ ص ۳۰۹۔-۱۷۱
- ایضاً۔ ص ۳۱۔-۱۷۲
- ایضاً۔ ص ۳۰۹۔-۱۷۳
- ایضاً۔ ص ۳۱۔-۱۷۴
- ایضاً۔ ص ۳۱۔-۱۷۵
- دیکھیے اکبری اقبال کا دیباچہ۔-۱۷۶
- عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۱۱ تا ۳۱۵۔-۱۷۷
- ماہنامہ نظام الشاعر، دہلی، رسول نمبر، ۱۳۳۲ھ، جنوری، فروری ۱۹۱۵ء، خواجہ صاحب نے خطابات کی ایک طویل فہرست شائع کی۔ محمد اقبال کے علاوہ سر علی امام، حکیم احمد جمال خاں، مولانا شوکت علی اور میر نیرنگ کو بھی کسی خطاب سے نوازا۔ ماہنامہ صوفی منڈی بہاؤ الدین، شمارہ پریل ۱۹۱۵ء میں ایک صاحب نامی گوسواری نے "سرالوصال" کو ایک قطفے میں لٹکم کیا۔
- | مرجا     | شاعر | شاعر  | شخ  | شخ  | شیرین |
|----------|------|-------|-----|-----|-------|
| اجنبی    | جندا | جندا  | ہند | ہند |       |
| اقبال    | شاعر | شاعر  | شیخ | شیخ |       |
| شہر      | آفاق | آفاق  | ہے  | ہے  |       |
| واہ      | صد   | اسلام | کیم | کیم |       |
| سرالوصال | اصد  | کیم   | کیم | کیم |       |
- جنتا شاعر ہندیہ مصروع محل نظر ہے۔ شاید طباعت میں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔

- شایین: اوراق گم گشته ص ۲۹، ۲۸۔ -۱۷۸
- الیٹا۔ -۱۷۹
- محمد عبدالقدیری: معاصرین اقبال کی نظر میں، ص ۳۲۷۔ -۱۸۰
- الیٹا ص ۳۲۸۔ -۱۸۱
- الیٹا، ص ۳۲۰۔ -۱۸۲
- خواجہ صاحب اس قسم کی تحقیقات اور اختراعات کے پادشاہ تھے۔ تحریکوں پر تحریکیں چلاتے۔ ہندی اسلامی سیاست میں ان کا کردار ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے۔ -۱۸۳
- ادبی دنیا، می ۱۹۶۵ء ص ۱۱۲۔ -۱۸۴
- محمد عبدالقدیری: معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۳۲۵، محوالہ منادی، فروری ۱۹۳۶ء۔ -۱۸۵
- عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۲۵۳۔ -۱۸۶
- جیسا کہ حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے۔
- ماہنامہ نقوش، لاہور نمبر۔ حکیم احمد شجاع کا مضمون لاہور کا جیلی۔ -۱۸۷
- رجیم بخش شایین۔ اوراق گم گشته ص ۶۷۔ -۱۸۸
- تاریخ میں اختلاف ہے لیکن نیصلہ ۱۹۰۰ء کے حق میں ہے۔ -۱۸۹
- دیکھیے اقبال اور انجمن حمایت اسلام، تالیف حنف شاہد انجمن کی روانیدادوں پر مشتمل، طبع جولائی ۱۹۷۶ء۔ -۱۹۰
- جیسا کہ اس نظم کے ایک شعر میں کہا ہے۔ -۱۹۱
- ۱۹۲
- | آیا | آیا | دیکھ | دیکھ | حشر | میں  | ایم   | کا   | گھر | برا | آیا   |
|-----|-----|------|------|-----|------|-------|------|-----|-----|-------|
| آیا | آیا | عمل  | عمل  | جن  | تیڑا | خیدار | تیڑا | کا  | گھر | ایم   |
|     |     |      |      |     |      |       |      |     |     | جوئے۔ |
- با خدا دیوانہ باش و با محمد رو شیار
- محمود ظلای، طفوظات، ص ۱۲۔ -۱۹۳
- حنف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۸۳۔ -۱۹۴
- محمود ظلای: طفوظات، میر اقبال، ص ۲۶۔ -۱۹۵
- ۱۹۶
- ۱۹۷
- فقیر سید وحید الدین کا دعویٰ ہے (روزگار فقیر حصہ اول ص ۲۹، ۲۷) کہ یہ قطعہ اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا۔ فقیر صاحب مرحوم کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ ماہنامہ صوفی منڈی بہاؤ الدین شمارہ ۱۹۱۲ء میں یہ قطعہ شائع ہو چکا ہے۔ آخری شعر کا پہلا مصروف یوں ہے:
- من کئی شمع عشق رادر بزم دل افرخ تم  
مجائے بزم جاں کے روزگار فقیر میں چھپا۔
- ۱۹۸
- | پادری | کا   | کا     | لندن | کھستا | میں   | خبر   |
|-------|------|--------|------|-------|-------|-------|
| عناد  | سے   | اسلام  | نہب  | نہیں  | کو    | ہم    |
| لیے   | کے   | تہذیب  | نگ   | قلم   | وہ    | لیکن  |
| بہاد  | میں  | ارمنوں | جو   | ترکان | بد    | کرتے  |
| مسلم  | بھی  | ہول    | حیمت | حق    | میں   | جائز  |
| مش    | جائے | تا     | جبان | بنائے | شر    | فساد  |
| سن    | کے   | یہ     | بات  | خوب   | کہی   | شہواز |
| بلی   | چوہے | کو     | دیتی | ہے    | پیغام | اتحاد |
|       |      |        |      |       |       |       |
- نظموں کے علاوہ محمد اقبال نے انجمن کے سالانہ جلسوں میں تقریریں بھی کیں، مقالات بھی پڑھے، لیکن بھی دیجے جن میں بعض کامفاداں کے خطبات میں موجود ہے۔
- جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، مخزن کا نام شیخ صاحب کوشایر اگریزی لفظ "میگزین" سے سوچا اس لیے کہ انگلستان سے علمی ادبی "میگزین" شائع ہو رہے تھے، گمگین، مجاء خود لفظ مخزن کی اگریزی شکل ہے۔ -۱۹۹
- سیالکوٹ میں محمد اقبال کے دوست اور سید محمد تقی کے قریبی عزیز، ان کا ذکر پہلے آپ کا ہے۔ -۲۰۰
- سید بیشیر حیدر بھی ان کا کلام صحیح کرتے، سید محمد تقی بھی۔ -۲۰۱

- بائگ دراء، دیباچہ۔ -۲۰۲  
 میر نیرنگ۔ -۲۰۳  
 لقلم نایاب ہے۔ -۲۰۴  
 حنف شاہد: نذر اقبال -۲۰۵  
 ایشا۔ -۲۰۶  
 ایشا۔ -۲۰۷
- جنے مؤلف نے غلطی سے وہ لکھر سمجھ لیا جس کا مولانا ظفر علی خاں نے ملت بینا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ -۲۰۸  
 مخزن دکابر ۱۹۰۸ء عبدالقار در کا تعارفی شدید۔ -۲۰۹  
 محمود نظای: لفظات، شش عبدالقار کا مضمون، کیف غم، ص۔ ۱۶ -۲۱۰  
 حنف شاہد: نذر اقبال، عبدالقار کا مضمون و شاعر مشرق سے میری آخری ملاقات، ص ۹۰ تا ۹۳۔ -۲۱۱  
 ۱۸ اشعار پر مشتمل یہ غزل روزگار فقیر میں موجود ہے۔ حصہ دوم ص ۲۵۰۔ مگر تجھ بہنے پائے ساقی پر گرایا۔۔۔ یہ شعر درج ہونے سے کیسے رہ گیا۔ یہ غزل بھی ظاہر ہے ۱۸۹۵ء سے پہلے لکھی گئی۔ لقلم طویل ہے۔ میر صاحب کا اس پر تبصرہ بھی طویل۔ انہوں نے الی چنگا کے بارے میں اپنی رائے بدلتی۔ ”معلوم ہو گیا، ذوق خن کا اجارہ کسی خط زمین کو نہیں دیا گیا۔۔۔ اقبال کا تو میں قائل ہی ہو گیا۔ بندسوں کی ایسی چستی، کلام کی ایسی روانی، مضمون کی شوختی۔۔۔“ -۲۱۲  
 قاضی افضل حق: باتیات اقبال، ماہنامہ اردو، شمارہ ۳۵، کراچی: ۱۹۶۹ء۔ -۲۱۳  
 ایک وہ شعر جس میں محمد اقبال نے نسیم اور تشبیہ کی طرح داعی کی شاگردی پر انہما فخر کیا ہے۔ دوسری جس پر مرتضیٰ ارشد نے انھیں گلے گالیا۔ تیری بازار حکیماں کے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کے موقع پر آپ کہتے ہیں سخنور ہی سکی،۔۔۔ والی غزل۔ -۲۱۴  
 بائگ دراء، دیباچہ، ص ۱۶۔ -۲۱۵  
 نیرا عظم، مراد آباد۔ اگست ۱۹۰۱ء میں پورا واقعہ تفصیل مذکور ہے۔ رقم الحروف کو تفصیل نہیں مل سکی۔ نیرا عظم کا یہ پرچہ پاکستان تو کیا بھارت میں بھی شاید کمشکل دستیاب ہو۔ -۲۱۶  
 تجھ بہنے عطیہ بیگم ۱۹۰۷ء تک مخزن کی اشاعت سے بے خبر تھیں۔ -۲۱۷  
 عطیہ بیگم: اقبال، انگریزی نسخہ، مطبوعہ اکیڈمی آف اسلام، بھٹی۔ -۲۱۸  
 یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں میری نظر سے گزری۔ کتب خانہ جامعہ طیہہ اسلامیہ دہلی میں محفوظ ہے۔ مصنف کا نام یاد نہیں رہا۔ -۲۱۹  
 حتیٰ کہ بائگ درا میں بھی شامل کی گئی تو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ۔ -۲۲۰  
 خان صاحب کا میں اور بھی بہت سی معلومات کے لیے ممنون ہوں۔ -۲۲۱  
 Tennyson, Longfellow Emeson -۲۲۲  
 پیام شرق: -۲۲۳
- | گران | نیا                                                                                                                                                                                          | دار              | من         | از   | ترا | از | مرگ | را | را | خوب | خوب |
|------|----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------|------------|------|-----|----|-----|----|----|-----|-----|
|      | مشہور مستشر۔ سٹنکرٹ اور قدیم ہندوستان کے مطالعے میں ان کی خدمات بڑی وقیع ہیں۔                                                                                                                | William Jones    | (النور) ۳۵ | -۲۲۳ |     |    |     |    |    |     |     |
|      | رع یعنی قرص آفتاب۔ رع کے پیروؤں کا۔ یوں رع اور ”سوڑ“ میں ایک رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یونانی، ہندو اور مصری مذاہب کے مطالعے میں غور طلب۔                                                        | جیروان زرتشت کا۔ | -۲۲۴       |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | ۱۸۰۱ء میں صدی کا ادیب، ڈراماؤں اور تئیرنگار۔ یا Chapman Jephson ۱۹۰۱ء میں صدی کا طالب اور ناشر۔                                                                                              | -۲۲۵             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | مخزن ۱۹۰۲ء۔                                                                                                                                                                                  | -۲۲۶             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | خوب جو روی ۱۹۰۲ء۔                                                                                                                                                                            | -۲۲۷             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | خوب جو روی ۱۹۰۲ء۔                                                                                                                                                                            | -۲۲۸             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | خوب جو روی ۱۹۰۲ء۔                                                                                                                                                                            | -۲۲۹             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | خوب جو روی ۱۹۰۲ء۔                                                                                                                                                                            | -۲۳۰             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | محمد اللہ کہ اب مرتضیٰ کی وہ حالت نہیں جو محمد اقبال اپنی آنکھوں سے دیکھا آئے تھے اور جو شاید ۱۹۵۰/۱۹۵۰ء تک قائم رہی۔ حکومت ہند کی توجہ اور ہمدرد فاؤنڈیشن کی کوششوں سے مرتضیٰ نو تعمیر ہوا۔ | -۲۳۱             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | عمارت شاندار ہے، غائب کے بارے میں ایک کتب خانے پر مشتمل۔                                                                                                                                     | -۲۳۲             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |
|      | تکمیل جدید النیات اسلامیہ طبع آ کسفورڈ، ۱۹۳۷ء خطبہ پنجم۔ ص ۷۳۔ ۷۴۔                                                                                                                           | -۲۳۳             |            |      |     |    |     |    |    |     |     |

- ۲۳۳ Sir Meworth Younge پہلی گورنمنٹ کانٹ لامبور۔ محمد اقبال کے قدر شناس۔
- ۲۳۴ W. Bell مخزن، شارہ نومبر ۱۹۰۳ء۔
- ۲۳۵ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ جامدختی دہلی، ۱۹۶۱ء۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں سید عابد رضا بیدار نے ماہنامہ جامدختی دہلی میں اقبال پر چکبست کی ایک تقدیم کے عنوان سے رسالہ اردو میں معلیٰ علی گڑھ، اشاعت اپریل ۱۹۰۲ء میں نواب جعفر علی خاں اثر کا مضمون جو انھوں نے چکبست کے جواب میں لکھا تھا شائع کر دیا ہے۔ مضمون آئینہ اقبال مرتبہ عبداللہ قریشی میں محفوظ ہے۔ عابد رضا (ڈاکٹر عابد رضا) بیدار آج کل کتب خانہ خدا بخش بائیکی پور کے ڈاکٹر ہیں۔
- ۲۳۶ آئینہ اقبال مرتبہ عبداللہ قریشی میں نصرت قریشی کا مضمون اقبال کے قصائد، ص ۱۵۵۔
- ۲۳۷ مکتبہ نام خان صاحب منسی سراج الدین خاں۔
- ۲۳۸ جیسا کہ گاندھی جی بے تجھب کہا کرتے تھے کہ بندی مسلمان جب پیشتر ہندی الصل ہیں تو محض تبدیلِ نہجہب کی بنا پر ان کی قومیت کیے بدلتی ہے۔
- ۲۳۹ بہوئے ارشاد باری تعالیٰ شعب و قبائل کا انتیاز تعارف کے لیے ہے۔
- ۲۴۰ مخزن۔ جون ۱۹۰۰ء۔
- ۲۴۱ مجلس ترقی ادب: صحیفہ، اقبال نمبر، حصہ اول شمارہ ۱۶۵ آئتوبر ۱۹۰۷ء۔ قاضی افضل حق کا مضمون تادرات اقبال ص ۲۱۲ تا ۲۱۳۔ اردو اگریزی سردق کی فلک کا لاصل کے ساتھ انگریزی ترجمے کا عنوان ہے۔ اردو عنوان کے نیچے لکھا ہے۔ ترکیب بند جو حضور ملکہ مظہم مختار کے انتقال پر ملال پر مسلمانان لاہور کے ایک ماتحتی جلسے میں پڑھا گیا از خاکسار اقبال۔
- ۲۴۲ دس Tears of Blood پر مشتمل۔ اردو عنوان کے نیچے لکھا ہے۔ ترکیب بند جو حضور ملکہ مظہم مختار کے انتقال پر ملال پر مسلمانان لاہور کے ایک ماتحتی جلسے میں پڑھا گیا از خاکسار اقبال۔
- ۲۴۳ اور جس میں ہندوستان تاجدار برطانیہ سے یوں خطاب کرتا ہے۔

ہند	نشان	جنت	خطہ	تاجدار	اے
ہند	خادران	تری	سے	تجیلوں	روشن
روہ	کے	خواہش	اپنی	اگرچہ	پاہند
روہ	کے	برٹش	تم	سمجھ	لائل
اگر	ہے	الہانا	فائدہ	سے	قانون
روہ	کے	سازش	خراب	کسی	حای

داد دیکھیے حضرت اسان الحصر کی سیاسی بصیرت کی، لفظ خواہش قابل غور ہے۔

-۲۴۴ اس زمانے کی اصطلاح میں انگریزی خیالات کا۔ دیکھیے مثلاً مخزن ص ۱۹۰ء عبد القادر کا تمہیدی شورہ، ہمالیہ پر۔

#### Iqbal: Stray Reflections.

- ۲۴۵ زمانہ طالب علمی میں محمد اقبال کو درود و رکھ بہت پسند تھا جیسے ٹینیں، لیکن بیہاں قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ باوجود اس دلچسپی یا اس خوش گوارا ثر کے جو انھوں نے ان سے قبول کیا ان شعر کا غالب اور بیدل کی طرح ان کے شعر و فلسفہ میں مستقلًا کوئی جگہ نہیں ملی۔ صرف ان کی یاد باقی رہ گئی۔ چنانچہ پیام بری مشرق میں انھوں نے شعر کی جو محفل قائم کی ہے اس میں ٹینیں موجود ہے نہ ورزہ و رکھ۔ وہ اپنے افکار اور تصورات کی دنیا میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ پھر یہ درہ بیت بھی ایک گزرتا ہوا فلسفیہ لمحہ تھا جس کا علق فلک سے تو ہے ایمان و یقین سے نہیں۔
- ۲۴۶ ابو میاں، سید بشیر حیدر، سید محمد تقی اور شاہید شفیع گلاب دین یا مولوی احمد دین بھی۔
- ۲۴۷ پاگل درا، دیباچہ، ص ۱۲۷، غلام علمی۔ لیکن شیخ صاحب نے شاید مودو کوئی بیاض مرتب نہیں کی۔
- ۲۴۸ مخزن، جنوری ۱۹۰۳ء باتیات اقبال، ص ۱۹۶۔ یہ تین شعر کیا چک Czcch شاعر ڈائیک (Dyke) م ۷۷-۷۷ء کے ہیں۔
- ۲۴۹ سید نذریہ نیازی، اقبال کے حضور، انہم ترقی ادب۔ اقبال نمبر ۱۹۳۸ء، علامہ اقبال کی آخری علاالت۔
- ۲۵۰ محمود نظایی، ملفوظات، ص ۶۹۔
- ۲۵۱ ۱۹۱۹ء میں جب کاغذ، لیگ اور مجلس خلافت کے اجلاس ایک ساتھ منعقد ہو رہے تھے۔ جسے کا اشارہ لیگ کے اجلاس کی طرف ہے۔
- ۲۵۲ رقم المعرف نے یہ لیم لیگ کے اجلاس میں خود ان کی زبان سے سنی۔ مجھ ہمہ تن گوش تھا۔ جسے کی صدارت سعی الملک بہادر حکیم جمل نے فرمائی۔ دائیں بائیں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی بیٹھے تھے۔ پاس ہی مولانا عبدالباری فرجی محلی، مولانا حسرت موبانی، ڈاکٹر انصاری، آزاد بھائی اور دوسرے زمینے لیگ۔ مولانا ابوالکلام قید و بند میں تھے۔ جوئی حکیم صاحب نے اعلان کیا ڈاکٹر اقبال نظر بندان اسلام کو خیر مقسم کہنے آئے۔ ہم مجھ بے قابو ہو گیا۔ ہر کسی کو اشتیاق کہ نظم کیا ہو گی۔ وہی لُن، دھی سوز، دھی دل کش آواز جس کا عبد القادر نے ذکر کیا ہے۔ ساری محفل پر ایک وجہ آفرین کیفیت طاہی تھی۔ مولانا محمد علی اٹھے ان سے لپٹ گئے، پھر مولانا شوکت علی۔



Don't Proceed to Deva

-۲۸۵

سید نذر نیازی، اقبال کے حضور، زیر ترتیب۔ -۲۸۶

انوار اقبال، طبع اول، ۱۹۶۷ء، اقبال اکادمی کراچی، ص ۱۷۸۔ -۲۸۷

وکیل، امرتسر، ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء، بحوالہ اقبال، مجلہ بزم اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۹۳۔ -۲۸۸

سید نذر نیازی: مکتبات اقبال، ص ۱۲۔ -۲۸۹

اسرار خودی: کشش انداز ملا جامیں نظم و نشر و اعلان -۲۹۰

عطیہ بیگم: اقبال۔ ان کی ڈائری کا کوئی نسخہ، انگریزی، اردو۔ -۲۹۱

دیکھیے اس سلسلے میں دیوان غالب، نسخہ حمدیہ، اشاعت اول جس کا مقدمہ ڈاکٹر بجوری مرحوم نے لکھا۔ لیکن بجوری مرحوم نے جب غالب کے آیک شعر پر انہمارائے کرتے ہوئے یہ کہا کہ غالب ہالینڈ کے وجودی فلسفہ اپنی روا کا ہم خیال ہے تو مفتی انوار الحنفی مرحوم (اس زمانے میں معدۃ تعلیمات بھوپال) نے وحدۃ الوجود کی مختلف بعثروں کے پیش نظر جن کا سلسلہ الخادو زندقة سے جانتا ہے، حتیٰ کہ دہریت سے ایک طویل مضمون وحدۃ الوجود کی تعلیم کسی رنگ میں اسلام کے خلاف دور ہو جائے یہ مضمون بطور دیباچے کے اس نسخے میں موجود ہے۔ مفتی صاحب نے اس موضوع پر اس لیے قلم اٹھایا کہ منطق کی رو سے دو ہی نتیجے ہیں جو وحدۃ الوجود سے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نظرت اللہ یہ میں ضم کر دیں یا ذات اللہ یہ کو نظرت میں اور دونوں ازروںے اسلام غلط۔ -۲۹۲

فرانسیسی مشترق لانڈو Landau کے نزدیک این عربی وجودی نہیں تھے۔ کچھ ایسا ہی خیال مشہور ترکی شاعر ضیا کا ہے۔ ضیا کے لیے دیکھیے Ziya Gokalp Berkes از نیازی کا کتاب RCD نے شائع کی۔ -۲۹۳

مکیش اکبر آبادی: نقد اقبال میں یہ بحث۔ -۲۹۴

تفکیل جدید الہیات اسلامیہ دوسرا خطبه۔ آخری دو صفحات۔ -۲۹۵

دیکھیے مفتی انوار الحنفی کا مضمون دیوان غالب نسخہ حمید یہ ہیں۔ -۲۹۶

روی: -۲۹۷

قلم	آثار	مند	دانش	زاد
قدم	آثار	جیس	صوفی	زاد
شد	اشکار	سوئے	صیادے	چو

گام آہودید و بر آہار شد

دیکھیے پروفیسر کی کتاب The Idea of Personality in Islam پروفیسر نکلسن مشتوی معنوی کے مترجمہ کا کہنا ہے میں کہی ایک زمانے میں روی کو وجودی سمجھتا رہا۔ -۲۹۸

بزم اقبال: مکاتیب اقبال، نام نیاز محمد خان -۲۹۹

عبد الواحد مجتبی: مقالات اقبال، ص ۳۲۰۔ -۳۰۰